BKID 001

تاریخ ادب اُردو

(دکنی دور تا ترقی پسند تحریک)

اردو

پہلا پرچہ

برائے

بی۔اے۔(سال اول)

نظامتِ فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

C مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

سلسلہ مطبوعات نمبر-43

ISBN: 978-93-80322-49-0

Edition: April, 2019

ناشر : رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

اشاعت : اپریل 2019

مطبع : پرنٹ ٹائم اینڈ بزنس انٹرپرائزز، حیدرآباد

TAREEKH-E-ADAB-E-URDU

(DECCANI DAUR TA TARAQQI PASAND TAHREEK)

URDU, Paper-I

for B. A. 1st year

Edited by:

Dr. Irshad Ahmad

DDE , MANUU

On behalf of the Registrar, Published by:

Directorate of Translation and Publications

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS)

E-mail: directordtp@manuu.edu.in

for

Directorate of Distance Education

E-mail: dir.dde@manuu.edu.in; Website: manuu.ac.in

کورس کوارڈی نیٹر

ڈاکٹر ارشاد احمد

نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین :	اکائی نمبر
ڈاکٹر میر محبوب حسین، شعبۂ اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی	اکائی 1,8
ڈاکٹر ارشاد احمد، نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی	اکائی 2, 3, 4
پروفیسر علیم اشرف، شعبۂ عربی، مانو اور پروفیسر عزیز بانو، شعبۂ فارسی، مانو	اکائی 5
ڈاکٹر عرشیہ جبیں، شعبۂ اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی	اکائی 6
ڈاکٹر نشاط احمد، شعبۂ اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی	اکائی 7
ڈاکٹر بی بی رضا خاتون، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی	اکائی 9
پروفیسر نکہت جہاں، نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی	اکائی 10, 11
پروفیسر نسیم الدین فریس، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی	اکائی 12
ڈاکٹر محمد شمس الدین، ڈائرکٹوریٹ آف ایڈمیشن، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی	اکائی 13
پروفیسر محمد ظفر الدین، ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی	اکائی 14
ڈاکٹر مسرت جہاں، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی	اکائی 15, 19, 20
ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی	اکائی 16
ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی	اکائی 17, 18

ایڈیٹر

ڈاکٹر ارشاد احمد

نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

لینگویج ایڈیٹرز

پروفیسر محمد ظفر الدین، ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

پروفیسر نکہت جہاں، نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

ڈاکٹر ارشاد احمد، نظامتِ فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

ٹائٹل پیج: ڈاکٹر ظفر گلزار

فہرست

پیغام	:	وائس چانسلر	6
پیش لفظ	:	ڈائرکٹر، ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز	7
ڈائرکٹر کا پیغام	:	ڈائرکٹر، نظامتِ فاصلاتی تعلیم	8
کورس کا تعارف	:	کورآرڈی نیٹر	9

پہلا باب: اردو زبان کا آغاز وارتقا 10

اکائی 1- ہندآریائی کا ارتقا 10

اکائی 2- مغربی ہندی اوراس کی بولیاں 30

دوسرا باب : اردو زبان کے آغاز وارتقا کے نظریات 42

اکائی 3- اردو کی ابتدا سے متعلق غیر ماہر لسانیات کے نظریات: سید سلیمان ندوی، محمود شیرانی اور نصیرالدین ہاشمی کے نظریات 42

اکائی 4- اردو کی ابتدا سے متعلق ماہر لسانیات کے نظریات: ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور مسعود حسین خاں کے نظریات 54

تیسرا باب : اردو ادب کے آغاز کا سماجی وتہذیبی پس منظر 64

اکائی 5- ہندعرب اور ہندایران تعلقات 64

اکائی 6- شمالی ہند میں اردو ادب کا سماجی اور تہذیبی پس منظر 83

اکائی 7- جنوبی ہند میں اردو ادب کا سماجی اور تہذیبی پس منظر 98

اکائی 8- اردو ادب کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ 111

چوتھا باب: دکنی ادب کا آغاز وارتقا 131

اکائی 9- بہمنی دور میں اردو ادب 131

اکائی 10- عادل شاہی دور میں اردو ادب 139

اکائی 11- قطب شاہی دور میں اردو ادب 147

اکائی12- ولی اور سراج کا عہد 156

پانچواں باب : شمالی ہند میں شعروادب کا ارتقا 175

اکائی13- دبستان دہلی 175

اکائی14- دبستان لکھنؤ 189

اکائی 15- شمالی ہند میں اردو نثر کا ارتقا فورٹ ولیم کالج سے قبل 205

چھٹا باب : ادارے، رجحانات اور تحریکات 216

اکائی 16- فورٹ ولیم کالج 216

اکائی 17- علی گڑھ تحریک: پس منظر، سرسید اور ان کے رفقا کی ادبی خدمات 224

اکائی 18- اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات 237

اکائی 19- ترقی پسند تحریک: پس منظر 245

اکائی 20- اردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات 254

پیغام

وائس چانسلر

وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے جس ایکٹ کے تحت مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ہے اُس کی بنیادی سفارش اُردو کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کا فروغ ہے۔ یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جو ایک طرف اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد بناتا ہے تو دوسری طرف ایک امتیازی وصف ہے، ایک شرف ہے جو ملک کے کسی دوسرے اِدارے کو حاصل نہیں ہے۔ اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ بھی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت رسائل و اخبارات کی اکثریت میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہماری یہ تحریریں قاری کو کبھی عشق و محبت کی پُر پیچ راہوں کی سیر کراتی ہیں تو کبھی جذباتیت سے پُر سیاسی مسائل میں اُلجھاتی ہیں، کبھی مسلکی اور فکری پس منظر میں مذاہب کی توضیح کرتی ہیں تو کبھی شکوہ شکایت سے ذہن کو گراں بار کرتی ہیں۔ تاہم اُردو قاری اور اُردو سماج آج کے دور کے اہم ترین علمی موضوعات چاہے وہ خود اُس کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، وہ جن مشینوں اور آلات کے درمیان زندگی گزار رہا ہے اُن کی بابت ہوں یا اُس کے گرد و پیش اور ماحول کے مسائل..... وہ ان سے نابلد ہے۔ عوامی سطح پر اِن اصناف کی عدم دستیابی نے علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے جس کا مظہر اُردو طبقے میں علمی لیاقت کی کمی ہے۔ یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ اسکولی سطح کی اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیر بحث آتے ہیں۔ چونکہ اُردو یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم ہی اُردو ہے اور اس میں علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔ اِسی مقصد کے تحت ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز کا قیام عمل میں آیا ہے اور احقر کو اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ اپنے قیام کے محض ایک سال کے اندر ہی یہ برگِ نو، ثمر آور ہو گیا۔ اس کے ذمہ داران کی انتھک محنت اور قلم کاروں کے بھرپور تعاون کے نتیجے میں کتب کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کم سے کم وقت میں نصابی اور ہم نصابی کتب کی اشاعت کے بعد اِس کے ذمہ داران، اُردو عوام کے واسطے بھی علمی مواد، آسان زبان میں تحریر عام فہم کتابوں اور رسائل کی شکل میں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کریں گے تاکہ ہم اِس یونیورسٹی کے وجود اور اِس میں اپنی موجودگی کا حق ادا کر سکیں۔

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز

خادمِ اوّل

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

پیش لفظ

ہندوستان میں اُردو ذریعہ تعلیم کی خاطر خواہ ترقی نہ ہو پانے کے اسباب میں ایک اہم سبب اُردو میں نصابی کتابوں کی کمی ہے۔اس کے متعدد دیگر عوامل بھی ہیں لیکن اُردو طلبہ کو نصابی اور معاون کتب نہ ملنے کی شکایت ہمیشہ رہی ہے ۔ 1998 ء میں جب مرکزی حکومت کی طرف سے مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو اعلیٰ سطح پر کتابوں کی کمی کا احساس شدید ہوگیا۔اعلیٰ تعلیمی سطح پر صرف نصابی کتابوں کی نہیں بلکہ حوالہ جاتی اور مختلف مضامین کی بنیادی نوعیت کی کتابوں کی ضرورت بھی محسوس کی گئی۔ فاصلاتی طریقہ تعلیم کے تحت چونکہ طلبہ کو نصابی مواد کی فراہمی ضروری ہے لہٰذا اُردو یونیورسٹی نے مختلف طریقوں سے اُردو میں مواد کا نظم کیا ۔ کچھ مواد یہاں بھی تیار کیا گیا مگر علمی کتابوں کی منظّم اور مستقل اشاعت کا سلسلہ شروع نہیں کیا جاسکا۔

موجودہ شیخ الجامعہ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز نے اپنی آمد کے ساتھ ہی اُردو کتابوں کی اشاعت کے تعلق سے انقلاب آفریں فیصلہ کرتے ہوئے ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز کا قیام عمل میں لایا۔ اس ڈائرکٹوریٹ میں بڑے پیمانے پر نصابی اور دیگر علمی کتب کی تیاری کا کام جاری ہے۔کوشش یہ کی جارہی ہے کہ تمام کورسز کی کتابیں متعلقہ مضامین کے ماہرین سے راست طور پر اُردو میں ہی لکھوائی جائیں۔اہم اور معروف کتابوں کے تراجم کی جانب بھی پیش قدمی کی گئی ہے۔توقع ہے کہ مذکورہ ڈائرکٹوریٹ ملک میں اشاعتی سرگرمیوں کا ایک بڑا مرکز ثابت ہوگا۔اب تک یہاں سے تین درجن سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور توقع ہے کہ آنے والے دنوں میں بھی یہاں سے کثیر تعداد میں اُردو کتابیں شائع ہوں گی۔

زیرنظر کتاب فاصلاتی طریقہ تعلیم کے تحت بی اے سال اول کے طلبہ کے لیے تیار کی گئی ہے جس سے روایتی طریقہ تعلیم کے طلبہ بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔کتاب کی تیاری میں حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ طلبہ یہاں جن موضوعات کا مطالعہ کریں ان پر انہیں بھرپور اور مکمل مواد دستیاب ہو جائے۔

یہ اعتراف ضروری ہے کہ حالیہ عرصے میں جو بھی کتابیں شائع کی جارہی ہیں ان میں شیخ الجامعہ کی راست سرپرستی اور نگرانی شامل ہے۔اُن کی خصوصی دلچسپی کے بغیر اس کتاب کی اشاعت ممکن نہ تھی۔نظامت فاصلاتی تعلیم اور شعبہ اُردو کے اساتذہ اور عہدیداران کا بھی عملی تعاون شاملِ حال رہا ہے جس کے لیے اُن کا شکریہ بھی واجب ہے۔

اُمید ہے کہ قارئین اور ماہرین اپنے مشوروں سے نوازیں گے۔

پروفیسر محمد ظفرالدین
ڈائرکٹر، ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشنز

ڈائرکٹر کا پیغام

فاصلاتی طریقۂ تعلیم سارے عالم میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور چہار سو اس طریقے سے بڑی تعداد میں لوگ تعلیم اور اسناد سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں سے ہی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طریقے کو اختیار کیا تھا۔ بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اِس یونیورسٹی نے روایتی طریقۂ تعلیم سے پہلے فاصلاتی طریقے سے تعلیم کو اُردو عوام تک پہنچانے کا سلسلہ شروع کیا۔ پہلے پہل یہاں کے تدریسی پروگراموں کے لیے بعض دوسری یونیورسٹیوں کے نصابی مواد سے من وعن اور بشکل ترجمہ استفادہ کیا گیا۔ اِرادہ یہ تھا کہ بہت تیزی سے اپنا نصابی مواد تیار ہوجائے گا اور بتدریج دوسری یونیورسٹیوں پر سے انحصار ختم ہوجائے گا۔ لیکن جب نصابی مواد کی تیاری کا سلسلہ شروع کیا گیا تو اندازہ ہوا کہ یہ اتنا آسان کام نہیں تھا۔ قدم قدم پر مسائل پیش آئے اور مختلف النوع اُلجھنوں نے رفتار کو سست کردیا۔ مگر کوششیں جاری رہیں اور نتیجے کے طور پر اب بہت تیزی سے یونیورسٹی نے اپنے نصابی مواد کی اشاعت شروع کردی ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم (ڈی ڈی ای)، مانو نے طلبا کی سہولت کے لیے ایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے جس میں 9 علاقائی مراکز (بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکتہ، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر) اور 5 ذیلی علاقائی مراکز (حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح اور امراوتی) شامل ہیں۔ ہر علاقائی/ذیلی علاقائی مرکز (Regional Centre/Sub Regional Centre) فاصلاتی تعلیم کے طلبا کو "Learner Support Centre" کے ذریعہ تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتا ہے۔ سال 18-2017 میں، نظامت فاصلاتی تعلیم میں علاقائی/ذیلی علاقائی مرکز کے ذریعہ 158 ''Learner Support Centres'' چلائے جارہے تھے۔ اپنے آپ کو جدید تر بنانے اور فاصلاتی طلبا کی سہولت کے لیے معیار میں اضافہ کرنے کی خاطر ڈی ڈی ای نے یو جی اور نئے ایم اے پروگراموں کے لیے 'انتخاب پر مبنی کریڈٹ سسٹم' (Choice Based Credit System-CBCS) متعارف کیا ہے۔ ڈی ڈی ای نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کردیا ہے۔ اب ڈی ڈی ای کے تمام پروگراموں کے لیے داخلے صرف آن لائن طریقے سے ہی دیے جارہے ہیں۔

کسی بھی وقت، کہیں بھی اکتسابی ماحول فراہم کرنے کے لیے یونیورسٹی کا 'انسٹرکشنل میڈیا سنٹر' ویڈیو لکچرز تیار کررہا ہے جو یوٹیوب چینل http://youtube.com/u/imcmanuu پر دستیاب ہیں۔ مستقبل میں یونیورسٹی کی ویب سائٹ کے ذریعے طلبا کو اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں فراہم کرنے کا بھی منصوبہ ہے۔ ڈی ڈی ای اور طلبا کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس کی سہولت فراہم کی جارہی ہے جس کے ذریعہ طلبا کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، تفویضات (Assignments)، کونسلنگ اور امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔

فی الحال نظامتِ فاصلاتی تعلیم میں یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورس پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلائے جارہے۔ بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز (Skill Based Courses) بھی شروع کیے جائیں گے۔ اپنی کاوشوں کے ذریعہ ڈی ڈی ای نارساؤں تک پہنچنے کی بھرپور کوشش کررہی ہے۔ امید ہے کہ سماج کے تعلیمی، معاشی اور ثقافتی طور پر پچھڑے طبقات کو مرکزی دھارے میں لانے میں ڈی ڈی ای، مانو کا بھی نمایاں کردار رہے گا۔

پروفیسر پی فضل الرحمٰن

ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

کورس کا تعارف

نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے طلبا کی تعلیمی ضرورت کے پیش نظر اردو زبان و ادب کے موضوع پر درسی مواد تیار کیا ہے۔ یہ مواد بی اے سال اول کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) کی ہدایت کے تحت یونیورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے لیے ایک ہی نصاب لازمی قرار دیا گیا ہے، تاکہ نہ صرف ان دونوں نظام تعلیم کے طلبا کا معیار یکساں ہو، بلکہ حصول تعلیم کے لیے فراہم کی جانے والی مختلف سہولیات کے اس دور میں طلبا کے لیے دوران تعلیم ایک نظام تعلیم سے دوسرے نظام تعلیم کی طرف منتقلی بھی قابل عمل ہو۔

اس ہدایت کے تحت یونیورسٹی میں فراہم کیے جا رہے تمام مضامین میں روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کا ایک ہی نصاب تیار کیا گیا ہے۔ یکساں نصاب کی تیاری کے بعد اسی کے مطابق درسی مواد کی تیاری بھی مطلوب تھی۔ اس لیے نئے نصاب کے مطابق نئی اکائیاں لکھوانے کے علاوہ پرانے تحریر شدہ مواد کا کچھ حصہ بھی ضروری ترامیم اور اضافے کے ساتھ اس کتاب میں شامل کیا گیا۔ اس درسی مواد کی تیاری میں اردو ادب کے تقریباً تمام اہم موضوعات اور پہلوؤں کا جامع احاطہ کیا گیا ہے۔ اس طرح یونیورسٹی کے ذریعہ تیار ہونے والے اس درسی مواد میں ایک معیاری، ہمہ گیر اور اردو ادب کے پورے کورس کا احاطہ کرنے کوشش کی گئی ہے جس سے نہ صرف یہ کہ اردو ادب کے طلبہ وطالبات کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل ہوگی بلکہ اردو ادب کے مختلف موضوعات پر قابل قدر تحریری مواد بھی دستیاب رہے گا۔ اس نصاب کی تیاری میں قدیم نصاب کی خوبیوں کو باقی رکھتے ہوئے ضروری حذف و اضافہ کے ساتھ مضامین میں ایسی ترتیب اختیار کی گئی ہے جو روایتی تعلیم کے سمسٹر سسٹم اور فاصلاتی تعلیم کے سالانہ نظام کی ضرورت بیک وقت پوری کر سکے۔ ہر اکائی کے تحت خلاصہ، اپنی معلومات کی جانچ، امتحانی سوالات کے نمونے، فرہنگ اور سفارش کردہ کتابوں کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ امید ہے یہ معلومات طلبا کے لیے بے حد معاون ہوں گی۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم بی اے کورس کی یہ کتاب آپ کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ سال اول کے اس پہلے پرچہ کا عنوان ''تاریخ ادب اردو (دکنی دور تا ترقی پسند تحریک)'' ہے۔ اس پرچہ میں کل بیس اکائیاں ہیں جنہیں چھ ابواب (بلاک) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ اردو ادب کی تاریخ کے تقریباً مکمل حصے کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ یہ طلبا کی تعلیمی ضرورت کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی معلومات میں اضافے کا باعث بھی بنے۔

اب نئی صورت میں یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ کی بیش قیمت آرا سے ہمیں اس کتاب کو مزید بہتر، کارآمد اور مفید بنانے میں مدد ملے گی۔

ڈاکٹر ارشاد احمد
کورس کوارڈی نیٹر و ایڈیٹر
نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

پہلا باب: اُردو زبان کا آغاز وارتقا

اکائی 1 ہندآریائی کا ارتقا

اکائی کے اجزا

1.0 مقصد

1.1 تمہید

1.2 ہندآریائی کا پس منظر

1.2.1 ہندوستان کے قدیم باشندے

1.2.2 آریاؤں کی آمد

1.3 ہندآریائی کا ارتقا

1.3.1 زبانوں کی گروہ بندی

1.3.2 ہندآریائی کے ادوار

1.4 قدیم ہندآریائی دور

1.4.1 ویدک سنسکرت

1.4.2 کلاسیکل سنسکرت

1.5 وسطی ہندآریائی دور

1.5.1 پالی

1.5.2 پراکرت

1.5.3 اپ بھرنش

1.6 جدید ہندآریائی دور

1.6.1 جدید ہندآریائی زبانیں

1.6.2 جدید ہندآریائی زبانوں کی گروہ بندی

1.6.3 جدید ہندآریائی اوراردو

1.6.4 اردو کا ہندآریائی پس منظر

1.6.5 اردو کی لسانی ساخت، ڈھانچے اور کینڈے پر ہندآریائی عناصر کے نقوش

1.7 خلاصہ

1.8 نمونۂ امتحانی سوالات

1.9 فرہنگ

1.10 سفارش کردہ کتابیں

1.0 مقصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو ہندآریائی کے ارتقا سے واقف کروانا ہے۔اس اکائی کے مطالعہ سے آپ اس قابل ہوجائیں گے کہ

☆ ہندآریائی کے مختلف ادوار کا جائزہ لے سکیں

☆ ہندوستان کی مختلف زبانوں اور بولیوں کے باہمی تعلق کو سمجھ سکیں

☆ ہندوستان کی جدید زبانوں کے آغاز وارتقا کی معلومات حاصل کرسکیں

☆ ہندآریائی سے اردو کے رشتے کو بیان کرسکیں

1.1 تمہید

دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ان میں سے بعض زبانوں میں یکسانیت ہوتی ہے اور بعض میں اختلاف ہوتا ہے۔ان زبانوں کو یکسانیت اور اختلاف کی بنیاد پر مختلف خاندانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔زبانوں کے ان خاندانوں میں ہند یوروپی خاندان نمایاں حیثیت اور اہمیت رکھتا ہے۔ ہند یوروپی خاندان کی جن زبانوں کا تعلق ہندوستان سے ہے انھیں ہندآریائی زبانیں کہا جاتا ہے۔ان زبانوں کو ہندآریائی کا نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ ان زبانوں کا فروغ ایران سے ہندوستان آکر بسنے والے آریاؤں کی زبان سے ہوا ہے۔آریاؤں کی زبان کے قدیم ترین نمونے ان کی مقدس کتاب ''رگ وید'' میں ملتے ہیں۔

ہندآریائی کا ارتقا تین ادوار میں ہوا ہے:

1۔ قدیم ہندآریائی

2۔ وسطی ہندآریائی

3۔ جدید ہندآریائی

اس اکائی میں آپ ہندآریائی کے تینوں ادوار کے بارے میں تفصیل سے پڑھیں گے۔ہندآریائی کے ارتقا سے قبل اس کے پس منظر کا بھی مطالعہ کریں گے۔ ہندآریائی خاندان کی ایک مشہور اور مقبول زبان اردو کا تعلق جدید ہندآریائی دور سے ہے۔اس لحاظ سے ہندآریائی کے ادوار پر روشنی ڈالنے کے بعد جدید ہندآریائی دور کے تحت اردو زبان کے آغاز کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔اس کے علاوہ ہندآریائی اور اردو کے رشتوں کے ساتھ ساتھ ہند آریائی عناصر کے اردو زبان کی لسانی ساخت اور ڈھانچے پر پڑنے والے اثرات کا بھی تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

آپ کی آسانی کے لیے اس اکائی کا خلاصہ اور امتحانی سوالات کے نمونے دیے گئے ہیں۔ فرہنگ میں نئے الفاظ کے معنی اور مزید مطالعے کے لیے سفارش کردہ کتابوں کی فہرست بھی دی گئی ہے۔

1.2 ہند آریائی کا پس منظر

1.2.1 ہندوستان کے قدیم باشندے

ہندوستان ایک وسیع و عریض ملک ہے جس میں کہیں اونچے پہاڑ، گہری ندیاں، زرخیز زمین، لہلہاتے کھیت، برف سے ڈھکی چٹانیں، خوبصورت وادیاں، خوشنما اور خوشبو سے مہکتے باغات، خوبصورت مناظر، کہیں گھنے جنگل ہیں اور کہیں ریگستان، کہیں زمین سونا اگلتی ہے اور کہیں دیگر معدنیات نکلتے ہیں۔ یہاں کی ثقافت دنیا کی قدیم ترین ثقافتوں میں ہے۔ اس کی تاریخ گذشتہ پانچ ہزار سال پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں صوفیا، سادھو، سنت سبھی آتے رہے ہیں۔ یہاں کی تہذیب مشترکہ تہذیب ہے۔ مختلف مذاہب کے لوگ، مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف رسوم و رواج غرض اس کی رنگارنگی ایک خوبصورت گلدستہ کی مانند ہے۔ یہاں وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا حسن ملتا ہے۔ زمانۂ قدیم سے لوگ یہاں بستے ہیں اور باہر سے آتے رہے ہیں۔ ذیل میں ہندوستان کے چند قدیم باشندوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

(1) نگریٹو (Negretos): یہ آفریقہ کے کچھ قبائل تھے جو ترک وطن کر کے زرخیز زمینوں کی تلاش میں ہندوستان آئے تھے۔ ان آفریقی قبائل کے کچھ نشانات جزائر انڈمان میں پائے جاتے ہیں۔

(2) پروٹو آسٹرلوائیڈ (Proto-Australoid): یہ فلسطین سے آئے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے علاوہ سیلون، برما، اور آسٹریلیا کا بھی رخ کیا اور وہاں آباد ہوئے۔

(3) آسٹرک (Austric): آسٹرک بحیرۂ روم کے علاقے سے آئے تھے اور انہوں نے عراق کے راستے سے یہ سفر طے کیا تھا۔ یہ شمالی ہندوستان کے بعض حصوں میں بس گئے۔ انہی میں سے کچھ لوگ ہند چین اور انڈونیشیا چلے گئے تھے۔

(4) دراوڑی (Dravidians): یہ لوگ بحیرۂ روم اور ایشیائے کوچک کے باشندے تھے۔ وہاں سے نکل کر یہ لوگ کافی عرصہ عراق میں رہے پھر بلوچستان ہوتے ہوئے ہندوستان پہنچے۔ تقریباً ساڑھے تین ہزار قبل مسیح میں انہوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا۔ یہ لوگ پنجاب اور سندھ کے علاقے ہڑپا اور موہنجودارو میں آباد ہوئے۔ ان کے دو چار گروہ جو کنڑی، تلگو، تامل، ملیالم زبانیں بولتے ہیں، تہذیبی و تمدنی اعتبار سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ ان کا اثر قریب قریب سارے ہی جنوبی ہند پر پایا جاتا ہے۔ دراوڑی زبانیں بولنے والوں کی تعداد خاصی بڑی ہے۔ شکاگو یونیورسٹی میں ان کا شعبہ قائم ہے۔ وسکانسن اور یونیورسٹی آف کیلی فورنیا اور کچھ گشتی اسکول بھی ہیں جہاں کوئی نہ کوئی دراوڑی زبان پڑھائی جاتی ہے کیوں کہ اس حقیقت کو اب دوسرے ممالک کے لوگ جاننے لگے ہیں کہ ان کے متعلق واقف ہوئے بغیر ہندوستان کی پورے طور پر آگہی نہیں ہوسکتی۔

ہندوستان کی تہذیب و تمدن کی بنیاد دراوڑیوں ہی نے رکھی۔ اپنے عہد میں دراوڑی تہذیب دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ تہذیبوں میں شمار ہوتی تھی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت ہڑپا اور موہنجودارو ہیں۔ جس تہذیب نے ہندوستان میں ہڑپا اور موہنجودارو کو تخلیق کیا وہ ہندوستان سے عراق اور مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے دریائے سندھ کی وادی میں کئی شہری ریاستیں بنالی تھیں۔ وادیٔ سندھ کے آس پاس کے علاقوں میں صوبۂ سرحد، سندھ اور بلوچستان میں اس تہذیب کے نمونے موجود ہیں۔ یہ تہذیب مشرقی پنجاب، مغربی یوپی اور راجپوتانے تک پھیلی ہوئی تھی۔

دراوڑی تہذیب خاصی قدیم تھی۔ دراوڑیوں نے زراعت کو ترقی دی، آب رسانی کے لیے دریاؤں پر پشتے باندھے تھے اور فصیلوں

سے گھرے ہوئے شہر تعمیر کیے تھے۔ ان کے یہاں صنعت وحرفت بہت ترقی کر چکی تھی۔ سوتی اور اونی کپڑوں کی بنائی اور رنگائی' سونے چاندی کے جڑاؤ زیور بنانا ان کی خاص صنعتیں تھیں۔ مغربی اور مشرقی ایشیا کے ملکوں سے بحری تجارت کرتے تھے۔ ان کا اپنا الگ رسم الخط' ہندسے اور تقویم تھی۔ آریا جب ہندوستان آئے تو انہوں نے دراوڑی تہذیب سے استفادہ کیا۔ ہندوستان میں آریاؤں کے پہلے گروہ کی آمد پر ان کا مقابلہ دراوڑیوں سے ہوا۔ آریاؤں نے دراوڑیوں کو شکست دی' انہیں جنوبی ہندوستان کی طرف دھکیل دیا اور خود شمالی ہندوستان کے اکثر حصوں پر قابض ہوگئے۔ آریاؤں نے دراوڑی تہذیب کے بہت سے عناصر قبول کیے جن میں دیو مالا کے تصورات' کھانے پینے کی چیزوں میں پان سپاری اور لباس میں دھوتی ساری وغیرہ شامل ہیں۔ دراوڑیوں نے بھی آریائی اثرات قبول کیے۔

(5) آریا: آریا قوم 1500 قبل مسیح میں اپنے وطن وسط ایشیا سے روانہ ہوئے' ایران' افغانستان میں کچھ عرصہ ٹھہر کر ہندوستان آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ وہ مختلف جتھوں کی شکل میں ہندوستان وارد ہوئے۔ ہندوستان آمد پر ان کا مقابلہ مقامی باشندوں' دراوڑیوں سے ہوا۔ آریاؤں نے انہیں جنوب کی طرف دھکیل دیا اور خود شمالی ہندوستان پر قابض ہوگئے۔

تلاش معاش اور فراہمی روزگار کے مقصد سے آریا ہندوستان کے زرخیز علاقوں میں وارد ہوئے اور یہاں زراعتی زندگی اختیار کی۔ ہندوستان میں داخلے کے وقت انہیں مقامی باشندوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا' کبھی تو معرکہ آرائی اور کشاکش سے بھی گزرنا پڑا۔ انہیں دراوڑیوں پر جسمانی برتری حاصل تھی' جنگی صلاحیتوں میں بھی آگے تھے۔ آریاؤں کو ہمیشہ فتح ہوتی رہی۔ آریا اپنے ساتھ اپنی زبان' اپنی تہذیب' اپنے عقائد لائے لیکن یہاں کی دراوڑی تہذیب کے بہت سے عناصر قبول کیے اور بہت کچھ انہیں دیا بھی۔

(6) منگول نسل کے لوگ بھی مختصر عرصہ کے لیے ہندوستان آئے۔ ان کی یادگار آسام اور نیپال کی پہاڑی بولیاں ہیں۔ یہ لوگ آریاؤں کے بعد آئے اور ہمالیہ کے دامن میں بس گئے۔ یونانی لوگ ہندوستان آئے۔ یونانیوں کے بعد شاک اور ہن آتے رہے۔ انہوں نے ہندوستانی تہذیب پر بہت ہی معمولی اثر چھوڑا کیوں کہ ان کا اختلاط وقتی تھا۔

(7) شاکا اور کشان وسط ایشیا کے خانہ بدوش قبیلے تھے ان کے بعد ہن (Hun) گروہ بھی ہندوستان آیا۔

(8) عرب تاجر قبل اسلام جنوبی ہند آکر بس گئے۔ ایرانی بھی عرب تاجروں کے ساتھ شریک تھے۔ 712ء میں محمد بن قاسم کے ساتھ مسلمان یہاں آئے اور یہ سلسلہ سلطنت مغلیہ کے سولہویں صدی عیسوی میں استحکام تک جاری رہا۔ بعد میں پرتگیزی' ڈچ اور دیگر یوروپی اقوام کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔

1.2.2 آریاؤں کی آمد

آریاؤں کا اصلی وطن وسط ایشیا کا ایک خشک پہاڑی علاقہ تھا۔ انہیں اس علاقے کو چھوڑ کر زرخیز زمین اور اپنے جانوروں کے لیے گھاس کے میدانوں کی تلاش میں اپنے وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ 1500 قبل مسیح میں آریا ہندوستان آئے۔ آریا وسط ایشیا سے آئے تھے۔ ان کے راستے میں مشرقی ایران' افغانستان اور دوسرے مقامات آئے لیکن وہ وہاں صرف تھوڑے عرصے کے لیے ٹھہرے اور ہندوستان کے زرخیز میدان میں پہنچ کر ایسے ٹھہرے کہ پھر کہیں نہ گئے۔ آریا لوگ پہلے سندھ میں داخل ہوئے' وہاں سے پنجاب میں پھیلے اور پھر مشرقی ہندوستان میں آباد ہونا شروع ہوئے۔ آریا ایک ہی وقت میں سارے کے سارے مل کر ہندوستان میں وارد نہیں ہوئے بلکہ رفتہ رفتہ مختلف جتھوں کی شکل میں آتے رہے۔ یہاں پر آریا سیاسی دبدبہ اور عسکری طاقت کے ساتھ نہیں آئے اور نہ اقتدار وحکومت ان کا مقصد تھا بلکہ محض آبادکاری' تلاش معاش اور فراہمی روزگار ان کی غائت تھی۔ ہندوستان آنے کے کچھ ہی عرصے بعد انہوں نے زراعتی زندگی اختیار کر لی۔

ہندوستان میں آریاؤں کو با آسانی داخلہ نصیب نہ ہوا بلکہ مقامی باشندوں کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ سخت معرکہ آرائیاں بھی ہوئیں۔ وقتاً فوقتاً جب بھی کوئی نیا جتھا آتا اسے مقامی لوگوں کے ساتھ کشاکشی کرنی پڑتی۔ بالعموم آنے والے کامیاب ہوتے اور اپنے لیے یہاں جگہ پیدا کر لیتے۔ یہی صورت حال رہی پھر آہستہ آہستہ یہ بات باقی نہ رہی۔ بعد میں آنے والوں کے لیے آسانیاں پیدا ہوتی گئیں۔ آریاؤں کے بہ زور داخلہ کے بعد مقامی باشندوں اور نو واردوں کے درمیان زیادہ دنوں تک اجنبیت باقی نہ رہی۔ آہستہ آہستہ روادارانہ فضا پیدا ہونے لگی۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ مفاہمانہ رویہ اپنایا۔ طرز معاشرت، مذہبی عقائد اور زبانیں آپسی میل جول سے متاثر ہونے لگیں۔ یہ اور بات ہے کہ آریا بعد میں اپنی انفرادیت اور شناخت کی برقراری کے لیے مقامی باشندوں کے ساتھ ویسے روادار باقی نہ رہے جیسے یہاں قدم جمانے تک تھے۔

آریاؤں کو مقامی باشندوں، دراوڑیوں پر جسمانی برتری حاصل تھی، آریا جنگ کے بہترین طریقوں سے واقف بھی تھے اس لیے انہوں نے مقامی باشندوں کو ان کے علاقوں سے نکال کر جنوبی ہند میں دھکیل دیا اور خود شمالی ہندوستان کے اکثر حصوں پر قابض ہو گئے۔ آہستہ آہستہ ان نسلوں میں مفاہمت پیدا ہونا شروع ہوئی، نفرتیں دور ہوئیں اور آپس میں گھل مل گئیں۔ آریا دراوڑی تہذیب اور ان کے تمدن سے ضرور متاثر ہوئے۔ انہوں نے یہاں کی معاشرت سے بہت کچھ سیکھا۔ انہوں نے بہت کچھ دیا بھی ہے۔ اگر وہ یہ چاہتے کہ یہاں سے کچھ نہ لیں یعنی یہاں کے مطابق نہ ہوں بلکہ یہاں کے لوگوں کو کلیتًا اپنے مطابق بنالیں تو یقیناً وہ یہاں اس قدر بارآور نہ ہو سکتے تھے اور ہندوستان کی تہذیب وہ نہ ہو سکتی تھی جو ان کے آنے کے بعد یہاں کے عناصر کو شامل کر کے ہو سکی۔ یہاں کی دنیا ایران کی دنیا سے مختلف تھی۔ یہاں دراوڑی اور دوسری قوموں کے لوگ آباد تھے جن کی مخصوص تہذیب تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آریائی زبان، آریائی مذہب اور آریائی زندگی سب پر اس اختلاط کا اثر پڑا۔ بعض چیزوں میں یہ اثر کچھ گہرا تھا بعض میں بالکل معمولی۔ دراوڑی تہذیب کو آریاؤں کی آمد نے وندھیاچل سے جنوب میں دھکیل دیا۔ دراوڑی تہذیب کے اثرات آریوں کے غلبے کے باوجود اس تہذیب میں بکثرت دیکھے جاسکتے ہیں جو آریوں کے شمالی ہند میں پھیل جانے کے بعد وجود میں آئی۔ یعنی فاتح قبائل کے اثرات کے ساتھ مفتوح قبائل کے اثرات بھی اپنا کام کرتے رہے۔ گو آریوں کے مقابلے میں ہندوستان کے قدیم بسنے والے ٹھہر نہ سکے اور عام طور سے شمالی ہند کے میدان خالی کر کے جنوب میں چلے گئے لیکن نہ تو سب ہی کا جانا ممکن تھا اور نہ آریا فاتحین کے لیے مفید۔ اس لیے ان میں نسلی اختلاط بھی ہوا۔

آریا اپنے ساتھ اپنی تہذیب، اپنی زبان، اپنے عقائد لائے۔ یہ کھیتی باڑی کی معلومات بھی رکھتے تھے۔ ہندوستان کو آریاؤں کی سب سے بڑی دین زبان تھی۔ قدیم آریائی تہذیب کی ایک اور بڑی دین براہمی رسم الخط ہے جس کا ارتقا ہندوستان میں ہوا اور جو ہندوستان کی تمام زبانوں کی لکھاوٹوں (سوائے اردو) کا ماخذ ہے اور جسے آریوں نے شروع سے اپنی زبانوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ دراوڑی جنوبی ہند میں سمٹ کر رہ گئے تھے اس لیے ملک کے دوسرے حصوں میں ان کی زبانوں (تامل، تلگو، ملیالم اور کنڑ) کو فروغ کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اس کے برعکس آریا تمام ملک میں پھیلے اور اس وجہ سے ان کی زبان بھی پورے ملک میں پھیل سکی۔

ہندوستان آنے سے پہلے آریا مختلف ذاتوں میں تقسیم نہیں ہوئے تھے۔ جب تک ذات پات کا نظام نہ تھا اس وقت تک زبان میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا تھا۔ آریاؤں کے ہندوستان آنے کے بعد ذات پات کے نظام (برہمن، چھتری، ویش، شودر) کے ساتھ مختلف ذاتوں کی زبانوں کے درمیان بہت بڑا فرق پیدا ہو گیا۔ سنسکرت اونچے طبقے کی تہذیب یافتہ زبان ہو گئی تھی اور مختلف پراکرتیں جو اس دور میں رائج رہیں، عوام کی فطری بولیاں بنی رہیں۔ تہذیبی سرمایہ سنسکرت کے گہوارے میں پروان چڑھا تھا۔ ڈراموں میں برہمن، بادشاہ، وزیر اور امیر کبیر کی زبان سے اسے بلوایا جانے لگا تھا۔ عورتوں اور عام لوگوں کی زبان پر پراکرتیں رواں رکھی جاتی تھیں۔ قواعد دانوں اور اعلیٰ ذات والوں نے حد بندیوں میں سختی کی تاکہ سنسکرت صرف خواص کی زبان پر آئے، عوام کی زبانوں پر نہ آئے تاکہ اس کا تقدس اور معیار برقرار رکھا جاسکے۔ اس سختی اور معیار بندی سے بھی پراکرتوں کو فائدہ پہنچا اور ارتقا کا دروازہ مزید کھل گیا۔

آریوں نے دراوڑی مذہب اور تہذیب کے بہت سے عناصر قبول کیے' بعض دیوی دیوتاؤں کے تصورات اور دیو مالا' کچھ کھانے پینے کی چیزیں (پان سپاری) اور لباس (دھوتی اور ساری) وغیرہ۔ دراوڑی زبانوں کا آریائی زبان کی قواعد اور صوتیات پر کافی اثر پڑا اور آریائی زبان نے ہند ایرانی منزل سے گزر کر ہند آریائی شکل اختیار کر لی۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ ہندوستان کے قدیم باشندے کون تھے؟

2۔ ہندوستان میں آریاؤں کی آمد کب ہوئی؟

3۔ ہندوستان کو آریوں کی سب سے بڑی دین کیا ہے؟

1.3 ہند آریائی کا ارتقا

1.3.1 زبانوں کی گروہ بندی

دنیا کے مختلف خطوں اور علاقوں میں مختلف زبانیں اور بولیاں بولی جاتی ہیں۔ ماہر لسانیات نے دنیا کی کل زبانوں کی تعداد مقرر کرنے کی کوشش کی جس میں مقامی بولیاں شامل نہیں کی گئیں۔ مشہور زبانوں کی تعداد قیاساً دو ہزار سات سو چھیانوے (2796) بتائی جاتی ہے۔ ان میں سے بعض زبانیں آپس میں ملتی جلتی ہیں یعنی باہم مماثلت رکھتی ہیں اور بعض ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ جو زبانیں باہم مماثلت رکھتی ہیں یعنی جن زبانوں میں لسانیاتی بنیادوں پر یکسانیت پائی جاتی ہے انہیں ایک گروہ یا زمرے میں رکھا گیا ہے۔ زبانوں کے اسی گروہ یا زمرے کو لسانی خاندان (Language Family) کہتے ہیں۔ لسانی خاندان کے لیے خاندان السنہ (زبانوں کا خاندان کی اصطلاح) بھی استعمال کی جاتی رہی ہے۔ دنیا کی زبانوں کو آٹھ اہم گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (1) سامی (2) افریقی بانتو (3) دراوڑی (4) ہند چینی (5) ملائی خاندان (6) منڈا (7) امریکہ کی عہد قدیم کی زبانیں (8) ہند یوروپی خاندان۔

ہند یوروپی خاندانِ السنہ کی مشہور شاخیں یہ ہیں۔ (1) آرمینین (2) بالٹک یا سلافی خاندان (3) البانوی (4) یونانی (5) اطالوی (6) کیلٹک (7) ٹیوٹائی (8) ہند ایرانی خاندان۔ ہمارے موضوع کا تعلق ہند ایرانی خاندان سے ہے۔ ہند ایرانی خاندان دو مشہور خاندانوں میں تقسیم ہو گیا۔ (1) ایرانی خاندان اور (2) ہند آریائی خاندان۔

ہندوستان میں آریا کئی گروہوں کی شکل میں آئے۔ اندازہ ہے کہ وہ پندرہ سو (1500) قبل مسیح اور بارہ سو (1200) قبل مسیح کے درمیان مغربی ہندوستان میں بس چکے تھے۔ آریا وسط ایشیا سے آئے تھے۔ ان کے راستے میں ایران' افغانستان اور دوسرے مقامات آئے لیکن وہ وہاں کچھ عرصہ ٹھہر کر ہندوستان آ گئے۔ وہ اپنے ساتھ آریائی زبان لاتے ہیں۔

1.3.2 ہند آریائی کے ادوار

ہند آریائی کے ارتقا کو عام طور پر تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یہ ادوار درج ذیل ہیں:

1۔ قدیم ہند آریائی 1500 ق م تا 500 ق م (1000 سال)

قدیم ہند آریائی کے دو ذیلی ادوار ہیں:

(i) ویدک سنسکرت 1500 ق م تا 1000 ق م (500 سال)

(ii) کلاسیکل سنسکرت 1000 ق م تا 500 ق م (500 سال)

2۔ وسطی ہند آریائی دور 500 ق م تا 1000ء (1500 سال)

وسطی ہند آریائی کے تین ذیلی ادوار ہیں:

(i) پالی 500 ق م تا مولود مسیح یعنی ایک عیسوی (500 سال)

(ii) پراکرت مولود مسیح (ایک عیسوی) تا 500ء (500 سال)

(iii) اپ بھرنش 500ء تا 1000ء (500 سال)

3۔ جدید ہند آریائی دور 100ء تا حال

بعض لوگ ان تاریخوں کو سو سال ادھر ادھر کر کے پیش کرتے ہیں یعنی کلاسیکل سنسکرت اور پالی کی حد 500 ق م کی بجائے 600 ق م پر اور پراکرت اور اپ بھرنش کے ڈانڈے 500ء کی بجائے 600ء قرار دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زبانیں سو پچاس سال میں نہیں بدلی جاتیں۔ ان میں عبوری دور سو دو سو سال کا ہوتا ہی ہے۔ اس لیے 500 اور 600 میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ حد بندی بھی محض ایک سہولت معلوم ہوتی ہے ورنہ دو دو منزلیں بہ یک وقت کئی سو سال تک ملی جلی چلتی ہیں۔ بعض وقت تو یہ زمانی تعین محض دھوکا معلوم ہونے لگتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ دنیا کی زبانوں کو کتنے لسانی خاندانوں میں تقسیم کیا گیا ہے؟

2۔ ہند آریائی خاندان کا تعلق کس خاندان السنہ سے ہے؟

3۔ ہند آریائی کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے؟

1.4 قدیم ہند آریائی دور 1500 ق م تا 500 ق م (1000 سال)

قدیم ہند آریائی کے دو ادوار ہیں۔ پہلے دور کو ویدک سنسکرت یا ویدک زبان کہتے ہیں۔ دوسرے دور کو عوامی سنسکرت (لوک سنسکرت) یا کلاسیکل سنسکرت کہتے ہیں۔ کبھی کبھی سنسکرت کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ویدک زبان، سنسکرت کی قدیم شکل ہے، علاحدہ زبان نہیں۔ سنسکرت اسم مونث ہے۔ لفظ سنسکرت دو الفاظ سنس اور کرت سے بنا ہے۔ سنس کے معنی پاک، مقدس اور شستہ اور کرت کے معنی کرنے کے ہیں۔ سنسکرت کے معنی پاک صاف کی ہوئی زبان یعنی مقدس، افضل، مکمل، شستہ، اچھی طرح آراستہ کی ہوئی، مزین، عمدہ فائق اور مصفا زبان کے ہیں۔

1.4.1 ویدک سنسکرت

ویدک سنسکرت میں ہندوؤں کی مقدس کتابیں رگ وید، سام وید، یجر وید اور اتھر وید تخلیق کی گئیں۔ رگ وید حمدیہ اور مذہبی نظموں کا مجموعہ ہے۔ رگ وید کی تصنیف مختلف مقامات میں اور مختلف ادوار میں ہوئی ہے۔ مغربی علما کے مطابق اس کی تصنیف 1500 ق م کے قریب شروع ہو کر 1200 ق م پر ختم ہوتی ہے۔ سام وید اور اتھر وید 1000 ق م کے قریب کی تصانیف بتائی جاتی ہیں۔ رگ وید کی تصنیف مختلف مقامات میں ہوئی۔ کہیں اس میں گندھار کے راجہ کا ذکر ہے، کہیں دریائے سندھ کے کنارے بسنے والے راجہ کا ذکر ہے۔ ویدک سنسکرت میں قدیم اپنشد، دسوتر یا منتر گرنتھ بھی لکھے گئے۔

1.4.2 کلاسیکل سنسکرت

ویدک سنسکرت کے بعد سنسکرت زبان میں ادبی تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا جس کی وجہ سے یہ زبان کلاسیکل سنسکرت کہلائی۔ کلاسیکل سنسکرت

میں رامائن اور مہابھارت کی تخلیق عمل میں آئی۔قدیم ہند آریائی دور میں سنسکرت زبان کا ارتقا اور فروغ عمل میں آیا۔اس دور کی ایک نمایاں خصوصیت رہی ہے کہ آریوں کے شمال مغربی خطے سے مشرقی خطے کی جانب پھیلنے سے سنسکرت زبان کی مرکزیت ختم ہوجاتی ہے اور اس کا ایک معیار پر قائم رہنا مشکل ہوجاتا ہے۔ نیز مقامی بولیوں کے اختلاط کی وجہ سے اس کی تین علاقائی شکلیں ظہور پذیر ہوتی ہیں جنہیں اُدیچیہ' پراچیہ اور مدھیہ دیشیہ کہتے ہیں۔ اُدیچیہ شمال مغربی خطے میں رائج تھی اور آریوں کی معیاری بولی تصور کی جاتی تھی۔ یہ اس علاقے کی بولی تھی جہاں آج کل سندھی اور لہندا (مغربی پنجابی) زبانیں بولی جاتی ہیں۔اس میں ''ز'' اور ''ل'' کی جگہ صرف ''ز'' کی آواز پائی جاتی ہے۔ پراچیہ کا چلن مشرق میں تھا اور یہ معیار سے کافی دور جاپڑی تھی۔اس میں معیاری بولی اُدیچیہ کی بعض آوازوں کا تلفظ بگاڑ دیا جاتا تھا مثلاً اس میں ''ز'' کی جگہ ''ل'' کا چلن عام ہوگیا تھا۔ پراچیہ کا علاقہ وہ سرزمین تھی جہاں ان دنوں بنگالی' آسامی' اڑیا اور بہاری بولیوں یعنی مگہی' میتھلی اور بھوجپوری کا چلن ہے۔اُدیچیہ اور پراچیہ کے درمیانی علاقے کی بولی مدھیہ دیشیہ کہلاتی تھی۔ یہ نہ تو بہت معیاری بولی تھی اور نہ بالکل غیر معیاری۔اس میں ''ز'' اور ''ل'' دونوں آوازیں موجود تھیں۔ مدھیہ دیشیہ کا خاص علاقہ وہ تھا جہاں آج کل مغربی ہندی کی بولیاں یعنی کھڑی بولی' برج بھاشا' بندیلی اور قنوجی بولی جاتی ہیں اور جہاں اردو اور ہندی کا چلن عام ہے۔

قدیم ہند آریائی دور (ویدک اور کلاسیکل سنسکرت کا دور) کے اختتام پر سنسکرت زبان کا جید عالم اور قواعد داں پانی پیدا ہوتا ہے۔جس کی شہرہ آفاق تصنیف ایشٹا دھیائی سنسکرت زبان کی ایک منظوم قواعد ہے۔کہا جاتا ہے کہ پانی کا جنم 350 ق م اور وفات 250 ق م میں ہوئی۔ پانی کے بعد پتنجلی نے مہابھاشیہ نامی کتاب جس میں پانی کے قواعد کی تشریح اور توضیح کی گئی۔ پانی کے عہد تک پہنچتے پہنچتے سنسکرت زبان کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا اور یہ جمود کا شکار ہونے لگی تھی۔اس کی جگہ پر عوام ایک سادہ' آسان اور فطری زبان اختیار کرنے لگی تھی۔ چوں کہ سنسکرت زبان کو مذہبی تقدس بھی حاصل تھا اس لیے اس دور کے بعض عالموں کی توجہ اس زبان کی تشریح و توضیح اور اس کے قواعد کی ترتیب کی جانب مبذول ہوئی اور اس کی صوتیات' صرف ونحو اور قواعد سے متعلق کتابیں تیار کی جانے لگیں تا کہ اس زبان کی صحت کے ساتھ ادائیگی کی جاسکے اور اس کے متن کو صحت کے ساتھ محفوظ کیا جاسکے اور آنے والی نسلیں اس کے تلفظ اور قواعد کے اصولوں کی پابندی کرسکیں۔شستہ زبان ہونے کی وجہ سے ادبی تصنیفات سنسکرت میں ہونے لگی تھیں۔ ایک طرف یہ اس کی خوبی تھی لیکن دوسری طرف علمی و ادبی زبان ہونے کی وجہ سے یہ عوام سے ہٹنے لگی۔لگ بھگ اسی زمانے میں بدھ مت اور جین مت والوں نے اپنے اپنے مذاہب کا پرچار مقامی بولیوں میں کرنا شروع کیا جس کی وجہ سے مقامی بولیوں کو فروغ ہوا۔سنسکرت کے عالموں کو یہ اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں سنسکرت پھر مقامی زبانوں کی زد میں آکر اپنا روپ نہ کھودے' اس لیے یہ لوگ اپنی زبان کی سختی سے حفاظت کرنے لگے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ سنسکرت زبان' علمی' ادبی اور فنی حیثیت سے ایک مکمل' فصیح و بلیغ اور شستہ زبان ہے۔ایک زمانے میں سنسکرت راج دربار اور عوام کی زبان رہی ہے مگر بعد میں اس زبان کو عام ہونے سے روکا گیا اور صرف برہمن طبقے کو ہی سنسکرت زبان میں مہارت حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا گیا۔نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد سنسکرت صرف برہمن طبقے کی زبان بن کر رہ گئی۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ سنسکرت کی قدیم شکل کیا ہے؟

2۔ ویدک سنسکرت اور کلاسیکل سنسکرت کے دور میں کن مقدس کتابوں کی تخلیق ہوئی ؟

3۔ قدیم ہند آریائی دور کے ویدک سنسکرت اور کلاسیکل سنسکرت پر نوٹ لکھیے۔

1.5 وسطی ہند آریائی دور 500 ق م تا 1000ء (1500 سال)

وسطی ہند آریائی دور 500 ق م سے شروع ہوتا ہے جو 1000 عیسوی تک جاری رہتا ہے۔وسطی ہند آریائی کے تین دور ہیں (1) پالی (اسے

پہلی پراکرت یا ابتدائی پراکرت بھی کہا گیا ہے) 500 ق م تا مولود مسیح' 500 سال (2) پراکرت مولود مسیح تا 500 عیسوی' 500 سال (ادبی پراکرت) (3) اپ بھرنش 500 ءتا 1000 عیسوی' 500 سال (تیسری پراکرت)۔

سنسکرت کے زوال کے بعد 500 ق م سے پراکرتوں کا ظہور ہوتا ہے پراکرت دراصل ایک ایسی زبان تھی جو سنسکرت زبان میں تبدیلی کے نتیجے میں فطری طور پر ظہور پذیر ہوئی تھی۔ یہ ایک سادہ اور آسان زبان تھی۔ اسے عوام میں بہت جلد مقبولیت حاصل ہوگئی اور یہ بہت جلد عام بول چال کی زبان بن گئی۔ جب کہ سنسکرت خواص اور طبقۂ اشراف کی زبان بن چکی تھی اور قواعد کے اصولوں میں جکڑا کر جامد بنادی گئی تھی۔ یہ سماج کے اعلیٰ طبقے کے لیے مختص ہوکر رہ گئی تھی اور سماج کے دبے کچلے' نچلے طبقے کے لوگوں کے استعمال کی زبان باقی نہ رہی۔ اس بات کا اندازہ ہمیں اس دور کے سنسکرت ڈراموں سے ہوتا ہے جن میں اعلیٰ طبقے اور اونچی ذات سے تعلق رکھنے والے کردار سنسکرت میں کلام کرتے ہیں اور نیچی ذات کے کرداروں سے پراکرت میں مکالمے ادا کروائے جاتے ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ پراکرت کوئی علاحدہ زبان نہیں تھی بلکہ سنسکرت کی ہی بدلی ہوئی شکل تھی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ سنسکرت کی ہی کوکھ سے پیدا ہوئی تھی۔ لسانیات کا یہ ایک عام اصول ہے کہ جب ایک زبان مرجاتی ہے تو اس کے بطن سے دوسری زبان پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ زبان مدت تک پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی رہتی ہے۔ پھر یہ بھی مردہ ہوجاتی ہے اور اس کی جگہ ایک نئی زبان معرض وجود میں آجاتی ہے۔ زبانوں کے ارتقا اور فنا کا یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے۔ کوئی بھی زبان از خود پیدا نہیں ہوتی بلکہ ہر زبان کا کوئی نہ کوئی ماخذ اور منبع ضرور ہوتا ہے جس سے یہ ارتقا پاتی ہے۔ پراکرت کا ماخذ و منبع بھی سنسکرت زبان ہی ہے۔ سنسکرت کے بعد وہ زبانیں آئیں جنہیں اس کی نئی شکلیں کہا جاسکتا ہے۔

جب سنسکرت زبان کے تلفظ قواعد اور نحوی ڈھانچے میں کافی حد تک تبدیلیاں رونما ہوگئیں تو یہ زبان بالکل بدل گئی۔ سنسکرت کی یہی بدلی ہوئی شکل پراکرت کہلائی۔ زبان میں تبدیلی کا یہ عمل لسانیات کی مختلف سطحوں پر دیکھا جاسکتا ہے کہ سنسکرت کے مصمتی خوشے (Consonant clusters) کا ایک مصمتہ (Consonant) ٹوٹ کر دوسرے مصمتے کے ساتھ مدغم ہوجاتا ہے۔ ذیل کی چند مثالوں سے زبان میں تبدیلی کا عمل واضح ہوجائے گا۔

سنسکرت الفاظ	پراکرت الفاظ	معنی
پُتّر	پُت	پوت
ہست	ہستھ	ہاتھ
شُشک	سکھ	سوکھا
دُگدھ	دُدّھ	دودھ
سرو	سوّ	سب
ادھ	اجّ	آج
سپّت	ستّ	سات
اگن	اگّ	آگ
پتر	پتّ	پات/پتّا

اس طرح کی بے شمار صوتی نیز قواعدی اور بعض نحوی تبدیلیاں سنسکرت زبان میں رونما ہوئیں جن کے نتیجے میں پراکرتوں کا ظہور عمل میں آیا۔ ان لسانی تبدیلیوں کے پس منظر میں اردو زبان کے ارتقا کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ہند آریائی کے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے

جسے وسطی ہندآریائی دور کہتے ہیں۔ یہ دور 500 ق م تا 1000 سنہ عیسوی یعنی پندرہ سو سال تک قائم رہتا ہے۔ جس طرح قدیم ہندآریائی دور میں سنسکرت زبان کا فروغ ہوا اسی طرح وسطی ہندآریائی دور میں پراکرتیں پھلی پھولیں اور پروان چڑھیں۔ اب ہم وسطی ہندآریائی کے تین ادوار پالی' پراکرت اور اپ بھرنش کے متعلق ضروری معلومات حاصل کریں گے۔

1.5.1 پالی (500 ق م تا مولود مسیح) 500 سال

پالی کو پہلی پراکرت یا ابتدائی پراکرت بھی کہا گیا ہے۔ پالی سنسکرت لفظ پنکتی سے ماخوذ ہے۔ لسانیات کے علما پالی کے معنی سطر' سیدھی لکیر' کتاب کی اصل عبارت' بودھ گرنتھوں کی سطر' بودھ دھرم شاستر کی سطر بناتے ہیں۔ لسانیات میں پالی کو وسط ہندآریائی کی اولین زبان مانا جاتا ہے۔ پہلی پراکرت میں پالی اور اشوکی پراکرت دونوں شکلیں شامل ہیں۔

1۔ پالی: سنسکرت میں جب صوتی اور صرفی تغیرات رونما ہوئے تو اس نے اولین پراکرت یعنی پالی کا روپ اختیار کیا۔ پالی بدھ مذہب کی زبان ہے۔ بدھ مذہب کے پیشوا مہاتما گوتم بدھ (وفات 477 ق م) پالی بولتے تھے۔ انہوں نے اسی زبان میں اپنے مذہب کی تبلیغ کی اور اپنے پیروؤں کو بھی اسی زبان میں بدھ مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی تلقین کی۔ جب گوتم بدھ نے اپنے خیالات کی تبلیغ شروع کی تو ان کے شاگردوں نے ان کو مشورہ دیا کہ یہ خیالات مہذب زبان یعنی سنسکرت میں قلم بند کر لیے جائیں تو اچھا ہے لیکن گوتم بدھ نے انکار کر دیا اور خواص کی زبان کے مقابلے میں اس علاقے کے عوام کی زبان کو اہمیت دی۔ وہ اس بات کو پسند کرتے تھے کہ ان کے اُپدیش سب لوگ اپنی اپنی زبان میں پڑھیں۔ چنانچہ بدھ مذہب کے عالموں نے اپنے مذہب کے عقائد اور اوراد لکھنے کے لیے اس عوامی زبان کو استعمال کیا۔ گوتم بدھ اور مہاویر جین دونوں نے اس پراکرت کی قدیم شکل کو اپنایا تھا۔ پالی بدھ بھکشوؤں کے ذریعے نہ صرف تکشلا (ہندوستان کے شمال مغربی خطے میں واقع ایک قدیم علمی مرکز) اور ہندوستان کے دیگر مقامات تک پہنچی بلکہ دور دراز علاقوں مثلاً سیلون (سری لنکا)' برما اور تھائی لینڈ کا بھی سفر کیا۔ بدھ مذہب کی تمام مستند تصانیف پالی زبان میں ہی پائی جاتی ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں مذہبی ستون کے ذریعے یہ زبان آج تک محفوظ رہ سکی ہے۔

2۔ اشوکی پراکرت: ابتدائی پراکرت کی دوسری شکل اشوک کے کتبوں کی زبان کی شکل میں ہم تک پہنچی ہے۔ اشوک کا زمانہ گوتم بدھ کی وفات کے تقریباً سوا دو سو سال بعد کا زمانہ (تقریباً 250 قبل مسیح) ہے۔ اشوک ایک بہت بڑی سلطنت کا مالک تھا۔ بنگال اور نیپال سے لے کر افغانستان تک کا علاقہ اس کے زیر تسلط تھا۔ ادھر گجرات اور مالوہ تک اس کی حکومت کا ڈنکا بجتا تھا۔ کلنگ (اڑیسہ) کی سلطنت کو بھی اس نے فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کر لیا تھا۔ کلنگ کی خونریز جنگ کے بعد اشوک نے بدھ مذہب اختیار کر لیا تھا۔

اشوک نے مہاتما بدھ کی تعلیمات' اپنے سیاسی اصولوں اور اپنی زندگی کے بعض اوقات کو پتھروں اور ستونوں پر کندہ کروا کر اپنی سلطنت کے طول وعرض میں نصب کروائے جنھیں اشوک کی لاٹ کہتے ہیں۔ مورخین کا خیال ہے کہ اشوک کی ان لاٹوں یا کتبوں کی تعداد کئی ہزار تھی جن میں صرف بیالیس کتبے ہی محفوظ رہ سکے ہیں۔ جو کتبے شہباز گڑھی (پشاور کے نزدیک)' مان سیرا (پنجاب) اور گرنار (گجرات) میں دریافت ہوئے ان میں مہاتما بدھ کی مذہبی تعلیمات پائی جاتی ہیں۔ ان میں اشوک کے سیاسی اصول بھی کندہ ہیں۔ جو کتبے میسور' ساسارام (بہار)' جبل پور' جے پور اور مدراس (چنائی) میں پائے گئے ہیں ان میں زیادہ تر اشوک کی زندگی کے واقعات درج ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ کتبے انبالہ' میرٹھ' چمپارن' سارناتھ اور گیا میں بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ کتبے انتہائی تاریخی اہمیت کے حامل ہیں لیکن ان کی لسانی اہمیت بھی کچھ کم نہیں۔ ان کتبوں سے یہ پتا چلتا ہے کہ وسطی ہندآریائی دور کے ابتدائی مراحل میں کس قسم کی زبان بولی جاتی تھی۔ چوں کہ یہ کتبے عام لوگوں کے لیے نصب کیے گئے تھے' اس لیے ان کی زبان عام بول چال کی زبان ہے جو سادہ اور آسان ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہر جگہ کے کتبوں کی زبان ایک جیسی نہیں' بلکہ زبان کا علاقائی فرق ان میں نمایاں ہے۔ اشوک کے کتبے تین

طرح کی علاقائی بولیوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔شمال مغربی بولی جس کی نمائندگی شہباز گڑھی اور مان سیرا کے کتبے کرتے ہیں' جنوب مغربی بولی جس کی نمائندگی گرنار اور کانسی میں پائے جانے والے کتبے کرتے ہیں اور پراچیہ بولی جس کی نمائندگی سارناتھ کے کتبوں سے ہوتی ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہندوستان میں لکھنے کا رواج باضابطہ طور پر اشوک کے زمانے سے ہی شروع ہوتا ہے ورنہ اس سے پہلے لوگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور مقدس کتابوں کو نسل درنسل زبانی منتقل کرتے تھے۔ اشوک کے کتبے دو طرح کے رسم خط میں ملتے ہیں جن کے نام ہیں کھروشٹی اور براہمی۔ کھروشٹی رسم خط دائیں جانب سے بائیں جانب کو لکھا جاتا تھا اور ہندوستان کے شمال مغرب میں رائج تھا جب کہ براہمی رسم خط بائیں سے دائیں جانب کو لکھا جاتا تھا اور ہندوستان کے ایک بڑے خطے میں یہی رسم خط رائج تھا۔

1.5.2 پراکرت مولود مسیح تا 500 عیسوی 500 سال

پراکرت کسی ایک زبان کا نام نہیں بلکہ ایک طرح کی بہت سی زبانوں کے زمرے کا نام ہے۔سنسکرتی تہذیب کو کہتے ہیں۔ پرکرتی فطرت کو کہتے ہیں۔سنسکرت مہذب زبان تھی اور پراکرتیں فطری یعنی غیر مرصع' عوامی زبان۔ یہ ایک عام بات ہے کہ جب زبانیں ترقی کر جاتی ہیں تو ان میں ادب بھی پیدا ہونے لگتا ہے چنانچہ پراکرت کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پراکرت جو کلیتًا ایک عام بول چال کی زبان تھی وہ مولود مسیح تا 500 عیسوی کے دوران ادبی بن گئی۔ بعضوں نے پراکرتوں کا زمانہ 100ء تا 600ء تک متعین کیا ہے۔ ان پراکرتوں کا استعمال ڈراموں میں بھی ہونے لگا۔ چنانچہ وسطی ہند آریائی کا دوسرا دور ادبی پراکرتوں کا دور کہلایا۔ ادبی پراکرتوں کی حسب ذیل پانچ قسمیں ہیں:

1۔ شورسینی پراکرت: شورسینی پراکرت شورسین کے علاقے کی زبان تھی جس کا مرکز متھرا (اتر پردیش) تھا۔ یہ اسی علاقے کی زبان تھی جو قدیم ہند آریائی دور میں مدھیہ دیشیہ کہلاتا تھا۔ اس وجہ سے یہ سنسکرت سے بہت زیادہ قریب تھی اور لسانی اعتبار سے اس سے گہرے طور پر متاثر تھی۔ سنسکرت ڈراموں میں بھی اس کا استعمال ہوتا تھا اور سنسکرت کے بعد اسے وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اردو زبان کا تاریخی رشتہ شورسینی پراکرت سے جا کر ملتا ہے۔

2۔ ماگدھی پراکرت: ماگدھی پراکرت بنیادی طور پر مگدھ کے علاقے کی زبان تھی جو اب جنوبی بہار کا حصہ ہے۔ یہ علاقہ قدیم ہند آریائی دور میں پراچیہ بولی کا تھا جو آریوں کے تہذیبی مرکز سے کافی دور جا پڑا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ماگدھی پراکرت کو غیر مہذب بولی تصور کیا جاتا تھا۔ ماگدھی پراکرت میں ''ز'' کی آواز مفقود تھی۔ یہاں کے لوگ ''ز'' کی آواز کو ''ل'' کی آواز سے بدل دیتے ہیں۔ مثلاً راجا کی جگہ لاجا' درڈر کی جگہ دَلِدَّ (موجودہ بول چال میں دَلِدَّ ر) بولتے تھے۔ ماگدھی پراکرت کی دوسری اہم صوتی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں سنسکرت کی تین آوازوں س' ش اور ش کی جگہ صرف ایک آواز ''ش'' پائی جاتی تھی۔ ماگدھی پراکرت کا استعمال سنسکرت کے ڈراموں کے نچلے طبقے کے کرداروں کی گفتگو میں بھی پایا جاتا ہے۔

3۔ اردھ ماگدھی پراکرت: اردھ ماگدھی پراکرت کا علاقہ شورسینی پراکرت اور ماگدھی پراکرت کے درمیان کا علاقہ تھا۔ یہ بہار اور الہٰ آباد کے بیچ کے علاقے کی زبان تھی اردھ ماگدھی پراکرت نے جین مذہب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ جین مذہب کی ابتدائی مذہبی ادبی تصانیف اسی پراکرت میں پائی جاتی ہیں۔ مہاویر جین نے جس زبان میں جین مذہب کی تعلیمات دیں وہ اردھ ماگدھی کی قدیم شکل تھی۔ اردھ ماگدھی پراکرت کا استعمال سنسکرت ڈراموں میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہ ایک ترقی یافتہ اور مہذب زبان تھی۔ اس دور کے شاہی گھرانوں میں بھی یہی زبان بولی جاتی تھی۔ اردھ ماگدھی میں ''ز'' اور ''ل'' دونوں آوازیں پائی جاتی تھیں لیکن سنسکرت کا ش اور ش' س کی آواز میں تبدیل ہو جاتا تھا۔

4۔ مہاراشٹری پراکرت: مہاراشٹر کی زبان تھی اور تمام ادبی پراکرتوں میں یہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ ادبی پراکرت تھی۔ قواعد نویسوں نے اسے مثالی پراکرت کہا ہے۔ ان کی توجہ کا مرکز یہی پراکرت تھی۔ انہوں نے اس کا مطالعہ کافی تفصیل سے کیا ہے۔ سنسکرت ڈراموں میں پراکرت کے نثری اجزا اسی پراکرت کے پائے جاتے ہیں۔ اس دور کی بیشتر تصانیف مہاراشٹری پراکرت میں ہی ملتی ہیں۔ اس کا استعمال موسیقی میں بھی کیا جاتا تھا۔

5۔ پشاچی پراکرت: پشاچی پراکرت پنجاب اور کشمیر میں بولی جاتی تھی۔ اس میں ادبی تصانیف کا فقدان ہے۔ پشاچی پراکرت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ خالص ہند آریائی زبان نہیں ہے' کیوں کہ اس میں ایرانی زبانوں کے بعض اثرات نفوذ کر گئے ہیں۔

1.5.3 اپ بھرنش 500ء تا 1000 عیسوی 500 سال

ادبی پراکرتوں کے بعد اپ بھرنشوں کا ارتقا عمل میں آتا ہے۔ یہ پراکرت کے ارتقا کی تیسری اور آخری شکلیں ہیں۔ اس لیے انہیں تیسری پراکرت بھی کہتے ہیں۔ اپ بھرنشوں کا ارتقا 500ء سے لے کر 1000ء تک ہوتا ہے۔ بعضوں نے اپ بھرنشوں کا زمانہ 600ء تا 1000ء طے کیا ہے۔ یہ وسطی ہند آریائی دور کا آخری مرحلہ ہے۔ اپ بھرنشوں کے خاتمے کے بعد وسطی ہند آریائی دور کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے اور 1000ء سے جدید ہند آریائی دور شروع ہوتا ہے اور جدید زبانیں وجود میں آتی ہیں۔

اپ بھرنش کے لغوی معنی بگڑی ہوئی بھرشٹ زبان ہے۔ جب دوسری پراکرتیں ادبی بن گئیں تو ان کا ارتقا مختلف نہج پر ہونے لگا اور عوام سے ان کا رشتہ ختم ہو گیا۔ چنانچہ یہ عوام سے الگ تھلگ ہو گئیں۔ عوامی زبان دوسری ڈگر پر ارتقا پانے لگی۔ عوام نے پراکرت کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر اور ان کی شکلیں بگاڑ کر بولنا شروع کر دیا۔ یہی ٹوٹی پھوٹی (Broken) اور بگڑی ہوئی (Corrupt) زبان اپ بھرنش کہلائی۔ اس طرح کی لسانی تبدیلی دبے پاؤں اور فطری طور پر واقع ہوئی۔ جس طرح لسانی تبدیلی کے عمل سے سنسکرت سے پراکرت پیدا ہوئی' اسی طرح پراکرت میں تبدیلی کے نتیجے میں اپ بھرنش ظہور پذیر ہوئیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ پراکرت کی نئی شکل یا بگڑی ہوئی شکل اپ بھرنش کہلائی لیکن ماہرین لسانیات اپ بھرنش کو پراکرت کی ہی ایک شکل تسلیم کرتے ہیں اور اسے تیسری پراکرت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

یوں تو اپ بھرنش کے نمونے تیسری صدی عیسوی کے دوران تصنیف شدہ سنسکرت ڈراموں میں دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن اسے باقاعدہ زبان کی حیثیت چھٹی صدی عیسوی میں حاصل ہوئی۔ جب یہ ایک ترقی یافتہ زبان بن گئی تو اس کا استعمال ادبی مقاصد کے لیے بھی ہونے لگا۔ اپ بھرنش میں ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ 1000ء کے بعد بھی جاری رہا لیکن بول چال کی زبان کی حیثیت سے اس کا ارتقا 1000ء تک پہنچتے پہنچتے رک گیا اور اپ بھرنشوں کی جگہ جدید بولیاں اور ان بولیوں سے جدید زبانیں ارتقا پانے لگیں۔

اپ بھرنش ایک وسیع زبان تھی۔ یہ پنجاب تا راجستھان اور راجستھان سے لے کر بنگال تک کے وسیع علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اپ بھرنش کا ادب جو آج دستیاب ہے بے شمار مقامات پر تخلیق کیا گیا جیسے راجستھان' گجرات' شمال مغربی ہندوستان' بندیل کھنڈ اور بنگال وغیرہ۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دسویں صدی عیسوی کے اختتام تک اپ بھرنشیں پورے شمالی ہندوستان میں پھیل چکی تھیں۔

اپ بھرنش پراکرت سے پیدا ہوئی' اس لیے جہاں جہاں پراکرتیں بولی جاتی تھیں انھیں علاقوں میں اپ بھرنش وجود میں آ گئیں۔ مارکنڈے (قواعد نویس) نے اپ بھرنش کی تین قسمیں بیان کی ہیں یعنی ناگر' اب ناگر اور براچڈ۔ لیکن بیشتر عالموں نے اپ بھرنش کی مندرجہ ذیل پانچ قسمیں بتائی ہیں۔

1۔ شورسینی اپ بھرنش: یہ شورسینی پراکرت سے نکلی ہے۔ اس کا علاقہ وہی ہے جو شورسینی پراکرت کا علاقہ تھا۔ اس کے بطن سے کھڑی بولی (اردو اور ہندی)' راجستھانی' پنجابی (مشرقی) اور گجراتی زبانیں پیدا ہوئیں۔ کھڑی بولی کا تعلق مغربی ہندی سے ہے۔ اس سے اردو اور ہندی

زبانیں ارتقا پاتی ہیں۔مغربی ہندی کی دوسری بولیوں مثلاً ہریانوی' برج بھاشا' بندیلی اور قنوجی کا ارتقا بھی شورسینی اپ بھرنش سے ہوا۔

2۔ ماگدھی اپ بھرنش: اس کا ارتقا ماگدھی پراکرت سے ہوا۔اس کا چلن مشرق کے ایک وسیع علاقے میں تھا جس میں بنگال' آسام' اڑیسہ اور بہار شامل ہیں۔ان علاقوں کی جدید زبانیں یعنی بنگالی' آسامی' اڑیا اور بہار کی تقریباً تمام بولیاں ماگدھی اپ بھرنش سے نکلی ہیں۔مغربی ماگدھی اپ بھرنش کی بولیوں کو جارج گریرسن (ماہرلسانیات) بہاری کے نام سے یاد کرتا ہے جس میں تین بولیاں میتھلی' مگہی اور بھوجپوری شامل ہیں۔

3۔ اردھ ماگدھی اپ بھرنش: اردھ ماگدھی اپ بھرنش شورسینی اپ بھرنش اور ماگدھی اپ بھرنش کے درمیان کے علاقے کی زبان تھی۔اس سے مشرقی ہندی کی بولیاں وجود میں آئیں جن میں اودھی' بگھیلی اور چھتیس گڑھی شامل ہیں۔

4۔ مہاراشٹری اپ بھرنش: اس کا ارتقا مہاراشٹری پراکرت سے ہوا۔یہ مہاراشٹر کے علاقے کی زبان تھی۔اس کے بطن سے موجودہ مراٹھی کا ارتقا ہوا۔

5۔ شمال مغربی اپ بھرنش: یہ دو زمروں میں منقسم ہے (الف) براچڈاپ بھرنش جس کا ارتقا سندھ کے علاقے میں ہوا اور اس سے سندھی زبان پیدا ہوئی (ب) کیکئی اپ بھرنش جس سے مغربی پنجابی پیدا ہوئی۔اسے لہندا بھی کہتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ وسطی ہندآریائی کے کتنے ادوار ہیں؟

2۔ پالی اور اشوکی پراکرت پر روشنی ڈالیے۔

3۔ گوتم بدھ اور مہاویر جین کی مذہبی تعلیمات کس زبان میں پیش کئیں؟

4۔ اپ بھرنش کسے کہتے ہیں۔اس کی اقسام بیان کیجیے۔

1.6 جدید ہندآریائی دور 1000ء تا حال

1.6.1 جدید ہندآریائی زبانیں

لسانیات کا یہ اٹل اصول ہے کہ بول چال کی زبان جتنی تیزی سے بدلتی ہے' ادب کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔چنانچہ جب پراکرتوں نے ادبی شکل اختیار کرنا شروع کی تو وہ عوام کی ڈگر سے پرے (دور) جا پڑیں اور عوام کی زبان کا دھارا آگے بڑھتا رہا۔اسی بولی کی زبانوں کو اس عہد کے قواعد نویسوں نے اپ بھرنش (بگڑی زبان) کہا ہے۔تاریخ لسانیات کی یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ لوگ ہمیشہ زبان کے سنورنے کو اس کے بگڑنے سے تعبیر کرتے چلے آئے ہیں۔ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے طلوع کی تاریخ 1000ء مقرر کی گئی ہے لیکن اپ بھرنش میں تصنیفات کا سلسلہ چھٹی سے لے کر چودھویں بلکہ پندرھویں صدی عیسوی تک ملتا ہے۔اپ بھرنش کو ملک کی زندہ زبان پاکر بالاخر تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس کی طرف متوجہ ہوا۔رفتہ رفتہ یہ اپ بھرنش بھی ادبی زبان بن کر محدود ہوگئی تو ہندوستان کی جدید زبانوں نے اس کی گدی چھیننا شروع کی۔1000ء میں یہ بہت کچھ جدید زبانوں کی قدیم شکلوں سے ملتی جلتی ہے یعنی 1000ء کے لگ بھگ اپ بھرنش ہی کے اندر جدید آریائی زبانوں کے روپ جھلکنے لگے تھے۔اس طرح ہندوستان کی جدید زبانوں کی پیدائش اپ بھرنشوں سے ہوتی ہے اور جدید ہندآریائی دور کا آغاز 1000ء سے ہوتا ہے۔

1.6.2 جدید ہندآریائی زبانوں کی گروہ بندی

جدید ہندآریائی زبانیں اور بولیاں مختلف علاقوں کی اپ بھرنشوں سے پیدا ہوئی ہیں۔اس لیے ان میں علاقائی لسانی خصوصیات موجود ہیں۔جدید ہندآریائی زبانوں کو ان کی خصوصیات کی بنیاد پر ماہرلسانیات جارج گریرسن نے کئی گروہوں میں تقسیم کیا ہے' جو اس طرح ہیں۔

1۔ بیرونی زبانیں:

لہندا (مغربی پنجابی)، سندھی، مراٹھی، آسامی، بنگالی، اڑیا، بہاری بولیاں (میتھلی، مگہی، بھوج پوری)۔

2۔ وسطی زبانیں:

مشرقی ہندی (اودھی، بگھیلی، چھتیس گڑھی)۔

3۔ اندرونی زبانیں:

مغربی ہندی (کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی، قنوجی)، پنجابی (مشرقی)، گجراتی، راجستھانی (مارواڑی/ میواڑی، مالوی، جے پوری، میواتی)، بھیلی، خاندیشی۔

4۔ پہاڑی بولیاں:

نیپالی/ گورکھالی، کمایونی/ گڑھوالی، شملہ اور اس کے اطراف کے پہاڑی علاقوں کی بولیاں۔

گریرسن نے جدید ہند آریائی زبانوں اور بولیوں کی گروہ بندی کے لیے کئی دلائل دیے ہیں جن سے کئی ماہرین لسانیات نے اختلاف کیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اپ بھرنشوں کے بعد جدید ہند آریائی زبانوں کا ہندوستان کے مختلف خطوں اور علاقوں میں فروغ ہوا۔ ان زبانوں میں ایک زبان اردو بھی ہے جو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے۔

1.6.3 جدید ہند آریائی اور اردو

جدید ہند آریائی دور کا آغاز 1000ء سے ہوتا ہے جب اپ بھرنشوں کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور ان کی جگہ پورے شمالی ہندوستان میں بھانت بھانت کی بولیاں سر اٹھانے لگتی ہیں۔ دراصل یہ زمانہ صرف لسانی تبدیلیوں کا ہی نہیں تھا بلکہ ہندوستان میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطح پر بھی تیزی کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں۔ ان تبدیلیوں کا یہاں کی بولیوں پر بھی اثر پڑنا لازمی تھا۔ 1000ء کے آس پاس کا ایک اہم واقعہ مسلمانوں کی شمالی ہندوستان میں آمد ہے، جن میں ترک، افغان اور ایرانی شامل تھے۔ ان لوگوں نے نہ صرف یہاں سکونت اختیار کی بلکہ ان میں کچھ لوگوں نے یہاں کی حکومت کی باگ ڈور بھی سنبھالی۔ پہلے ان کا تسلط پنجاب پر قائم ہوا۔ پھر یہ لوگ آگے بڑھتے ہوئے دہلی تک پہنچ گئے اور 1193ء میں دہلی کو فتح کر کے وہاں اپنی باقاعدہ حکومت قائم کرلی۔ جب دہلی پایۂ تخت بن گیا تو دھیرے دھیرے اس شہر کو اہمیت اور مرکزی حیثیت حاصل ہوتی گئی۔ اور یہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا تہذیبی، تمدنی اور سیاسی مرکز بن گیا۔ یہاں فوج بھی رہنے لگی اور دور دراز کے علاقوں سے بھی لوگ یہاں آنے اور بسنے لگے۔ فوج میں بھی جگہ جگہ کے لوگ بھرتی ہونے لگے۔

شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کی وجہ سے یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں میل جول پیدا ہوا۔ اس باہمی میل جول اور اختلاط کی وجہ سے یہاں ایک نئی تہذیب پروان چڑھنے لگی اور ایک نئی زبان کا خمیر تیار ہونے لگا۔ مسلمانوں کی زبان ترکی اور فارسی تھی۔ عربی ان کی مذہبی زبان تھی۔ جو مسلمان پنجاب سے آئے تھے ان کی زبان قدیم پنجابی تھی۔ ان تمام زبانوں کا شمالی ہند کی بولیوں پر گہرا اثر پڑا اور بہت تیزی کے ساتھ یہاں کی مقامی بولیوں میں عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ داخل ہونے لگے۔ دوسری طرف 1000ء کے آس پاس اپ بھرنشوں میں بھی فطری طور پر تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔ شورسینی اپ بھرنش بھی تیزی کے ساتھ اپنا چولا بدل کر نئے روپ اختیار کرنے لگی۔ اسی سے اردو کا خمیر تیار ہوا۔

1.6.4 اردو کا ہند آریائی پس منظر

اردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے جس کی داغ بیل ہندوستان کی دوسری جدید ہند آریائی زبانوں کی طرح 1000 کے بعد پڑتی ہے اور

مغربی ہندی کی ایک بولی ''کھڑی بولی'' اس کا ماخذ بنتی ہے۔مغربی ہندی شورسینی اپ بھرنش کے بطن سے پیدا ہوئی تھی اور شورسینی اپ بھرنش شورسینی پراکرت سے نکلی تھی اور دیگر پراکرتوں کی طرح شورسینی پراکرت کی پیدائش بھی سنسکرت سے ہوئی تھی۔اس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو کا لسانی خاندانی سلسلہ سنسکرت سے جا کر مل جاتا ہے۔کیوں کہ جدید ہند آریائی جس میں اردو بھی شامل ہے قدیم ہندوستان کی اس زبان کا تسلسل ہے جسے سنسکرت کہتے ہیں۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو زبان کی ایک مربوط لسانی تاریخ ہے اور اس کا ہند آریائی پس منظر ساڑھے تین ہزار سال کے عرصے پر محیط ہے۔

1.6.5 اردو کی لسانی ساخت' ڈھانچے اور کینڈے پر ہند آریائی عناصر کے نقوش

اردو کی لسانی ساخت' ڈھانچے اور کینڈے پر ہند آریائی عناصر کے نقوش بالکل صاف نظر آتے ہیں۔ یہ عناصر ہمیں اس ہند آریائی تہذیب کی یاد دلاتے ہیں جو آریوں کے داخلۂ ہند کے بعد سے یہاں پنپنا شروع ہوئی۔ یہ اسی تہذیب کا نتیجہ ہے کہ اردو کی بیشتر لسانیاتی خصوصیات کا سلسلہ اپ بھرنش اور پراکرت سے ہوتا ہوا سنسکرت سے جا کر مل جاتا ہے۔

1۔ صوتی ڈھانچہ : اردو میں 48 صوتیے Phonemes پائے جاتے ہیں۔صوتیے کسی زبان کی وہ ممیّز آوازیں (Distinctive Sound Units) ہوتی ہیں جن کی تبدیلی سے معنی میں تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے مثلاً پانی اور بانی۔ان میں ''پ'' اور ''ب'' کی تبدیلی سے معنی میں تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے۔لہذا یہ دونوں ''پ'' اور ''ب'' دو صوتیے یعنی دو ممیّز آوازیں قرار دی جائیں گی۔

اردو مصمتے (Consonants) ہیں۔مصمتوں کی ایک بڑی تعداد سنسکرت اور پراکرت سے اردو میں داخل ہوئی۔ 15 ہائیہ آوازیں (Aspirates) ہند آریائی ماخذ مثلاً سنسکرت' پراکرت اور اپ بھرنش سے اردو میں آئی ہیں۔ یہ ہائیہ آوازیں ہیں پھ' بھ' تھ' ڈھ' چھ' جھ' کھ' گھ: ڑھ' مھ' نھ' لھ' رھ۔خالص عربی و فارسی مصمتے اردو میں چھ ہیں یعنی ق' ف' ز' ژ' خ اور غ۔

اردو مصوتے (Vowels) دس ہیں۔ان دس مصوتوں میں دو دوہرے مصوتے (Diphthongs) بھی شامل ہیں۔ اردو کے تمام مصوتے پراکرت اور اس کے توسط سے سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔

اردو کی معکوسی آوازیں اور معکوسی صوتیے : اردو کی معکوسی آوازیں چھ ہیں جیسے ٹ' ڈ' ڑ (غیر ہائیہ) اور ٹھ' ڈھ' ڑھ (ہائیہ)۔ یہ آوازیں بھی ہند آریائی ماخذ سے اردو میں داخل ہوئی ہیں۔ان کے بغیر زبان توتلی ہوکر رہ جائے گی۔

ہند آریائی' عربی اور فارسی کی مشترک آوازیں: اردو میں (14) ایسی آوازیں بھی پائی جاتی ہیں جو ہند آریائی' عربی اور فارسی میں مشترک ہیں یعنی اردو میں ان کا ارتقا ہند آریائی ماخذ سے بھی ہوا ہے اور عربی و فارسی سے بھی۔لیکن اردو میں ان آوازوں پر مشتمل عربی و فارسی الفاظ کی تعداد' ان آوازوں سے تشکیل شدہ ہند آریائی الفاظ کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ یہ آوازیں ہیں: ب' ت' و' ج' ک' م' ن' ل' ر' س' ش' ہ' و' ی۔

ہند آریائی اور فارسی کی مشترک آوازیں : اردو میں ہند آریائی کی تین آوازیں اور بھی ہیں جو فارسی میں بھی پائی جاتی ہیں یعنی پ' چ اور گ۔ لیکن ان آوازوں سے بننے والے ہند آریائی الفاظ کی تعداد بھی اردو میں ان آوازوں پر مشتمل فارسی الفاظ کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔

2۔ اردو کا ذخیرۂ الفاظ : اصوات کے علاوہ اردو کے ذخیرۂ الفاظ کا ایک بڑا حصہ بھی ہند آریائی ماخذ پر مشتمل ہے جن میں سب سے زیادہ تعداد تدبھو الفاظ کی ہے۔سنسکرت کے الفاظ جب اپنی بدلی ہوئی حالت میں استعمال ہوتے ہیں تو ''تدبھو'' کہلاتے ہیں۔ تدبھو الفاظ کی بنیاد اگرچہ سنسکرت یا قدیم ہند آریائی پر قائم ہے لیکن وسطی ہند آریائی یعنی پراکرت میں پہنچ کر ان کی شکل وصورت اور روپ میں تبدیلی پیدا ہوگئی۔ سنسکرت کے یہی بدلے ہوئے الفاظ تدبھو کہلاتے ہیں۔سنسکرت کے الفاظ جب بغیر کسی تبدیلی یا ردو بدل کے اپنی اصلی حالت میں استعمال ہوتے ہیں تو 'تت سم'' کہلاتے ہیں مثلاً لفظ دگدھ خالص سنسکرت لفظ ہے جو تتسم کہلاتا ہے۔لیکن پراکرت کے لفظ ددّھ کو جو دگدھ سے ماخوذ

ہے اور اسی کی بدلی ہوئی شکل ہے' تد بھو کہیں گے۔ جدید ہند آریائی اردو میں یہی لفظ دودھ بن گیا جو تد بھو کی ایک دوسری شکل ہے۔ اردو میں تت سم الفاظ بہت ہی کم ہیں۔ اردو کے ذخیرۂ الفاظ کا بیشتر حصہ تد بھو الفاظ پر مشتمل ہے۔ ہندوستانی یا ہند آریائی الفاظ اردو کے لیے ناگزیر ہیں۔ اردو کا کوئی بھی جملہ ہند آریائی الفاظ کے بغیر تشکیل نہیں دیا جاسکتا ہے جب کہ ایسے بے شمار اردو جملے ترتیب دیے جاسکتے ہیں جن میں کوئی بھی عربی یا فارسی لفظ نہ آیا ہو۔ مثلاً ذیل کے جملے خالص ہند آریائی الفاظ پر مشتمل ہیں:

(1) وہ ایک اچھا لڑکا ہے

(2) میں کل اپنے گھر جاؤں گا

(3) آج تم سے ملنے یہاں کون آیا تھا؟

''رانی کیتکی کی کہانی'' (انشاء اللہ خاں انشا) اور ''سریلی بانسری'' (آرزو لکھنوی) اردو نثر و نظم کی دو ایسی کتابیں ہیں جن میں ایک بھی عربی یا فارسی لفظ استعمال نہیں ہوا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو کا بنیادی ذخیرۂ الفاظ ہند آریائی ہے۔ اس کے علاوہ قرابت داری کے الفاظ' اعداد' فعلی مادّے' ضمائر' حرف جار بھی ہند آریائی ماخذ سے ہی اردو میں داخل ہوئے ہیں جن کی حیثیت بھی بنیادی ذخیرۂ الفاظ کی ہے۔ مثالیں پیش ہیں۔

قرابت داری کے الفاظ: ماں' باپ' بھائی' بہن' بیٹا' بیٹی' نانا' نانی' دادا' دادی' چچا' تایا وغیرہ۔

اعداد: مثلاً ایک' دو' تین' چار' پانچ' چھ' سات' آٹھ' نو' دس' بیس' سو وغیرہ۔

فعلی مادے: مثلاً آ' جا' کھا' پی' چل' سن' دیکھ وغیرہ۔

ضمائر: مثلاً وہ' تم' ہم' تو آپ وغیرہ۔

حرف جار: مثلاً کو' پر' تک' سے' میں وغیرہ۔

ان کے علاوہ اردو کے کئی مفرد الفاظ' مرکب الفاظ' مرکب افعال' محاورے' ضرب الامثال' روزمرہ ایسے ہیں جن کی بنیاد ہند آریائی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ جدید ہند آریائی زبانوں کا آغاز کس طرح ہوا؟

2۔ جدید ہند آریائی زبانیں کون سی ہیں؟

3۔ اردو کا لسانی خاندانی سلسلہ کس سے جا ملتا ہے؟

4۔ اردو کی لسانی ساخت' ڈھانچے اور کینڈے پر اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

1.7 خلاصہ

ہندوستان اپنے قدرتی مناظر' زرخیزی اور تہذیب کی وجہ سے باہر کے لوگوں کی آماجگاہ بنتا رہا ہے۔ دنیا کے دور دراز علاقوں سے لوگ یہاں آکر بستے رہے ہیں۔ ہندوستان کے قدیم باشندوں میں کئی قبائل کے نام ملتے ہیں جن میں پہلا قبیلہ نگریٹو تھا جو آفریقہ سے آکر ہندوستان میں بس گیا تھا۔ اس کے کچھ نشانات جزائر انڈمان میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد پروٹو آسٹرلوائیڈ فلسطین سے آکر بس گئے تھے۔ آسٹرک لوگ بحیرۂ روم کے علاقے سے آئے اور شمالی ہند کے بعض حصوں میں بس گئے تھے۔ دراوڑی لوگ بحیرۂ روم اور ایشیائے کوچک کے باشندے تھے۔ یہ لوگ کافی عرصہ عراق میں رہے پھر بلوچستان سے ہوتے ہوئے ہندوستان آئے۔ تقریباً ساڑھے تین ہزار قبل مسیح میں انہوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا۔ یہ لوگ پنجاب اور سندھ کے علاقے ہڑپا اور موہنجوداڑو میں آباد ہو گئے۔ ان کے دو چار گروہ کنڑی' تلگو' تامل اور ملیالم زبانیں بولتے ہیں۔ ہندوستان کی تہذیب و تمدن کی بنیاد دراوڑیوں

ہی نے رکھی۔انہوں نے زراعت' صنعت وحرفت اور بیرونی ملکوں سے تجارت کو ترقی دی۔آب رسانی کے لیے دریاؤں پر پشتے باندھے' شہر تعمیر کیے۔سوتی اور اونی کپڑوں کی بنائی اور رنگائی' سونے چاندی کے جڑاؤ زیور بنانا ان کی خاص صنعتیں تھیں۔آریا قوم 1500 قبل مسیح میں وسط ایشیا سے روانہ ہوئے' ایران اور افغانستان میں کچھ عرصہ قیام کرتے ہوئے ہندوستان آئے اور پھر اسے اپنا وطن بنالیا۔آریاؤں کے بعد منگول آئے اور ہمالیہ کے دامن میں بس گئے۔ان کے علاوہ یونانی' شاک' ہن' عرب' ایرانی' ترک' پرتگیزی' ڈچ اور دیگر یوروپی اقوام بھی ہندوستان آئیں۔

آریاؤں کا اصل وطن وسط ایشیا کا ایک خشک پہاڑی علاقہ تھا۔انھیں زرخیز زمین اور اپنے جانوروں کے لیے گھاس کے میدانوں کی تلاش میں اپنے وطن کو چھوڑنا پڑا۔1500ء قبل مسیح میں آریا ہندوستان آئے۔آریا پہلے سندھ میں داخل ہوئے اور وہاں سے پنجاب میں پھیل گئے پھر مشرقی ہندوستان میں آباد ہونا شروع ہوئے۔آریا رفتہ رفتہ مختلف جتھوں کی شکل میں آتے رہے۔انہوں نے مقامی باشندوں کو ان کے علاقوں سے نکال کر جنوبی ہند میں دھکیل دیا اور خود شمالی ہندوستان کے اکثر حصوں پر قابض ہوگئے۔آریاؤں نے دراوڑی تہذیب سے بہت کچھ سیکھا۔انہوں نے بہت کچھ دیا بھی ہے۔آریا اپنے ساتھ اپنی تہذیب' اپنی زبان اور اپنے عقائد لائے۔یہ کھیتی باڑی کی معلومات بھی رکھتے تھے۔ہندوستان کو آریاؤں کی سب سے بڑی دین زبان تھی۔ قدیم آریائی تہذیب کی ایک اور بڑی دین براہمی رسم الخط ہے جس کا ارتقا ہندوستان میں ہوا اور جو ہندوستان کی تمام زبانوں کی لکھاوٹوں (سوائے اردو) کا ماخذ ہے۔آریاؤں کے آنے کے بعد ذات پات کا نظام شروع ہوا اور اسی کے ساتھ مختلف ذاتوں کی زبانوں کے درمیان فرق ہوگیا۔سنسکرت اونچے طبقے کی تہذیب یافتہ زبان ہوگئی اور مختلف پراکرتیں جو اس دور میں رائج رہیں' عوام کی فطری بولیاں بنی رہیں۔

ہند آریائی کے تین ادوار ہیں۔قدیم آریائی دور 1500 ق م تا 500 ق م تک رہا۔اس میں ویدک سنسکرت کا دور 1500 ق م تا 1000 ق م اور کلاسیکل سنسکرت 1000 کا دور ق م تا 500 ق م تک ہے۔وسطی ہند آریائی دور 500 ق م تا 1000ء پر محیط ہے جس میں پالی کا دور 500 ق م تا مولود مسیح تک' پراکرت کا دور مولود مسیح تا 500ء اور اپ بھرنش کا دور 500ء تا 1000ء تک ہے۔جدید ہند آریائی دور 1000 عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔ویدک سنسکرت میں رگ وید' سام وید' یجر وید' اتھروید' قدیم اپنشد اور دسوتر یا منتر گرنتھ تصنیف کی گئیں۔کلاسیکل سنسکرت میں رامائن مہابھارت کی تخلیق عمل میں آئی۔قدیم ہند آریائی دور میں سنسکرت زبان کا ارتقا اور فروغ عمل میں آیا۔مقامی بولیوں کے اختلاط کی وجہ سے اس کی تین علاقائی شکلیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔اُدیچیہ شمال مغربی خطے میں رائج تھی' پراچیہ کا چلن مشرق میں تھا اور ان دونوں کے درمیانی علاقے کی بولی مدھیہ دیشہ کہلاتی تھی۔قدیم ہند آریائی دور کے اختتام پر سنسکرت کا جید عالم پانی نے سنسکرت کی منظوم قواعد ایشٹا دھیائی لکھی۔پانی کے بعد پتنجلی نے مہا بھاشیہ لکھی جس میں پانی کے قواعد کی تشریح اور توضیح کی گئی۔شستہ زبان ہونے کی وجہ سے ادبی تصنیفات سنسکرت میں ہونے لگی تھیں۔

سنسکرت میں صوتی اور صرفی تغیرات پیدا ہوئے۔اس کے تلفظ' قواعد اور نحوی ڈھانچے میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔سنسکرت کی یہی بدلی ہوئی شکل پراکرت کہلائی۔پراکرت دراصل ایسی زبان تھی جو سنسکرت میں تبدیلی کے نتیجے میں فطری طور پر ظہور پذیر ہوئی تھی۔پراکرت کوئی علاحدہ زبان نہیں تھی بلکہ سنسکرت کی ہی بدلی ہوئی شکل تھی۔یہ سادہ اور آسان زبان تھی۔اسے عوام میں بہت جلد مقبولیت حاصل ہوگئی۔پراکرتوں کو پہلی' دوسری اور تیسری پراکرت میں تقسیم کیا گیا ہے۔ 500 ق م تا مولود مسیح کی زبان پالی کو پہلی پراکرت بھی کہا گیا ہے۔گوتم بدھ پالی بولتے تھے۔انہوں نے بدھ مت کی تبلیغ اسی زبان میں کی اور اپنے پیروؤں کو بھی اسی زبان میں بدھ مذہب کی تبلیغ واشاعت کی تلقین کی۔بدھ مت کی تمام مستند تصانیف پالی میں ہی پائی جاتی ہیں۔پالی کی ایک دوسری شکل اشوک کے کتبوں کی زبان کی شکل میں ہم تک پہنچی ہے۔اشوک کا زمانہ گوتم بدھ کی وفات کے تقریباً سوا دو سو سال بعد کا زمانہ (تقریباً 250 ق م) ہے۔اشوک نے مہاتما بدھ کی تعلیمات اور اپنے سیاسی اصولوں اور اپنی زندگی کے بعض واقعات کو پتھروں اور ستونوں پر کندہ کروا کر اپنی سلطنت کے طول وعرض میں نصب کروائے جنھیں اشوک کی لاٹ کہتے ہیں۔یہ عام لوگوں کے لیے نصب کروائے گئے تھے اس لیے ان کی زبان عام

بول چال کی زبان ہے جو آسان اور سادہ ہے۔ ہر جگہ کتبوں کی زبان ایک جیسی نہیں' بلکہ زبان کا علاقائی فرق ان میں نمایاں ہے۔ ادبی پراکرتوں کو دوسری پراکرت بھی کہا گیا۔ اس کا زمانہ مولود مسیح تا 500ء اور بعضوں کے مطابق 100ء تا 600ء بتایا گیا ہے۔ اس کا استعمال ڈراموں میں بھی ہونے لگا۔ ادبی پراکرتوں کی پانچ قسمیں ہیں شورسینی پراکرت' ماگدھی پراکرت' اردھ ماگدھی پراکرت' مہاراشٹری پراکرت اور پشاچی پراکرت۔

ادبی پراکرتوں کے بعد اپ بھرنشوں کا ارتقا عمل میں آتا ہے۔ یہ پراکرت کے ارتقا کی تیسری اور آخری شکلیں ہیں اس لیے انہیں تیسری پراکرت بھی کہتے ہیں۔ اپ بھرنشوں کا دور 500ء تا 1000ء اور بعضوں کے مطابق اس کا زمانہ 600ء تا 1000ء ہے۔ یہ وسطی ہند آریائی دور کا آخری مرحلہ ہے۔ اپ بھرنش کے لغوی معنی بگڑی ہوئی' بھرشٹ زبان کے ہیں۔ جب دوسری پراکرتیں ادبی بن گئیں تو ان کا ارتقا مختلف نہج پر ہونے لگا اور عوام سے ان کا رشتہ ختم ہوگیا۔ عوام نے پراکرت کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر اور ان کی شکلیں بگاڑ کر بولنا شروع کیا۔ یہی بگڑی ہوئی زبان اپ بھرنش کہلائی۔ اپ بھرنش پراکرت سے پیدا ہوئی' اس لیے جہاں جہاں پراکرتیں بولی جاتی تھیں انہیں علاقوں میں اپ بھرنش وجود میں آگئیں۔ اپ بھرنش کی پانچ قسمیں ہیں شورسینی اپ بھرنش' ماگدھی اپ بھرنش' اردھ ماگدھی اپ بھرنش' مہاراشٹری اپ بھرنش اور شمال مغربی اپ بھرنش۔

جدید ہند آریائی دور کی ابتداء 1000ء سے ہوتی ہے۔ اپ بھرنش میں ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ 1000ء کے بعد بھی جاری رہا۔ بول چال کی زبان کی حیثیت سے اس کا ارتقاء 1000ء تک پہنچتے پہنچتے رک گیا۔ رفتہ رفتہ اپ بھرنش بھی ادبی زبان بن کر محدود ہوگئی۔ اپ بھرنش کی جگہ جدید بولیاں اور ان بولیوں سے جدید زبانیں ارتقاء پانے لگیں۔ لسانیاتی اعتبار سے مغربی ہندی کا تعلق براہ راست شورسینی اپ بھرنش سے ہے جو اس عہد کی بولیوں میں ممتاز ادبی حیثیت کی مالک تھی' اور جس نے سب سے زیادہ سنسکرت کے اثر کو قبول کیا تھا۔ اردو جو ایک جدید آریائی زبان ہے' براہ راست کھڑی بولی سے تعلق رکھتی ہے کیوں کہ یہ کھڑی بولی کا ہی نکھرا ہوا روپ ہے اور اسی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

اردو کی داغ بیل ہندوستان کی دوسری جدید ہند آریائی زبانوں کی طرح 1000ء کے بعد پڑتی ہے اور مغربی ہندی کی ایک بولی ''کھڑی بولی'' اس کا ماخذ بنتی ہے۔ مغربی ہندی' شورسینی اپ بھرنش کے بطن سے پیدا ہوئی تھی اور شورسینی اپ بھرنش' شورسینی پراکرت سے نکلی تھی اور دیگر پراکرتوں کی طرح شورسینی پراکرت کی پیدائش بھی سنسکرت سے ہوئی تھی۔ اس طرح اردو کا لسانی سلسلہ سنسکرت سے جا کر ملتا ہے۔ اردو زبان کی ایک مربوط لسانی تاریخ ہے اور اس کا ہند آریائی پس منظر ساڑھے تین ہزار سال کے عرصے پر محیط ہے۔

1.8 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

1۔ ہندوستان کے قدیم باشندوں کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

2۔ ہندوستان میں آریاؤں کی آمد اور اس کے بعد کے حالات پر روشنی ڈالیے۔

3۔ اپ بھرنش کسے کہتے ہیں؟ اپ بھرنش کے اقسام بیان کیجیے۔

4۔ اردو کی لسانی ساخت' ڈھانچے اور کینڈے پر اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

1۔ گریرسن کے مطابق جدید ہند آریائی زبانیں کتنی ہیں؟ ان کے نام بتائیں۔

2۔ پراکرت اور ان کی اقسام پر نوٹ لکھیے۔

3۔ قدیم ہند آریائی دور کی زبان ویدک اور کلاسیکل سنسکرت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

4۔ اردو کے ہندآریائی پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

1.9 فرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
شستہ	صاف، معیاری	خاندان السنہ	زبانوں کا خاندان
مصفّا	صاف ستھرا	لاٹ	ستون، کھمبا
جمود	ٹھہراؤ	فائق	فوقیت کی حامل
تقدس	بزرگی، احترام، عزت	پروان چڑھنا	ترقی کرنا
منبع	ماخذ	مزاحمت	رکاوٹ
نقل مکانی	ہجرت	قلم بند کرنا	لکھنا
مسخ کرنا	بگاڑنا	اوراد	روزانہ پڑھنے کے وظیفے
بانی	آواز	اپدیش	تعلیمات
غلبہ	فوقیت، برتری	ارتقا	فروغ، ترقی
مورخین	تاریخ لکھنے والے	تقویم	کیلنڈر (Calendar)
زمرے	گروپ	معرکہ آرائی	لڑائی
بارآور ہونا	پھلنا پھولنا، ترقی کرنا	اختلاط	میل جول
اٹل	حتمی، فائنل	وقتی	عارضی
خانہ بدوش	بے گھر لوگ جو وقتاً فوقتاً اِدھر اُدھر رہا کرتے ہیں اور عارضی قیام کے لیے روزی اور جگہ کی تلاش میں گھومتے پھرتے ہیں	تعبیر	تشریح
		جتھے	گروہ، جماعت
		تسلسل	سلسلہ
		عسکری طاقت	فوجی طاقت

1.10 سفارش کردہ کتابیں

1۔	مقدمہ تاریخ زبان اردو	پروفیسر مسعود حسین خاں
2۔	ہندآریائی اور ہندی	سینتی کمار چٹرجی مترجم عتیق احمد صدیقی
3۔	لسانی مطالعہ	پروفیسر گیان چند جین
4۔	عام لسانیات	پروفیسر گیان چند جین
5۔	ہندوستانی لسانیات	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
6۔	زبان اور علم زبان	پروفیسر عبدالقادر سروری
7۔	سماجی انسانیات	ڈاکٹر محمد عبدالقادر عمادی

8۔	اردو کی لسانی تشکیل	ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ
9۔	اردو زبان کا قومی کردار	ظفر ادیب
10۔	ہند آریائی اور اردو	ڈاکٹر سید حمید الدین شرفی قادری
11۔	جدید اردو لسانیات	ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین
12۔	زبان کیا ہے	خلیل صدیقی
13۔	لسانی مقالات حصہ دوم	مرتبہ سید قدرت نقوی
14۔	تین ہندوستانی زبانیں	کے ایس بیدی
15۔	اردو ساخت کے بنیادی عناصر	ڈاکٹر نصیر احمد خاں
16۔	اردو کی بولیاں اور کرخنداری کا عمرانی لسانیاتی مطالعہ	ڈاکٹر نصیر احمد خاں
17۔	اردو زبان کی تاریخ	مرتبہ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ

اکائی 2 مغربی ہندی اور اس کی بولیاں

اکائی کے اجزا

2.0 مقصد

2.1 تمہید

2.2 مغربی ہندی کا ارتقا

2.2.1 مغربی ہندی کا تعارف

2.2.2 مغربی ہندی کا علاقہ

2.2.3 مغربی ہندی کی بولیوں کی ساخت

2.3 مغربی ہندی کی بولیاں اور ان کی خصوصیات

2.3.1 کھڑی بولی

2.3.2 ہریانوی

2.3.3 برج بھاشا

2.3.4 قنوجی

2.3.5 بندیلی

2.4 خلاصہ

2.5 نمونۂ امتحانی سوالات

2.6 فرہنگ

2.7 سفارش کردہ کتابیں

2.0 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبا کو مغربی ہندی اور اس کی بولیوں سے واقف کروانا ہے۔ اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ

☆ لسانیات کی روشنی میں مغربی ہندی کی وضاحت کر سکیں۔

☆ مغربی ہندی کی بولیوں کے علاقے اور ساخت کے متعلق اظہار خیال کر سکیں۔

☆ مغربی ہندی کی بولیوں کی خصوصیات کی وضاحت کر سکیں۔

2.1 تمہید

گزشتہ اکائی میں آپ نے ہند آریائی کے ارتقا کا مطالعہ کیا تھا۔ ماہرین لسانیات نے ہندوستان کی سبھی زبانوں کا تجزیہ کرنے کے بعد ہند آریائی زبانوں کے تین اہم ادوار کی نشان دہی کی ہے۔ اس اکائی میں آپ ہند آریائی زبانوں کے ایک اہم لسانی پڑاؤ مغربی ہندی کے بارے میں پڑھیں گے۔ ماہر لسانیات گریرسن نے وسطی ہند آریائی کے تیسرے دور یعنی اپ بھرنش اور جدید ہند آریائی دور کی زبانوں کے درمیانی اور عبوری دور میں مدھیہ دیش کی زبان کو مغربی ہندی کا نام دیا تھا۔ اس طرح مغربی ہندی کا تعلق ایک طرف شورسینی اپ بھرنش سے اور دوسری طرف جدید ہند آریائی زبانوں سے ہے۔ مغربی ہندی کسی ایک زبان کا نام نہیں بلکہ دہلی اور اس کے اطراف کی پانچ بولیوں کا اجتماعی نام ہے۔ مغربی ہندی کی ان پانچ بولیوں میں سے تین بولیوں کھڑی بولی، ہریانوی اور برج بھاشا نے جدید ہند آریائی زبان اردو کے آغاز وارتقا میں سب سے اہم کردار کیا ہے۔ اس اکائی میں آپ مغربی ہندی کی بولیوں کے بارے میں تفصیل سے پڑھیں گے۔ آپ کی آسانی کے لیے اس اکائی کا خلاصہ اور امتحانی سوالات کے نمونے دیے گئے ہیں۔ فرہنگ میں نئے الفاظ کے معنی اور مزید مطالعے کے لیے سفارش کردہ کتابوں کی فہرست بھی دی گئی ہے۔

2.2 مغربی ہندی کا ارتقا

2.2.1 مغربی ہندی کا تعارف

مغربی ہندی ایک لسانی اصطلاح ہے جس کا استعمال سب سے پہلے مشہور ماہر لسانیات جارج ابراہم گریرسن (م 1941ء) نے کیا تھا۔ گریرسن ایک یوروپی عالم تھا جس نے ہندوستانی زبانوں کی ابتدا اور ارتقا کا مطالعہ سائنسی اور تحقیقی انداز میں کیا۔ اس نے لسانیات کی روشنی میں تقریباً تیس سال تک ہندوستان کی زبانوں کا جائزہ لیا اور اپنی مشہور تصنیف ''لسانیاتی جائزۂ ہند'' (Lingustic Survey Of India) پیش کی۔ اس نے سنسکرت اور ہندوستانی زبان کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ 1896 میں پٹنہ کا ایڈیشنل کمشنر مقرر ہوا۔ ملازمت کے دوران ہی اس نے ہندوستانی زبانوں کی فہرست بنانے کا کام شروع کیا جو تیس برسوں کے بعد لسانیاتی جائزۂ ہند کی شکل میں 1928 میں مکمل ہوا۔ یہ تصنیف 18 جلدوں پر مشتمل ہے جس میں 179 زبانوں اور 544 بولیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ گریرسن نے ان زبانوں اور بولیوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا ہے اور انھیں ہند آریائی خاندان میں شمار کیا ہے۔ لسانیاتی جائزۂ ہند کی نویں جلد 1916 میں شائع ہوئی جس میں گریرسن نے مغربی ہندی کی لسانی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے مغربی ہندی اور اس کی بولیوں کے بارے میں تفصیلی بحث کی ہے۔

لسانیاتی اعتبار سے مغربی ہندی کا تعلق براہ راست شورسینی اپ بھرنش سے ہے۔ یہ اپ بھرنش شورسینی پراکرت کے علاقے میں بولی جانے والی اپ بھرنش ہے۔ شورسینی اپ بھرنش اس عہد کی بولیوں میں ممتاز ادبی حیثیت کی مالک تھی اور اس نے سب سے زیادہ سنسکرت کے اثر کو قبول کیا تھا۔ اسی شورسینی اپ بھرنش نے مغربی ہندی کو جنم دیا ہے۔ مغربی ہندی دراصل کسی مخصوص زبان کا نام نہیں بلکہ یہ شورسینی اپ بھرنش سے نکلنے والی پانچ بولیوں کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ بولیاں دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں بولی جاتی تھیں۔ یہ پانچ بولیاں ہیں: (1) کھڑی بولی، (2) ہریانی (جاٹو یا بانگرو)، (3) برج بھاشا، (4) قنوجی اور (5) بندیلی۔ ان سبھی بولیوں کو گریرسن نے مغربی ہندی کا اجتماعی نام دیا ہے کیونکہ یہ لسانیاتی اعتبار سے باہم مماثلت رکھتی ہیں۔ ان بولیوں کی اپنی صوتی اور صرفی ونحوی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اس لسانی گروہ کو ایک علاحدہ اور ممتاز حیثیت دی گئی ہے۔ انھیں مغربی ہندی اس لیے کہا گیا کیونکہ یہ مشرقی ہندی کے مغرب میں واقع بولیاں ہیں۔ ''مشرقی ہندی'' کی لسانی اصطلاح بھی گریرسن نے استعمال کی ہے۔

مشرقی ہندی تین بولیوں کا ایک اجتماعی نام ہے جس میں اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی شامل ہیں اور یہ مغربی ہندی کے مشرق میں بولی جاتی ہیں۔

اپ بھرنشوں کے عہد کا خاتمہ دسویں صدی عیسوی میں ہوا۔اسی دور میں شورسینی اپ بھرنش کا بھی خاتمہ ہوا اور 1000 سن عیسوی تک اس سے شمالی ہندوستان کی کئی زبانوں اور بولیوں نے جنم لیا۔ان بولیوں میں ایک طرف پنجابی (مشرقی)، گجراتی اور راجستھانی ہیں تو دوسری طرف ان سے مختلف دہلی اور اس کے آس پاس کی بولیاں شامل ہیں۔لسانی اختلاف کے باوجود ان سبھی کا ارتقا شورسینی اپ بھرنش سے ہی ہوا ہے۔دہلی اور اس کے اطراف کی بولیوں کی نشاندہی سب سے پہلے امیر خسرو (1253-1325) نے اپنی مشہور مثنوی ''نہ سپہر'' (1318) کے تیسرے سپہر میں کی ہے۔خسرو نے اپنے عہد کے ہندوستان کی گیارہ زبانوں کے علاوہ بارہویں زبان کا نام ''دہلی وپیرامنش''یعنی دہلی اور اس کے نواح کی زبان بتائی ہے۔خسرو ہندوستان کی سبھی بارہ زبانوں کو ہندوی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔دہلی اور نواحِ دہلی کی زبان کو ہندوی کے علاوہ ''ہندی'' بھی کہا گیا ہے۔یہ دونوں نام شورسینی اپ بھرنش سے 1000ء کے بعد وجود میں آنے والی دہلی اور اس کے اطراف کی بولیوں کے لیے ہی استعمال کیے گیے۔یہ بولیاں کھڑی بولی اور ہریانی (جاٹو یا بانگرو) ہیں۔ان میں کھڑی بولی دہلی کے شمال مشرق میں بولی جاتی ہے جب کہ ہریانوی دہلی کے مغرب میں۔ان زبانوں کو ''دہلوی'' بھی کہا گیا ہے کیونکہ دہلی میں جمنا کے دونوں جانب یہی بولیاں ہیں جو ایک دوسرے سے ملتی بھی ہیں اور متاثر بھی کرتی ہیں۔ماہر لسانیات مرزا خلیل احمد بیگ کے مطابق مغربی ہندی کی ان دو بولیوں میں مسلمانوں کی دہلی میں آمد کے بعد عربی وفارسی الفاظ داخل ہوتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ دہلی ونواحِ دہلی کی اسی زبان کے تین نام دہلوی، ہندوی اور ہندی ہیں۔شمالی ہند میں آنے والے مسلمان فاتحین نے ہندوستان کی مناسبت سے یہاں کی بولیوں کو 'ہندی' کے نام سے موسوم کیا۔گریرسن نے شمالی ہند کی ان ہی بولیوں کو علاقائی بنیاد پر دو گروہ میں تقسیم کر کے مشرقی ہندی اور مغربی ہندی کے نام دیے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''گریرسن نے مسلمانوں کے دیے ہوئے اسی لفظِ ''ہندی'' کو لے کر اس کا دائرہ بڑھا دیا اور اس کے تحت ہریانہ، دہلی، اتر پردیش، اترا کھنڈ، مدھیہ پردیش اور چھتیس گڑھ کے وسیع علاقے میں بولی جانے والی آٹھ بولیوں کو شامل کر لیا جن میں تین بولیاں: اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی 'مشرقی ہندی' کہلائیں اور بقیہ پانچ بولیوں: کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی کو 'مغربی ہندی' کے نام سے موسوم کیا گیا۔'' (اردو کی لسانی تشکیل، ص155)

ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے دہلی اور نواح کی بولیوں میں مغربی ہندی کی تین بولیوں کھڑی بولی، ہریانوی اور برج بھاشا کو شامل کیا ہے اور قدیم اردو پر ان کے گہرے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔اس طرح گریرسن کے لسانی گروہ مغربی ہندی کی پانچ بولیوں میں سے تین اہم بولیوں کا تعلق خسرو کی اصطلاح ''دہلی اور پیرامنش'' سے ہے جسے ہندوی، ہندی اور دہلوی کا نام دیا گیا۔مغربی ہندی کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ سبھی ماہرین لسانیات اس بات پر متفق ہیں کہ اردو کی ابتدا کا تعلق اسی مغربی ہندی کی بولیوں سے ہے۔اردو کے علاوہ ہندوستان کی اکثر جدید زبانوں کا آغاز بھی اسی سے ہوا ہے۔

2.2.2 مغربی ہندی کا علاقہ

گریرسن کے مطابق ہندوستان میں آریا الگ الگ گروہوں کی شکل میں آئے۔ان کا پہلا گروہ ہندوستان کے جس علاقے میں آباد ہوا وہ مدھیہ دیش یا وسطی علاقہ تھا۔اسی علاقے میں قدیم ہند آریائی دور (1500 سے 500 قبل مسیح) کی سنسکرت کی معیاری شکل کا ارتقا ہوا تھا۔وسطی ہند آریائی دور (500 ق م سے 1000 سن عیسوی) میں شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش کا فروغ بھی اسی علاقے میں ہوا۔شورسینی اپ بھرنش سارے شمالی ہند کی لنگوا فرینکا کی حیثیت رکھتی تھی جو گجرات اور مغربی پنجاب سے لے کر بنگال تک رائج تھی۔1000ء کے بعد جدید ہند آریائی دور میں شورسینی اپ بھرنش سے نکلنے والی متعدد بولیوں کا تعلق بھی مدھیہ دیش کے علاقے سے ہے۔ان جدید ہند آریائی زبانوں اور بولیوں میں مغربی ہندی کی پانچ بولیوں کھڑی

بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی کے علاوہ پنجابی (مشرقی)، گجراتی اور راجستھانی کا ارتقا ہوا۔اس طرح مغربی ہندی کا علاقہ لسانی اعتبار سے ہندوستان کا سب سے اہم علاقہ مدھیہ دیش ہے۔ یہ علاقہ موجودہ ہندوستان کی پانچ ریاستوں ہریانہ، دہلی، اتر پردیش، اتراکھنڈ اور مدھیہ پردیش پر مشتمل ہے۔اگر ہم دیگر جدید ہند آریائی زبانوں اور مغربی ہندی کے علاقے کو دیکھیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اس کے شمال مغرب میں پنجابی زبان ہے اور جنوب مشرق میں مراٹھی اور مشرقی ہندی کی بولیاں ہیں۔شمال میں یہ پہاڑی بولیوں سے گھری ہوئی ہے۔

2.2.3 مغربی ہندی کی بولیوں کی ساخت

شورسینی اپ بھرنش اپنے آخری دور میں دو نمایاں شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔پہلی شکل میں افعال و اسما کا اختتام عام طور سے الف (ا) پر ہوتا ہے اور دوسری شکل میں واؤ (و) پر۔اس لیے مغربی ہندی کی پانچ بولیوں کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ان میں پہلی قسم الف (ا) کی شکل رکھنے والی بولیاں ہیں جب کہ دوسری قسم واؤ (و) کو ترجیح دینے والی بولیاں ہیں۔ساخت کی بنیاد پر مغربی ہندی کی بولیوں کی تقسیم درج ذیل ہے۔

1۔ الف یعنی طویل مصوتے پر ختم ہونے والی بولیاں:

مغربی ہندی کی بولیوں کا وہ گروہ جن میں اسما، ضمائر، صفات اور افعال کا خاتمہ الف (ا) یعنی طویل مصوتوں پر ہوتا ہے ان میں ہریانی اور کھڑی بولی شامل ہیں۔مثلاً بیٹا/ گھوڑا (اسم)، میرا/ تمہارا (ضمیر)، بڑا/اچھا (صفت)، آیا/ گیا/ کہنا (فعل) وغیرہ۔

2۔ واؤ (و) مصوتے پر ختم ہونے والی بولیاں:

مغربی ہندی کی بولیوں کا وہ گروہ جن میں اسما، ضمائر، صفات اور افعال کا خاتمہ واؤ (و) مصوتوں پر ہوتا ہے ان میں برج بھاشا' بندیلی اور قنوجی شامل ہیں۔مثلاً

بیٹو (اسم)، میرو/ تمہارو (ضمیر)، آیو/ گیو/ کہیو (فعل) وغیرہ۔

مغربی ہندی کی بولیوں کا لسانی رشتہ براہ راست شورسینی اپ بھرنش سے ہے اس لیے شورسینی اپ بھرنش کے آخری دور کے ادبی نمونوں میں مغربی ہندی کی بولیوں کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔مغربی ہندی کی بولیوں میں کچھ ایسی صوتی، صرفی اور نحوی خصوصیات ہیں جس کی بنا پر یہ دوسری بولیوں سے مختلف اور ممتاز ہیں۔ان بولیوں کا رجحان تفصیلی یا تحلیلی (Analytical) ہے۔یہ رجحان کھڑی بولی میں سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔اس لیے کھڑی بولی کی معیاری اور ترقی یافتہ شکل اردو کی ساخت بھی ایک تحلیلی ہے۔مرزا خلیل احمد بیگ کے مطابق اردو کے تحلیلی رجحان کی مثال یہ ہے کہ اس زبان میں اسم کی صرف ایک حالت ملتی ہے اور اسم کی دیگر حالتیں حروف کی مدد سے بنائی جاتی ہیں۔اس کے علاوہ اردو میں فعل کے لیے صرف ایک زمانہ ہے لہٰذا فعل کی بقیہ تمام شکلیں امدادی افعال اور لاحقوں کی مدد سے بنائی جاتی ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ مغربی ہندی کی اصطلاح سب سے پہلے کس ماہر لسانیات نے استعمال کی؟

2۔ گریرسن کی مشہور تصنیف کا نام کیا ہے؟

3۔ مغربی ہندی میں کتنی بولیاں شامل ہیں؟

4۔ مغربی ہندی کا تعلق ہندوستان کے کس علاقے سے ہے؟

5۔ مغربی ہندی کی بولیوں کو کتنے گروہ میں تقسیم کیا گیا ہے؟

6۔ مغربی ہندی کی سب سے بڑی اہمیت کیا ہے؟

2.3 مغربی ہندی کی بولیاں اوران کی خصوصیات

2.3.1 کھڑی بولی

کھڑی بولی دہلی اوراس کے اطراف کی بولیوں میں ایک اہم بولی ہے۔ یہ دہلی کے شمال مشرق کی بولی ہے جس کا علاقہ جمنا پار کرتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جمنا کے مشرق میں دریائے گنگا ہے اس لیے اس علاقے کو بالائی دوآبہ کہا جاتا ہے۔ گنگا کے مشرق اور مغرب میں کھڑی بولی کا خاص علاقہ ہے جو مغربی اتر پردیش کے کئی اضلاع پر مشتمل ہے۔ ان اضلاع میں مسلمانوں کی اکثریت رہی ہے اور ان کی تہذیب وثقافت کے گہرے اثرات آج بھی موجود ہیں۔ کھڑی بولی کی کئی شکلیں ہیں جن میں سے دو کی نشاندہی گریرسن نے کی ہے۔ اس کی ایک شکل گنگا کے مشرقی جانب مراد آباد، بجنور، رام پور اضلاع میں بولی جاتی ہے۔ اوراس کی دوسری شکل گنگا کے مغرب میں میرٹھ، مظفرنگر اور سہارن پور کے اضلاع کی بولی ہے۔ مظفرنگر میں تشدید کا استعمال زیادہ ہوتا ہے اور افعال کی صورت یہ ہے کہ ''میں مارتا ہوں'' کے ساتھ ''میں ماروں ہوں'' بھی کہا جاتا ہے۔ اسما کی جمع (اں) سے بنائی جاتی ہے مثلاً عورتاں، قلماں، مکاناں وغیرہ۔ ضمیر میں تیرا کی جگہ تجھ مجھ کا استعمال بھی ملتا ہے۔ کھڑی بولی شمال میں دہرہ دون اور اتراکھنڈ کے میدانی علاقے میں بھی بولی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ضلع انبالہ کی تحصیل انبالہ اور ضلع بلند شہر کے شمالی حصے میں یہ رائج ہے۔ کھڑی بولی کے شمال میں پہاڑی بولیوں کا علاقہ ہے۔ اس کے شمال مغرب میں ہریانوی، جنوب میں برج بھاشا اور جنوب مشرق میں قنوجی بولی جاتی ہے۔ اس طرح کھڑی بولی کے علاقے کے تین جانب مغربی ہندی کی بولیوں کا علاقہ ہے۔ مسعود حسین خاں نے مغربی روہیل کھنڈ کے اضلاع بجنور، مراد آباد اور رام پور کی کھڑی بولی کو معیاری اردو سے قریب ترین قرار دیا ہے۔ وہ اس بولی کے نام کھڑی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اس کا کھڑی نام بہت پرانا نہیں۔ پریم ساگر کے مصنف للّو لال کوی نے 1803ء میں برج بھاشا سے امتیاز کرنے کے لیے اسے استعمال کیا تھا۔ گریرسن نے ''لسانیاتی جائزۂ ہند'' (جلد نہم حصہ اول) میں اسی بولی کو ''ورناکلر ہندستانی'' کے نام سے یاد کیا جس کی دو ادبی شکلیں ہیں: اردو اور ہندی۔'' (مقدمہ تاریخ زبان اردو، ص 247)

کھڑی بولی دوسری بولیوں کے مقابلے میں قدیم ترین ہے۔ یہ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہی میرٹھ اوراس کے مضافات میں بولی جاتی تھی۔ اس بولی کی جھلک اپ بھرنش کی قدیم ترین تصنیفات میں ملتی ہے۔ اس کے اثرات اتنے ہمہ گیر تھے کہ یہ اپنے علاقے سے آگے بڑھ کر پنجابی کو بھی متاثر کرتی رہی ہے۔ لیکن پندرہویں صدی سے قبل اس بولی کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہے۔ دکن میں اس کا پہلا مستند نمونہ ملتا ہے جو فخر دین نظامی بیدری کی تصنیف ''مثنوی کدم راؤ پدم راؤ'' (1421 سے 1445 کے درمیان) کی شکل میں موجود ہے۔ شمالی ہند میں امیر خسرو کے غیر مستند ہندوی کلام کے علاوہ صوفیا کرام کے چند فقرے ہی ملتے ہیں۔

پروفیسر گیان چند جین نے اس کا نام ''کھڑی'' ہونے کی وجوہات اپنی تصنیف ''عام لسانیات'' میں درج ذیل بتائی ہیں:

1۔ برج کے مقابلے میں کھڑی کا لہجہ (اَ) کا ہے اس لیے اسے کھڑی کہا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں برج کو جس کا لہجہ (او) کا ہے ''پڑی'' سمجھا گیا۔

2۔ برج کے مقابلے میں کھڑی میں تشدید کا رجحان زیادہ ہے اور معکوسی مصمّتے ڈ، ڑ کا استعمال بھی زیادہ ہے۔ برج میں کھڑی کا ڈ کئی موقعوں پر ڑ یا ر ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے برج میں شیرینی آ گئی ہے۔

3۔ تیسری توجیہہ کے مطابق کھڑی دراصل کھری ہے۔ کھری بولی یعنی صاف ستھری فصیح۔

کھڑی بولی کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اردو جو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے' براہ راست کھڑی بولی سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کھڑی بولی کا ہی نکھرا ہوا روپ ہے اور اسی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ پروفیسر گیان چند جین اپنے ایک مقالے ''اردو کے آغاز کے نظریے'' میں اسی بات پر شدت کے ساتھ زور دیتے ہیں کہ ''اردو کی اصل کھڑی بولی اور صرف کھڑی بولی ہے۔'' اردو کی اصل واساس کھڑی بولی ہے اور اس کا ڈھانچہ اور کینڈا سب کچھ کھڑی بولی کا ہے۔ اردو کے ماخذ کے سلسلہ میں اکثر عالموں کا کھڑی بولی پر اتفاق ہے جو دوآبے کے علاقے کی شورسینی اپ بھرنش کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اردو میں اگرچہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو کھڑی بولی سے پیدا ہوئی۔ جس زمانے میں شمالی ہندوستان میں سیاسی طور پر تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں' اس وقت دہلی اور اس کے نواح میں بعض ایسی بولیاں سر اٹھا رہی تھیں جن کے بہت سے لفظوں کا ڈھانچا کھڑا تھا یعنی جن کے بیشتر الفاظ ''الف'' یا 'آ'' کی آواز پر ختم ہوتے تھے۔ کھڑی بولی ان میں سے ایک ہے۔

2.3.2 ہریانوی

مغربی ہندی کی ایک اور بولی ہریانوی ہے جو دہلی کے شمال مغرب میں واقع صوبہ ہریانہ میں بولی جاتی ہے۔ ہریانوی کو ''بانگڑو'' بھی کہتے ہیں۔ ہریانہ کے علاوہ دہلی کے اطراف میں بھی ہریانوی بولی جاتی ہے جسے ''جاٹو'' کہتے ہیں کیونکہ اس کے بولنے والوں میں جاٹوں کی اکثریت ہے۔ ہریانہ کے اضلاع رہتک، حصار اور کرنال خالص ہریانوی کے علاقے ہیں۔ ہریانوی کے شمال میں پنجابی، شمال مشرق میں کھڑی بولی اور جنوب مغرب میں راجستھانی بولی جاتی ہے۔ ہریانوی سب سے زیادہ پنجابی سے متاثر ہے۔ جیسے جیسے معیاری اردو کا ارتقا ہوا اُس میں ہریانوی کے اثرات کم ہوتے چلے گئے۔ ہریانوی مغربی ہندی کی دوسری اہم بولی ہے جس نے اردو کی ابتدا اور ارتقا میں بنیاد کا کام کیا ہے۔ دہلی اور نواحِ دہلی کی جن بولیوں سے اردو سب سے زیادہ متاثر ہوئی ان میں ہریانوی بھی ہے۔ ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے قدیم اردو پر ہریانوی کے گہرے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''قدیم اردو کی تشکیل براہ راست ہریانی کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔ اس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑے ہیں۔''
>
> (مقدمہ تاریخ زبان اردو، جلد چہارم، ص 241)

2.3.3 برج بھاشا

برج بھاشا کو مغربی ہندی کی نمائندہ بولی مانا جاتا ہے۔ یوں تو مغربی ہندی کی سبھی بولیوں کا رشتہ شورسینی اپ بھرنش سے ہے لیکن ان میں برج بھاشا کو فوقیت حاصل ہے اور یہ شورسینی اپ بھرنش کی سچی جانشین کہی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برج بھاشا مغربی ہندی کی دیگر چار بولیوں کے مقابلے میں شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش کی مجموعی خصوصیات کی زیادہ حامل رہی ہے۔ لفظ برج کی نسبت گائے سے ہے جو شورسین علاقے میں مقدس مانی جاتی ہے۔ شورسین متھرا کے علاقے کا قدیم نام ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ علاقہ مذہبی لحاظ سے بہت مقدس سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے متھرا ہندو مذہب اور تہذیب کا قدیم مرکز رہا ہے۔ ہندو مذہب کے فروغ کے لیے استعمال ہونے والی زبان سنسکرت کا بھی علاقہ متھرا ہی رہا ہے۔ اسی لیے برج بھاشا پر سنسکرت کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ برج بھاشا کو شورسینی کی سچی جانشین کہنے کی تین اہم وجوہات ہیں:

1۔ برج بھاشا ادبی زبان کا درجہ رکھتی تھی۔ سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش میں تخلیق ہونے والے ادب کے بعد ہندوستان کی جس بولی میں سب سے زیادہ ادب تخلیق ہوا وہ برج بھاشا ہے۔ دوسری بولیوں میں ادب کی تخلیق بہت بعد میں ہوئی۔

2۔ برج بھاشا کا تعلق بھگتی تحریک سے رہا ہے۔ جس طرح پالی کی اہمیت بدھ مت کی تبلیغ کے لیے استعمال ہونے کی وجہ سے تھی اسی طرح برج بھاشا بھی بھگتی کی تحریک سے وابستہ ہو کر دور دور تک پھیل گئی۔ اس تحریک کے مبلغین نے برج بھاشا میں ہی اپنی تعلیمات کو عام کیا۔ شورسینی اپ

بھرنش کی طرح اس کی سچی جانشین برج کے اثرات بھی ملک گیر تھے۔ یہ بھگتی تحریک ایک مذہبی تحریک تھی جس کا مرکز متھرا تھا۔ متھرا کا تعلق کرشن سے ہے اور یہ تحریک بنیادی طور پر کرشن بھگتی کی تحریک تھی۔ کرشن بھگتی کا پورا ادبی سرمایہ برج بھاشا میں ہی محفوظ ہے۔ سور داس جیسے مشہور کرشن بھکت شاعر نے اسی زبان میں شاعری کی۔ برج بھاشا کے اس شاعر کو آج کے ہندی ادب میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

3۔ برج بھاشا اپنے عروج پر تب پہنچی جب مغل بادشاہ اکبر نے دارالسلطنت دہلی سے آگرہ منتقل کیا۔ اکبر کے بعد شاہجہاں نے اپنی راجدھانی دوبارہ دہلی منتقل کر لی۔ لیکن اکبر اور شاہجہاں کے دور حکومت کے بڑے حصے میں آگرہ دارالحکومت رہا۔ اس وقت برج بھاشا کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی اور برج کے مشہور شاعر عبدالرحیم خانخاناں اکبر کے دربار سے وابستہ تھے۔ بادشاہ اکبر برج بھاشا کو پسند کرتا تھا اور اس نے اس زبان میں دوہے بھی کہے ہیں۔ اکبر کی اس سرپرستی کی وجہ سے اس دور میں برج بھاشا شمالی ہند کی اعلیٰ ادبی زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔

برج بھاشا کا علاقہ مغربی ہندی کی دوسری بولیوں کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔ یہ جن اضلاع کی خاص بولی ہے ان میں بلند شہر، متھرا اور آگرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ متھرا کے جنوب میں یہ فیروز آباد، بھرت پور، دھول پور، گوالیار اور جے پور کے مشرقی حصوں میں بولی جاتی ہے۔ متھرا کے شمال مشرق میں ایٹہ، علی گڑھ، مین پوری، بدایوں اور بریلی وغیرہ اضلاع بھی برج بھاشا کے علاقے میں شامل ہیں۔ گڑگاؤں کے مشرقی حصے میں بھی یہ رائج ہے اور راجستھانی کی ایک بولی میواتی سے متاثر ہے۔ اسی طرح بلند شہر کی برج بھاشا کھڑی بولی سے گھلی ملی ہے۔ برج بھاشا مغربی ہندی کی بولیوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتی ہے جن میں اسما، ضمائر، صفات اور افعال کا خاتمہ واؤ (و) پر ہوتا ہے۔ مثلاً بیٹو (اسم)، میرو (ضمیر)، کہیو (فعل) وغیرہ۔ ساخت کے لحاظ سے اردو اور برج بھاشا بالکل مختلف زبانیں ہیں لیکن اردو کے ارتقا میں برج کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ برج بھاشا کا لسانیاتی رشتہ نہ صرف قدیم اردو سے رہا ہے بلکہ بقول مسعود حسین خاں جدید اردو کے معیاری لہجے پر بھی اس کے گہرے اثرات ہیں۔

2.3.4 قنوجی

مغربی ہندی کی اس بولی کا نام قنوج شہر کی مناسبت سے قنوجی رکھا گیا ہے۔ قنوج ایک تاریخی شہر ہے جس کا ذکر رامائن جیسی قدیم کہانی میں ملتا ہے۔ یہ شہر یو پی کے فرخ آباد ضلع میں واقع ہے۔ محمد غوری کے ہاتھوں راٹھور خاندان کے آخری راجا جے چند کی شکست کے بعد یہ تاریخی شہر اجڑ گیا۔ قنوجی آج بھی ایٹہ، فرخ آباد اور شاہجہاں پور میں بولی جاتی ہے۔ اس کا علاقہ اٹاوہ، کانپور، ہردوئی اور شاہجہاں پور کے شمال میں پیلی بھیت تک پھیلا ہے۔ قنوجی کے شمال، شمال مغرب اور مغرب میں برج بھاشا کا علاقہ ہے۔ مشرق اور شمال مشرق میں اودھی اور جنوب میں بندیلی رائج ہے۔ قنوجی پر برج بھاشا کے اثرات اس قدر غالب رہے ہیں کہ یہ کبھی اپنی الگ پہچان نہیں بنا سکی۔ برج اور قنوجی کی قواعد میں کئی مماثلتیں ہیں اور ان دونوں میں گہرا لسانی رشتہ بھی ہے۔ برج اور قنوجی دونوں کے مصمتوں کے آخر میں (وا) بڑھا دیا جاتا ہے مثلاً کھڑی کا لفظ 'گھر' برج اور قنوجی میں 'گھروا' ہو جاتا ہے۔

2.3.5 بندیلی

مغربی ہندی کی بولی بندیلی کا تعلق بندیل کھنڈ سے ہے۔ یو پی کے اضلاع باندا، ہمیر پور، جالون، جھانسی اور مدھیہ پردیش کے چند شمالی اضلاع بندیل کھنڈ کے علاقے میں شامل ہیں۔ یہ شمال میں آگرہ، مین پوری اور ایٹہ تک رائج ہے جب کہ شمال مغرب میں قنوجی اور برج بھاشا سے اس کی سرحد ملتی ہے۔ اس کے مشرق میں بگھیلی، جنوب میں مراہٹی اور جنوب مغرب میں راجستھانی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ بندیل کھنڈ کے باہر بھی بندیلی بولی جاتی ہے۔ اس بولی میں ادب بالخصوص عوامی ادب کا وسیع سرمایہ موجود ہے۔ عوامی ادب میں آلھا اودل کے منظوم رزمیہ قصے بہت مشہور اور مقبول ہیں جنہیں شمالی اور مشرقی ہندوستان کے علاقوں میں آج بھی پسند کیا جاتا ہے۔ بندیلی کی لسانیاتی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں معکوسی 'ڑ' کے بجائے سادہ 'ر' کا استعمال رائج ہے جیسے کپڑا کو کپرا بولتے ہیں۔ لفظ 'بہت' کا تلفظ بندیلی میں 'بھوت' کیا جاتا ہے۔

اس طرح مغربی ہندی کی یہ سبھی پانچ بولیاں جدید ہندآریائی دور کی اہم بولیاں ہیں جنہوں نے شمالی ہندوستان کی کئی جدید زبانوں کی ابتدا اور ارتقا میں اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ آج بھی اپنے اپنے علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ مغربی ہندی کی بولیاں کون سی ہیں؟

2۔ کس علاقے کو بالائی دوآبہ کہا جاتا ہے؟

3۔ کھڑی بولی کی کتنی شکلیں ہیں؟

4۔ مغربی ہندی کی قدیم ترین بولی کون سی ہے؟

5۔ کھڑی بولی کا تعلق کس جدید زبان سے براہ راست ہے؟

6۔ ہریانوی کے دو اور نام کیا ہیں؟

7۔ شورسینی اپ بھرنش کی سچی جانشین کس بولی کو کہا جاتا ہے؟

8۔ قنوجی ہندوستان کے کس علاقے کی بولی ہے؟

9۔ آلھا اودل قصے کا تعلق مغربی ہندی کی کس بولی سے ہے؟

2.4 خلاصہ

مغربی ہندی ایک لسانی اصطلاح ہے جس کا استعمال سب سے پہلے مشہور ماہر لسانیات جارج ابراہم گریرسن نے کیا تھا۔ گریرسن نے اپنی مشہور تصنیف لسانیاتی جائزۂ ہند میں مغربی ہندی کی لسانی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے مغربی ہندی اور اس کی بولیوں کے بارے میں تفصیلی بحث کی ہے۔ لسانیاتی اعتبار سے مغربی ہندی کا تعلق براہ راست شورسینی اپ بھرنش سے ہے۔ یہ اپ بھرنش شورسینی پراکرت کے علاقے میں بولی جانے والی اپ بھرنش ہے۔ مغربی ہندی دراصل کسی مخصوص زبان کا نام نہیں بلکہ یہ شورسینی اپ بھرنش سے نکلنے والی پانچ بولیوں کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ بولیاں دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں بولی جاتی تھیں۔ یہ پانچ بولیاں ہیں: (1) کھڑی بولی، (2) ہریانی (جاٹو یا بانگرو)، (3) برج بھاشا، (4) قنوجی اور (5) بندیلی۔ ان سبھی بولیوں کو گریرسن نے مغربی ہندی کا اجتماعی نام دیا ہے کیونکہ یہ لسانیاتی اعتبار سے باہم مماثلت رکھتی ہیں۔ مغربی ہندی کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اکثر ماہرین لسانیات کے مطابق اردو کی ابتدا کا تعلق اسی مغربی ہندی کی بولیوں سے ہے۔ اردو کے علاوہ ہندوستان کی اکثر جدید زبانوں کا آغاز بھی اسی سے ہوا ہے۔

مغربی ہندی کا علاقہ وہی ہے جو آریوں کی آمد کے بعد معیاری سنسکرت، شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش کا علاقہ رہا ہے۔ 1000ء کے بعد جدید ہندآریائی دور میں شورسینی اپ بھرنش سے نکلنے والی متعدد بولیوں کا تعلق بھی مدھیہ دیش کے علاقے سے ہے۔ ان جدید ہندآریائی زبانوں اور بولیوں میں مغربی ہندی کی پانچ بولیوں کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی کے علاوہ پنجابی (مشرقی)، گجراتی اور راجستھانی کا ارتقا ہوا۔ اس طرح مغربی ہندی کا علاقہ لسانی اعتبار سے ہندوستان کا سب سے اہم علاقہ مدھیہ دیش ہے۔ یہ علاقہ موجودہ ہندوستان کی پانچ ریاستوں ہریانہ، دہلی، اتر پردیش، اتراکھنڈ اور مدھیہ پردیش پر مشتمل ہے۔

شورسینی اپ بھرنش اپنے آخری دور میں دو نمایاں شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔ پہلی شکل میں افعال و اسما کا اختتام عام طور سے الف (ا) پر ہوتا ہے اور دوسری شکل میں واؤ (و) پر۔ اس لیے مغربی ہندی کی پانچ بولیوں کھڑی بولی، ہریانوی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا

ہے۔مغربی ہندی کی بولیوں کا وہ گروہ جن میں اسما، ضمائر، صفات اور افعال کا خاتمہ الف (ا) پر ہوتا ہے ان میں ہریانی اور کھڑی بولی شامل ہیں جب کہ مغربی ہندی کی بولیوں کا وہ گروہ جن میں اسما، ضمائر، صفات اور افعال کا خاتمہ واؤ (و) پر ہوتا ہے ان میں برج بھاشا' بندیلی اور قنوجی شامل ہیں۔مغربی ہندی کی بولیوں میں کچھ ایسی صوتی، صرفی اور نحوی خصوصیات ہیں جس کی بنا پر یہ دوسری بولیوں سے مختلف اور ممتاز ہیں۔ان بولیوں کا رجحان تفصیلی یا تحلیلی ہے۔یہ رجحان کھڑی بولی میں سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔

مغربی ہندی کی ایک اہم بولی کھڑی ہے۔کھڑی بولی دہلی اور اس کے اطراف کی بولیوں میں ایک اہم بولی ہے۔یہ دہلی کے شمال مشرق کی بولی ہے جس کا علاقہ جمنا پار کرتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔جمنا کے مشرق میں دریائے گنگا ہے اس لیے اس علاقے کو بالائی دوآبہ کہا جاتا ہے۔گنگا کے مشرق اور مغرب میں کھڑی بولی کا خاص علاقہ ہے جو مغربی اتر پردیش کے کئی اضلاع پر مشتمل ہے۔گریرسن نے کھڑی بولی کی دو شکلوں کی نشاندہی کی ہے۔اس کی ایک شکل گنگا کے مشرقی جانب مراد آباد، بجنور، رام پور اضلاع میں بولی جاتی ہے۔اور اس کی دوسری شکل گنگا کے مغرب میں میرٹھ، مظفر نگر اور سہارن پور کے اضلاع کی بولی ہے۔ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے مغربی روہیل کھنڈ کے اضلاع بجنور، مراد آباد اور رام پور کی کھڑی بولی کو معیاری اردو سے قریب ترین قرار دیا ہے۔کھڑی بولی دوسری بولیوں کے مقابلے میں قدیم ترین ہے۔یہ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہی میرٹھ اور اس کے مضافات میں بولی جاتی تھی۔اس بولی کی جھلک اپ بھرنش کی قدیم ترین تصنیفات میں ملتی ہے۔کھڑی بولی کی سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اردو جو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے' براہ راست کھڑی بولی سے تعلق رکھتی ہے۔یہ کھڑی بولی کا ہی نکھرا ہوا روپ ہے اور اسی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

مغربی ہندی کی ایک اور بولی ہریانوی ہے جو دہلی کے شمال مغرب میں واقع ہریانہ صوبہ میں بولی جاتی ہے۔ہریانوی کو ''بانگڑو'' بھی کہتے ہیں۔ہریانہ کے علاوہ دہلی کے اطراف میں ہریانوی بولی جاتی ہے جسے ''جاٹو'' کہتے ہیں کیونکہ اس کے بولنے والوں میں جاٹوں کی اکثریت ہے۔ہریانہ کے اضلاع رہتک، حصار اور کرنال خالص ہریانوی کے علاقے ہیں۔ہریانوی مغربی ہندی کی دوسری اہم بولی ہے جس نے اردو کی ابتدا اور ارتقا میں بنیاد کا کام کیا ہے۔دہلی اور نواحِ دہلی کی جن بولیوں سے اردو سب سے زیادہ متاثر ہوئی ان میں ہریانوی بھی ہے۔

برج بھاشا کو مغربی ہندی کی نمائندہ بولی مانا جاتا ہے۔یوں تو مغربی ہندی کی سبھی بولیوں کا رشتہ شورسینی اپ بھرنش سے ہے لیکن ان میں برج بھاشا کو فوقیت حاصل ہے اور یہ شورسینی اپ بھرنش کی سچی جانشین کہی جاتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ برج بھاشا مغربی ہندی کی دیگر چار بولیوں کے مقابلے میں شورسینی پراکرت اور شورسینی کی مجموعی خصوصیات کی زیادہ حامل رہی ہے۔اس بولی کا مرکز متھرا ہے جو ہندو مذہب اور تہذیب کا قدیم مرکز رہا ہے۔برج بھاشا ادبی زبان کا درجہ رکھتی تھی۔برج بھاشا کا تعلق بھگتی تحریک سے رہا ہے۔شورسینی اپ بھرنش کی طرح اس کی سچی جانشین برج کے اثرات بھی ملک گیر تھے۔برج بھاشا اپنے عروج پر تب پہنچی جب مغل بادشاہ اکبر نے دارالسلطنت دہلی سے آگرہ منتقل کیا۔اس وقت برج بھاشا کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔برج بھاشا کا علاقہ مغربی ہندی کی دوسری بولیوں کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔یہ جن اضلاع کی خاص بولی ہے ان میں بلند شہر، متھرا اور آگرہ شامل ہیں۔اردو کے ارتقا میں برج کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مغربی ہندی کی ایک اور بولی قنوجی ہے۔اس بولی کا نام قنوج شہر کی مناسبت سے قنوجی رکھا گیا ہے۔قنوج ایک تاریخی شہر ہے جس کا ذکر رامائن جیسی قدیم کہانی میں ملتا ہے۔یہ شہر یوپی کے فرخ آباد ضلع میں واقع ہے۔قنوجی آج بھی ایٹہ، فرخ آباد اور شاہجہاں پور میں بولی جاتی ہے۔برج اور قنوجی کی قواعد میں کئی مماثلیں ہیں اور ان دونوں میں گہرا لسانیاتی رشتہ بھی ہے۔مغربی ہندی کی بولی بندیلی کا تعلق بندیل کھنڈ سے ہے۔یوپی کے باندا، ہمیر پور، جالون، جھانسی اضلاع اور مدھیہ پردیش کے چند شمالی اضلاع بندیل کھنڈ کے علاقے میں شامل ہیں۔اس بولی میں عوامی ادب کا وسیع سرمایہ موجود ہے۔بندیلی کے عوامی ادب میں آلھا اودل کے منظوم رزمیہ قصے بہت مشہور اور مقبول ہیں جنہیں شمالی اور مشرقی ہندوستان کے علاقوں آج بھی پسند کیا جاتا

ہے۔اس طرح مغربی ہندی کی یہ سبھی پانچ بولیاں جدید ہندآریائی دور کی اہم بولیاں ہیں جنہوں نے شمالی ہندوستان کی کئی جدید زبانوں کی ابتدا اور ارتقا میں اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ آج بھی اپنے اپنے علاقوں میں بولی جاتی ہیں۔

2.5 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

1۔ مغربی ہندی کا مفصل تعارف پیش کیجیے۔

2۔ مغربی ہندی کی ساخت اور اس کے علاقے پر روشنی ڈالیے۔

3۔ مغربی ہندی کی تین بولیوں کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

1۔ گریرسن نے مشرقی ہندی اور مغربی ہندی میں کن بولیوں کو شامل کیا ہے؟

2۔ مغربی ہندی اور شورسینی اپ بھرنش کے رشتے پر ایک نوٹ لکھیے۔

3۔ کھڑی بولی کی خصوصیات اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

4۔ برج بھاشا کو مغربی ہندی کی نمائندہ بولی کیوں کہا جاتا ہے، لکھیے۔

5۔ اردو کا تعلق مغربی ہندی کی کن بولیوں سے ہے؟ بیان کیجیے۔

2.6 فرہنگ

الفاظ	معنی
ساخت	بناوٹ
مماثلت	یکسانیت، مشابہت، مانند ہونا
باہم	آپس میں
صوتی	آواز سے متعلق، علم صوت سے متعلق
صرفی	صرف سے متعلق (علم صرف میں حروف وحرکات کے تغیر وتبدل، کلمات کے بنانے کے قاعدے، اسم اور فعل کی صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے)
نحوی	علم نحو سے متعلق (جس میں کلمات کو ترتیب دینے اور ان کو جدا جدا کرنے کے طور طریق معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک کلمے کا دوسرے کلمے سے ربط وتعلق کیا ہے)
پیرامنش	گرد، اطراف
ہندوی	ہندوستان سے تعلق رکھنے والی زبان
جنم	پیدائش
مصوتے	Vowels، حروف علت جیسے الف، و، ی

مصمتے	Consonent، حروف صحیح جیسے ب، ج، د، ر، ک وغیرہ
لنگوا فرینکا	کسی ملک کے مختلف علاقوں بولی اور سمجھی جانے والی زبان، کسی ملک کے وسیع علاقے میں رابطے کی زبان، بین الاقوامی زبان
مدھیہ دیش	وسطی علاقہ، ملک کا مرکزی خطہ
تحلیلی	تجزیاتی
رائج	جس کا رواج ہو، جس کا چلن ہو
لاحقہ	لفظ کے آخر میں اضافہ کرنا، کسی لفظ کے آخر میں چند حروف شامل کر کے نیا لفظ بنانا جیسے قلم کے ساتھ دان کا لاحقہ لگا کر قلمدان
ورنا کلر	مقامی زبان
فصیح	خوش کلامی، خوش بیانی
جانشین	قائم مقام، کسی کی جگہ پر بیٹھنے والا
مشابہ	مانند، مثل، نظیر، ہم شکل، یکساں
ضمائر	ضمیر کی جمع، مختصر اسم
دوآبہ	دو دریاؤں کا درمیانی علاقہ، گنگا اور جمنا کے بیچ کا علاقہ
معکوسی مصمتے	دراوڑی زبان کی آوازیں جیسے ٹ، ڈ، ڑ وغیرہ
رزمیہ	رزم سے متعلق، جنگ کا قصہ
فوقیت	برتری، غلبہ
گروہ	زمرہ، درجہ، گروپ
مقدس	محترم، عزت اور بزرگی کا حامل
خاندان السنہ	زبانوں کا خاندان

2.7 سفارش کردہ کتابیں

1۔	اردو کی لسانی تشکیل	مرزا خلیل احمد بیگ
2۔	اردو زبان کی تاریخ	(مرتبہ) مرزا خلیل احمد بیگ
3۔	مقدمہ تاریخ زبان اردو (آٹھواں ایڈیشن)	مسعود حسین خاں
4۔	ہندوستانی لسانیات	ڈاکٹر محی الدین قادری زور
5۔	اردو زبان: تاریخ، تقدیر، تشکیل	مسعود حسین خاں
6۔	مضامین مسعود	مسعود حسین خاں
7۔	ہند آریائی اور ہندی	سنیتی کمار چٹرجی مترجم عتیق احمد صدیقی

8۔	ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	احتشام حسین
9۔	اردو لسانیات	ڈاکٹر شوکت سبزواری
10۔	اردو زبان کا ارتقا	ڈاکٹر شوکت سبزواری
11۔	داستانِ زبانِ اردو	ڈاکٹر شوکت سبزواری
12۔	لسانی مطالعے	گیان چند جین
13۔	اردو ساخت کے بنیادی عناصر	نصیر احمد خاں
14۔	پنجاب میں اردو	حافظ محمود شیرانی
15۔	زبان اور علم زبان	عبدالقادر سروری
16۔	جدید اردو لسانیات	امیر اللہ خان شاہین

دوسرا باب : اردو زبان کے آغاز وارتقا کے نظریات

اکائی 3 اردو کی ابتدا سے متعلق غیر ماہر لسانیات کے نظریات:
سید سلیمان ندوی، محمود شیرانی اور نصیرالدین ہاشمی کے نظریات

اکائی کے اجزا

3.0 مقصد

3.1 تمہید

3.2 اُردو زبان کا آغاز وارتقا : مختلف نظریات

3.3 سید سلیمان ندوی کا نظریہ

3.4 حافظ محمود شیرانی کا نظریہ

3.5 نصیرالدین ہاشمی کا نظریہ

3.6 خلاصہ

3.7 نمونۂ امتحانی سوالات

3.8 فرہنگ

3.9 سفارش کردہ کتابیں

3.0 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبا کو اردو زبان کے آغاز وارتقا کے مختلف نظریات سے متعارف کروانا ہے۔اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ

☆ اردو زبان کی پیدائش کے بارے میں واقف ہوسکیں۔

☆ اردو زبان کی ابتدا کے علاقے اور عہد کے متعلق معلومات کا جائزہ لے سکیں۔

☆ اردو زبان کے آغاز کے اہم نظریات سے واقف ہو سکیں۔

☆ اردو زبان کی پیدائش سے متعلق سلیمان ندوی، محمود شیرانی اور نصیر الدین ہاشمی کے نظریات سے واقف ہو سکیں۔

3.1 تمہید

گزشتہ اکائیوں میں آپ نے زبانوں کے مختلف خاندانوں کے بارے میں پڑھا۔ آپ نے یہ بھی پڑھا کہ اردو زبان کا تعلق ہند یوروپی خاندان کی ایک شاخ ہند آریائی سے ہے اور اسی ہند آریائی کی ایک زبان شورسینی اپ بھرنش سے اردو زبان کا براہ راست تعلق ہے۔

اس اکائی میں آپ اردو زبان کے آغاز وارتقا کے مختلف نظریات کے بارے میں پڑھیں گے۔ اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں اردو کے مختلف عالموں نے اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ ان علما نے بڑے خلوص سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اردو زبان کب، کہاں اور کیسے پیدا ہوئی۔ تیرہویں صدی سے بیسویں صدی تک اردو کے کئی شاعروں اور ادیبوں نے اردو کی ابتدا کے بارے میں الگ الگ رائیں پیش کی ہیں۔ لیکن سبھی علما اس بات پر متفق ہیں کہ اردو کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی۔ بیسویں صدی میں علم زبان یعنی لسانیات کا فروغ ہوا۔ ماہرین لسانیات نے لسانیات کی روشنی میں اردو کے آغاز و ارتقا کے مسئلے پر خالص علمی انداز میں اپنے نظریات پیش کیے۔ ماہرین لسانیات کے نظریات کے علاوہ کئی ایسے عالموں کے نظریات بھی مشہور ہوئے جو لسانیات کے ماہر نہیں تھے۔ ان میں سلیمان ندوی، محمود شیرانی اور نصیر الدین ہاشمی کے نظریات اہم ہیں۔ اس اکائی میں آپ ان نظریات کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

آپ کی آسانی کے لیے اس اکائی کا خلاصہ اور امتحانی سوالات کے نمونے دیے گئے ہیں۔ فرہنگ میں نئے الفاظ کے معنی اور مزید مطالعے کے لیے سفارش کردہ کتابوں کی فہرست بھی دی گئی ہے۔

3.2 اُردو زبان کا آغاز وارتقا : مختلف نظریات

اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے بارے میں اردو کے متعدد عالموں نے اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ ان کا سلسلہ حضرت امیر خسرو (متوفی 1325) سے شروع ہوتا ہے۔ مشہور ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے امیر خسرو کو اردو کا پہلا زبان شناس قرار دیا ہے۔ امیر خسرو کی تحریروں میں اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں واضح اشارے ملتے ہیں۔ لیکن اردو زبان کے آغاز و ارتقا پر با قاعدہ نظریات انیسویں اور بیسویں صدی میں سامنے آتے ہیں۔ انیسویں صدی میں سب سے پہلے میر امّن دہلوی (1803-1732) نے اردو زبان کو ایک مخلوط زبان قرار دیا جو مختلف زبانوں کے میل جول سے مل کر بنی ہے۔ میر امن نے قصۂ چہار درویش کا آسان ترجمہ ''باغ و بہار'' کے نام سے کیا۔ یہ کتاب فورٹ ولیم کالج سے 1803 میں شائع ہوئی۔ میر امن نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

> ''۔۔۔ جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے، تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم، قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سن کر حضور میں آ کر جمع ہوئے، لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف، سوال جواب کرتے، ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔'' (باغ و بہار، ص 8-7)

میر امن کا یہ نظریہ بہت مشہور ہوا اور اس کے مطابق ایک مدت تک اردو کو ایک مخلوط زبان قرار دے کر اس کے آغاز کا زمانہ عہد مغلیہ تسلیم کیا جاتا رہا۔ میر امن کے نظریے سے متاثر ہو کر سر سید احمد خاں، امام بخش صہبائی اور سید احمد دہلوی جیسے اردو کے علما نے اپنے نظریات پیش کیے۔

انیسویں صدی کے معروف شاعر انشاء اللہ خاں انشا (م 1817) نے اردو کو عربی، فارسی، ترکی اور برج بھاشا زبانوں کے میل جول کا نتیجہ قرار

دیا ہے۔ امام بخش صہبائی (م 1857-1802) کا خیال ہے کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے جو تبدیل ہوتی ہوئی شاہ جہاں کے عہد میں اپنی اصل شکل حاصل کرتی ہے۔سرسید احمد خاں (م1897) کا بھی یہی خیال ہے کہ اردو زبان کا مکمل روپ شاہ جہاں کے عہد حکومت میں سامنے آیا۔سید احمد دہلوی (م1918) نے اپنی مشہور تصنیف فرہنگ آصفیہ کے مقدمہ میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اردو کی پیدائش شاہجہاں کے عہد میں ہوئی جس نے برج بھاشا سے بعد میں اردو کی شکل اختیار کی۔

میر امن کے بعد محمد حسین آزاد (1910-1828) کا یہ نظریہ سب سے زیادہ مشہور ہوا کہ اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔آزاد نے اپنی شاہکار تصنیف ''آب حیات'' (1888) میں لکھا ہے:

> ''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری زبان اردو برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا ہندوستانی زبان ہے۔لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو۔اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے۔'' (آب حیات' ص6)

آزاد کا یہ نظریہ بہت مقبول ہوا۔حکیم شمس اللہ قادری نے بھی اپنی تصنیف ''اردوئے قدیم'' میں اردو کی ابتدا برج سے تسلیم کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مسلمانوں کے اثر سے برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ داخل ہونے لگے جس کے باعث اس میں تغیر شروع ہوا جو روز بہ روز بڑھتا گیا' اور ایک عرصے کے بعد اردو کی صورت اختیار کر لی۔'' (اردوئے قدیم' ص76)

محمد حسین آزاد کے نظریے کی تائید اور تردید میں کئی مصنفین نے اپنے نظریات پیش کیے اور اردو زبان کے آغاز و ارتقا پر از سرِ نو غور و فکر کا سلسلہ شروع ہوا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ آزاد کے نظریے نے یہ ثابت کیا کہ اردو ایک مخلوط زبان ہونے کے باوجود ہندوستانی زبان ہے کیونکہ یہ برج بھاشا سے نکلی ہے جو خالص ہندوستانی زبان ہے اور اس طرح اردو کی جائے پیدائش ہندوستان ہے۔اس نظریے کے بعد اردو کے محققین اردو زبان کے ماخذ کے سلسلے میں ہندستانی زبانوں کو اہمیت دینے لگے اور ایسے نظریات سامنے آئے جن میں اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے رشتے ہندوستان کے مختلف علاقوں اور مختلف زبانوں سے دریافت کرنے کی کوشش کی گئی۔اس سلسلے میں سندھ، پنجاب، دکن، گجرات، مہاراشٹر اور بہار میں اردو کی جائے پیدائش کے نظریات سامنے آئے۔سید سلیمان ندوی نے نقوش سلیمانی میں لکھا ہے:

> ''یہ مخلوط زبان (اردو) سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ دار زبانوں سے مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی۔'' (نقوش سلیمانی' ص25)

اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے سلسلے میں مذکورہ تمام نظریات میں جزوی صداقت موجود ہے۔لسانیات کی روشنی میں ان کی حیثیت تاریخی زیادہ ہے، تحقیقی اور علمی کم ہے۔اس حقیقت کے باوجود یہ تمام نظریات اردو زبان کے آغاز و ارتقا کی تلاش کے تاریخی سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس اکائی میں ہم اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے تین اہم نظریات کے بارے میں تفصیلی مطالعہ کریں گے۔ یہ نظریات سید سلیمان ندوی، محمود شیرانی اور نصیرالدین ہاشمی نے پیش کیے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ ''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری زبان اردو برج بھاشا سے نکلی ہے''، یہ کس کا قول ہے؟

2۔ انشاءاللہ خاں انشا نے اردو کو کن زبانوں کے میل جول کا نتیجہ قرار دیا ہے؟

3۔ اردو کی پیدائش کے بارے میں میر امّن کا نظریہ کیا ہے؟

3.3 سید سلیمان ندوی کا نظریہ

سید سلیمان ندوی (1884-1954) اردو کے بڑے عالم اور مؤرخ تھے۔ اسلامی تاریخ ان کی تحقیق اور تصنیف کا خاص میدان تھا۔ انھوں نے تاریخ اور سیرت پر کئی کتابیں ترتیب دی ہیں۔ ان میں عرب و ہند کے تعلقات، سیرۃ النبی، رحمت عالم، سیرۃ عائشہ اور بہادر خواتین اسلام وغیرہ اہم کتابیں ہیں۔ ان کے خطبات، مقالات اور مقدمات کا مجموعہ ''نقوش سلیمانی'' 1939ء میں معارف پریس اعظم گڑھ سے شائع ہوا۔ ''نقوش سلیمانی'' میں وہ خطبات اور مقالات بھی شامل ہیں جن سے اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے مسائل پر سلیمان ندوی کے خیالات و نظریات سے واقفیت فراہم ہوتی ہے۔ سلیمان ندوی نے اس کے مقدمے میں کتاب کی اہمیت کی وجہ خود بیان کی ہے۔

> ''یہ پہلی کتاب ہے جس میں سب سے پہلے اردو کے مولد کے تعین و تشخیص کے باب میں سندھ اور ملتان کی نشان دہی کی گئی، اور یہ اشارات سب سے پہلے 1915ء کے اجلاس اردو کے خطبۂ صدارت میں کیے گئے، پھر بعد کے خطبوں اور مقالوں میں ان پر مزید روشنی ڈالی جاتی رہی۔'' (نقوش سلیمانی، ص 7)

سلیمان ندوی نے 1915 کا یہ خطبہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ ترقی اردو کے اجلاس (پونا) میں دیا تھا۔ اس خطبے میں انھوں نے اردو کو ایک مخلوط زبان قرار دیا جو باہمی میل جول کا نتیجہ تھی۔

> ''ایک ایسا ملک جو مختلف نسلوں، مختلف قوموں، مختلف زبانوں کا مجموعہ تھا، ناگزیر ہے کہ وہاں باہمی میل جول کے بعد ایک زبان پیدا ہو، وہ پیدا ہوئی اور اسی کا نام اردو ہے۔'' (ایضاً، ص 5)

اس وقت تک عام خیال یہ تھا کہ اردو کی پیدائش دہلی اور دوآبۂ گنگ و جمن کے علاقے میں ہوئی۔ اس کے علاوہ اردو کی ابتدا کا زمانہ عہد مغلیہ کو مانا جاتا تھا۔ سلیمان ندوی ان خیالات کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''مسلمان عربی اور فارسی زبان لے کر ہندوستان آئے۔ اس پر دو سو برس بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ ایک مشترک زبان یہاں پیدا ہوگئی۔ اردو شاہ جہاں کے عہد کی یادگار بتائی جاتی ہے لیکن اصل یہ ہے کہ غوریوں، خلجیوں اور تغلقوں ہی کے زمانہ میں یہ پیدا ہو چکی تھی۔'' (ایضاً، ص 6)

اردو زبان کی ابتدا کے زیادہ تر نظریات اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جب مسلمان ہندوستان آئے تو ان کا مقامی ہندوؤں سے میل جول بڑھا جس کے نتیجے میں اردو پیدا ہوئی۔ سلیمان ندوی نے اسی عام خیال کو ذہن میں رکھ کر یہ قیاس آرائی کی کہ اردو سندھ میں پیدا ہوئی۔

> ''مسلمان سب سے پہلے سندھ پہنچتے ہیں اس لیے قرین قیاس یہ ہے کہ جس کو آج ہم اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادیٔ سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔'' (ایضاً، ص 31)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمان حکمران کی شکل میں سب سے پہلے سندھ میں آئے۔ محمد بن قاسم نے 712ء میں سندھ کو فتح کر کے اسے اسلامی مملکت کا ایک صوبہ بنایا۔ مسلمان بڑی تعداد میں تجارت اور مذہبی تبلیغ کی غرض سے یہاں آئے اور آباد ہو گئے۔ یہ مسلمان تقریباً تین سو سال تک یہاں قیام پذیر رہے۔ اس طویل عرصے میں مسلمانوں اور مقامی باشندوں کے معاشرتی تعلقات قائم ہوئے اور انھیں مشترک زبان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسی تاریخی عمل کو ذہن میں رکھ کر سلیمان ندوی نے یہ قیاس آرائی کی کہ یہ مشترک زبان اردو ہو سکتی ہے۔ انھوں نے کئی عرب سیاحوں کے سفرناموں سے شہادتیں فراہم کی ہیں اور ان کی بنیاد پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ عربی فارسی کا میل جول ہندوستان کے جس حصے میں پہلے واقع ہوا وہ سندھ ہے، اس لیے سندھ کی وادی ہماری متحدہ زبان کا پہلا گہوارہ تھی۔ سلیمان ندوی نے اردو کے آغاز کے سلسلے میں کئی ایسے بیانات بھی دیے ہیں جن سے ان کے ہی نظریے

کی تردید ہوتی ہے۔ایک جگہ لکھتے ہیں:

''یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات، اودھ، دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ دار زبان سے مل کر ہر صوبہ میں الگ الگ پیدا ہوئی۔'' (ایضاً' ص56)

لسانیات کی روشنی میں اگر سلیمان ندوی اس نظریے کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ سندھ میں سب سے پہلے پہنچنے والے مسلمان عرب تھے اور عربی ان کی زبان تھی۔عربی کا تعلق زبانوں کے سامی خاندان سے ہے۔جبکہ سندھی اور اردو ہند آریائی خاندان کی زبانیں ہیں۔اس لیے سامی اور آریائی خاندان کے میل سے کسی آریائی زبان کی پیدائش ممکن نہیں ہے۔ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے سلیمان ندوی کے اس نظریے کی تردید کی ہے۔انھوں نے لکھا ہے:

''سید سلیمان ندوی نے اردو کے پہلے ہیولے کے سندھ میں بننے کا ذکر کیا ہے وہ کسی طرح صحیح نہیں ہے۔اس لیے عربی، فارسی الفاظ کا ہندوستان کی کسی زبان میں داخلہ اردو زبان کی تشکیل کی ضمانت نہیں کرتا۔سندھی، ہند آریائی ہوتے ہوئے بھی اردو یا ہندی سے مختلف ہے۔قدیم سندھی میں عربی الفاظ کے داخلے سے جدید سندھی وجود میں آئی نہ کہ اردو۔اس جدید سندھی اور اردو کے درمیان اشتراک صرف عربی رسم الخط، اسما اور روایات شعر کا ہے۔''

(مضمون اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا کا مسئلہ، مشمولہ ''اردو زبان کی تاریخ'' مرتبہ مرزا خلیل بیگ ص86-85)

کسی زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں ماہر لسانیات کی رائے ہی قابل قبول ہوسکتی ہے اس لیے سلیمان ندوی کا یہ نظریہ کہ مسلمان سب سے پہلے ہندوستان کی سرزمین پر صوبۂ سندھ میں آئے اور وہاں کی مقامی زبان سے عربی کے میل جول کے نتیجے میں اردو کی پیدائش ہوئی، محض ایک قیاس ہے نہ کہ ایک لسانی نظریہ۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ مسلمان سندھ میں کب آباد ہوئے؟

2۔ سلیمان ندوی کے مطابق اردو کا پہلا ہیولیٰ کہاں بنا؟

3۔ مسعود حسین خاں نے سلیمان ندوی کے نظریے کی کس طرح تردید کی ہے؟

3.4 حافظ محمود شیرانی کا نظریہ

اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں ایک اہم نظریہ حافظ محمود شیرانی (1946-1880) کا ہے۔ یہ نظریہ انھوں نے اپنی مشہور کتاب ''پنجاب میں اردو'' (1928) میں پیش کیا۔اس کتاب میں محمود شیرانی اردو کی جائے پیدائش پنجاب قرار دیتے ہیں کیونکہ مسلمانوں نے ہندوستان میں سب سے پہلے طویل عرصے کے لیے یہیں بود و باش اختیار کی تھی۔کتاب کے مقدمے میں اردو کی قدامت کے بارے میں محمود شیرانی لکھتے ہیں:

''ہم اردو کے آغاز کو شاہ جہاں یا اکبر کے دربار اور لشکر گاہوں کے ساتھ وابستہ کرنے کے عادی ہیں۔لیکن یہ زبان اس زمانہ سے بہت زیادہ قدیم ہے۔ بلکہ میرے خیال میں اس کا وجود ان ہی ایام سے ماننا ہوگا جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں۔'' (پنجاب میں اردو، مقدمہ)

محمود شیرانی نے جن تاریخی عوامل پر اپنے نظریے کی بنیاد رکھی ہے وہ یہ ہیں کہ غزنی کے مسلم حکمراں محمود غزنوی نے 1027ء تک لگاتار سترہ حملوں کے بعد سرزمین پنجاب پر اپنی حکومت قائم کی۔اس فتح کے بعد مسلمان جن کی زبان فارسی تھی پنجاب میں آباد ہو گئے۔ پنجاب میں مسلمان تقریباً دوسو

برسوں تک رہے اور محمد غوری کے حملوں (1192) کے بعد دہلی ہجرت کی۔ پنجاب میں مسلمانوں کے طویل قیام کی مدت میں مقامی باشندوں سے گہرے سماجی رشتے قائم ہونا فطری بات ہے۔ سماجی تعلقات کے لیے مشترک زبان کی ضرورت پیش آئی اور ایک نئی زبان نے جنم لیا۔ جب مسلمانوں نے پنجاب سے دہلی ہجرت کی تو یہ نئی زبان بھی ان کے ساتھ آئی۔ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ پنجاب سے مسلمان جس زبان کو دہلی لائے وہ پنجابی نما اردو یا اردو نما پنجابی ہوسکتی ہے۔ یہی زبان دہلی کی فتح کے بعد اردو کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں۔'' (ایضاً' صفحہ ب)

محمود شیرانی ان سیاسی اور تاریخی حالات سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو کی پیدائش سب سے پہلے پنجاب میں ہوئی اور اردو پنجابی کی قدیم شکل سے نکلی ہے۔ اپنے نظریے کی تائید میں انھوں نے پنجابی اور قدیم اردو کی مشترک لسانی خصوصیات پر اس کتاب میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ دکن میں دکنی کے نام سے فروغ پانے والی زبان یہی قدیم اردو تھی۔ یہ زبان دہلی سے متعدد فوجی حملوں کے نتیجے میں دکن پہنچی تھی۔ فتح دہلی (1193) کے بعد علاء الدین خلجی (م1316) نے دکن میں دیوگری 1294 میں فتح کیا۔ اس کے بعد علاء الدین خلجی کے سپہ سالار ملک کافور نے دکن کے علاقوں پر کامیاب حملے کیے۔ 1351 میں محمد تغلق (م1351) نے اپنا پایۂ تخت دولت آباد (دیوگری) کو بنایا اور دہلی کی تمام آبادی کو دولت آباد منتقل ہونے کا حکم دیا۔ علاء الدین خلجی، ملک کافور اور محمد تغلق کی فوجی مہمات اور دہلی کی آبادی کے دکن منتقل ہونے کی وجہ سے اردو زبان کو دکن میں بہت ترقی ہوئی اور اس زبان میں ادب تخلیق ہونے لگا۔ محمود شیرانی نے اس قدیم اردو یعنی دکنی اردو اور پنجابی کے درمیان صوتی، صرفی اور نحوی اعتبار لسانی رشتے تلاش کیے ہیں۔ مثلاً پنجابی اور اردو میں علامت مصدر (نا) کا مشترک ہونا، الفاظ کے آخر میں نون غنہ کا ہونا، فعل کا تذکیر و تانیث اور واحد جمع میں اپنے فاعل کے مطابق آنا وغیرہ۔ انھوں نے ان لسانی اشتراک کی مثالوں کو اپنے نظریے کی تائید میں بہ طور دلیل پیش کیا ہے۔ دکنی اور پنجابی کے صرف و نحو کے تقابلی مطالعے سے محمود شیرانی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اردو کی جائے پیدائش پنجاب ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''گذشتہ سطور کے مطالعے سے ہم پر یہ امر واضح ہوگیا ہے کہ اردو اور پنجابی کی صرف کا ڈول تمام تر ایک ہی منصوبہ کے زیر اثر تیار ہوا ہے۔ ان کی تذکیر و تانیث اور جمع اور افعال کی تعریف کا اتحاد اسی ایک نتیجے کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے اور جب سیانی ہوگئی ہیں تب ان میں جدائی واقع ہوئی ہے۔'' (پنجاب میں اردو، ص99)

محمود شیرانی نے اردو زبان کے آغاز کے مسئلے پر جس تفصیل سے تجزیاتی اور مدلل بحث کی ہے وہ ان سے قبل کسی اور محقق نے نہیں کی۔ ان کا نظریہ بہت مشہور ہوا اور اس سے اردو زبان کے آغاز پر نئی بحث کا آغاز ہوا۔ ان کے نظریے نے اردو زبان کے کئی محققین کو متاثر کیا جن میں محی الدین قادری زور اور سنیتی کمار چٹرجی جیسے ماہرین لسانیات بھی شامل ہیں۔ لیکن ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے لسانیات کی روشنی میں محمود شیرانی کے نظریے کی تردید کی ہے۔ ان کے مطابق محمود شیرانی نے قدیم دور میں پنجابی کی جن خصوصیات کا ذکر کیا ہے وہ سب اس عہد کی ہریانی میں بھی موجود تھیں لیکن انھوں نے اسے نظر انداز کیا۔ گیان چند جین نے بھی محمود شیرانی کے نظریے کی تنقید کرتے ہوئے یہ نشاندہی کی ہے کہ ان کے بیان میں تضاد پایا جاتا ہے۔ شیرانی کے ایک قول کے مطابق اردو دہلی اور میرٹھ میں بنتی ہے جب کہ دوسرے قول کے مطابق مسلمان اسے پنجاب سے لائے۔ محمود شیرانی نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ان کا نظریہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے بلکہ اس سے قبل شیر علی سرخوش اپنے تذکرے ''اعجاز سخن'' (1923) میں ''اردو پنجاب سے نکلی'' کے موضوع پر اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے تھے۔ انھوں نے نہایت صاف گوئی سے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ ان کے نظریے کے حق میں کوئی سند نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس نظریے کے ثبوت میں گرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم شہادت یا سند نہیں۔لیکن سیاسی واقعات، اردو زبان کی ساخت، نیز دوسرے حالات ہمیں اسعقیدہ کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔'' (پنجاب میں اردو، مقدمہ صفحہ ج)

آپ جدید ہندآریائی زبانوں کی پیدائش کا مطالعہ کر چکے ہیں۔جدید ہندآریائی کی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ پنجابی اور اردو دونوں ہی جدید ہندآریائی زبانیں ہیں۔سبھی جدید آریائی زبانوں کے آغاز وارتقا کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے۔اس صورت میں پنجابی سے اردو کا رشتہ ماں بیٹی کا نہیں بلکہ بہنوں کا ہوسکتا ہے۔اس لیے لسانیات کے نقطۂ نظر سے محمود شیرانی کا نظریہ قابل قبول نہیں ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ محمود شیرانی کے مطابق اردو کی پیدائش کہاں ہوئی؟

2۔ محمود شیرانی نے کن تاریخی عوامل پر اپنے نظریے کی بنیاد رکھی ہے؟

3۔ مسعود حسین خاں نے محمود شیرانی کے نظریے کے رد میں کیا کہا؟

3.5 نصیرالدین ہاشمی کا نظریہ

نصیرالدین ہاشمی (1964-1895) اردو کے مشہور محقق، مؤرخ اور ادیب تھے۔انھوں نے دکنی ادب پر بہت کام کیا ہے۔دکنیات کے حوالے سے انھوں نے کئی کتابیں مرتب کی ہیں۔ان میں ''سلاطین دکن کی ہندوستانی شاعری'' (1922)، ''دکن میں اردو'' (1923)، ''مدراس میں اردو'' (1928)، ''دکنی ہندو اور اردو'' (1956) اہم ہیں۔''دکن میں اردو'' ان کی سب سے مشہور کتاب ہے جو چھ صدیوں پر محیط دکن کے ادب کا احاطہ کرتی ہے۔اس کتاب کا موضوع دکن میں اردو ادب کی تاریخ ہے جس میں دکنی ادب کی خدمات کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے۔کتاب کے ابتدائی صفحات میں نصیرالدین ہاشمی نے اردو کی ابتدا کے بارے میں چار مختلف نظریات کا جائزہ لیا ہے۔اس فہرست میں انھوں نے پنجاب، سندھ اور دوآبۂ گنگ وجمن کے علاوہ دکن میں اردو کی ابتدا کو بھی ایک نظریہ کے طور پر شامل کیا ہے۔وہ سندھ اور دکن میں اردو کی ابتدا کے بارے لکھتے ہیں:

> ''یہ امر تقریباً تصفیہ شدہ ہے کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی ہے۔اس لیے جن اصحاب کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کی ابتدا سندھ اور دکن سے ہوئی وہ ایک حد تک غلط نہیں ہوسکتا، کیوں کہ مسلمانوں کی آمد سب سے پہلے ان ہی مقامات پر ہوئی۔'' (دکن میں اردو، ایڈیشن 1985 ص 33)

لیکن بعد میں وہ اس نظریے کی تردید میں یہ کہتے ہیں کہ سندھ کے فاتحوں کی زبان عربی تھی، اس لیے وجود میں آنے والی زبان کو عربی اور شورسینی سے مشترک ہونا چاہیے تھا۔لیکن ایسا نہیں ہے اور اس میں فارسی کا حصہ زیادہ ہے۔اس لیے یہ بات تسلیم نہیں کی جاسکتی ہے کہ اردو کی ابتدا سندھ سے ہوئی۔

نصیرالدین ہاشمی نے دکن میں اردو کی ابتدا کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ عرب سے مسلمان تجارت اور دین کی تبلیغ کے لیے سندھ کے بعد مالابار اور کرناٹک کے ساحلوں پر آئے۔اپنی جدوجہد، ملنساری اور نیک مزاجی کی وجہ سے مقامی ہندوؤں کے دلوں میں جگہ بنائی۔اس طرح وہ ملک اندر بس گئے اور اپنی حکومت قائم کی۔نصیرالدین ہاشمی نے متعدد مثالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دکن مسلمانوں کے لیے وطن کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اس لیے انھیں مقامی باشندوں سے تبادلۂ خیال کرنے کے لیے ایک نئی زبان کی ضرورت تھی۔وہ لکھتے ہیں:

> ''اب یہ امر خاص طور سے غور طلب ہے کہ جب مسلمانوں نے مدتوں دکن میں بود وباش کی اور حکومت قائم کی، تجارت کی، مذہب کی اشاعت کی، تعلیم دی۔ان کا اٹھنا بیٹھنا یہاں کے ملکی اور دیسی باشندوں کے ساتھ تھا۔ہر وقت کام کاج خرید و فروخت میں ان سے سابقہ رہتا تھا تو ظاہر ہے کہ ایک خاص زبان کا پیدا ہونا ضروری تھا، جو دونوں غیر قوموں کے لیے

تبادلۂ خیالات کا ذریعہ ہوتی۔اس لحاظ سے جو دعویٰ اردو کے دکن سے پیدا ہونے کا کیا جاتا ہے،وہ بڑی حد تک صحیح ہوسکتا ہے۔(ایضاً ص35)

نصیرالدین ہاشمی دکن میں اردو کی ابتدا کے دعویٰ کو صحیح سمجھتے ہیں اور اس کی تائید میں کئی مثالیں بھی دیتے ہیں لیکن سندھ کی طرح دکن میں اردو کی ابتدا کی تردید بھی کرتے ہیں۔جس لسانی حقیقت کے پیش نظر انھوں نے سندھ سے اردو کی ابتدا کے نظریے کو رد کیا اسی کو بنیاد بنا کر دکن میں اردو کی ابتدا سے انکار کرتے ہیں۔البتہ ان کے بیان سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ قطعی طور پر اس نظریے کو غلط نہیں سمجھتے بلکہ لسانی شواہد کے دستیاب نہ ہونے کے سبب فی الحال اس نظریے سے دست بردار ہو رہے ہیں۔وہ کہتے ہیں:

''جو امور سندھ سے اردو کی ابتدا ہونے میں مانع ہیں وہی امور یہاں بھی مانع نظر آتے ہیں۔اس لیے سرِ دست ہم دکن کو بھی اردو کا مولد نہیں قرار دے سکتے۔''(ایضاً 36)

نصیرالدین ہاشمی نے سندھ سے اردو کی ابتدا کے نظریے کو اس بنا پر رد کیا تھا کہ اردو زبان میں فارسی کا حصہ غالب ہے لہذا وہ عربی اور شورسینی کا مرکب نہیں ہوسکتی۔دکن سے اردو کی ابتدا کے نظریے کو تسلیم کرنے میں بھی یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اردو عربی اور دکن کی زبانوں کے اشتراک سے بنی ہے تو اس میں فارسی زبان کا عنصر کیوں حاوی ہے۔اس لیے دکن میں اردو کی ابتدا کا نظریہ لسانیات کی روشنی میں کسی بھی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتا۔کیونکہ عربی اور دکن کی دراوڑی زبانیں دونوں ہی ہند آریائی خاندان سے تعلق نہیں رکھتیں۔اس لیے اگر اردو میں عربی کا حصہ زیادہ ہوتا تب بھی دو مختلف لسانی خاندان کی زبانوں کے اشترک سے کسی تیسرے لسانی خاندان کی زبان اردو کا پیدا ہونا قرین قیاس نہیں۔

سندھ اور دکن کے نظریوں کے بعد نصیرالدین ہاشمی نے پنجاب سے اردو کی ابتدا کے نظریے کی تردید کی ہے۔اس نظریے کی تردید انھوں نے خالص لسانیاتی پیمانے سے کی ہے۔وہ اس نظریے کی تردید میں لکھتے ہیں:

''پنجاب میں اردو کے متعلق مؤلف ''پنجاب میں اردو'' مولانا محمود شیرانی نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے،مگر جب تک مسعود سعد سلمان کا ہندی دیوان دستیاب نہ ہو ان کی تحقیقات کو صحیح نہیں کہا جا سکتا اور جیسا کہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی رائے ہے''پنجابی زبان اردو کی ماں نہیں ہوسکتی بلکہ بہن ہوسکتی ہے۔''(ایضاً 36)

اس طرح نصیرالدین ہاشمی سندھ اور دکن کے پنجاب سے اردو کی ابتدا کے نظریے کو بھی خارج کرتے ہیں اور دوآبۂ گنگا جمنا میں اردو کی ابتدا کے نظریے کو تسلیم کرتے ہیں۔اس بارے میں وہ کہتے ہیں:

''سندھ،دکن،پنجاب کے خارج ہوجانے کے بعد اب صرف دوآبۂ گنگا جمنا باقی رہتا ہے جو اردو کے مولد ہونے کا مدعی ہوسکتا ہے۔''(ایضاً 36)

نصیرالدین ہاشمی نے کتاب میں اس نظریے کی حمایت میں تفصیل سے لکھا ہے۔وہ اس بات سے متفق ہیں کہ اردو زبان کا آغاز سب سے پہلے شمالی ہند میں ہوا اور اس کی ابتدا ہندوستانی اور بیرونی زبانوں کے اشتراک سے ہوئی۔یعنی نصیرالدین ہاشمی بھی اردو کو ایک مخلوط زبان مانتے ہیں۔کتاب کے ابتدائی صفحات ہی میں انھوں نے اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں وضاحت سے لکھا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

'' گلستانِ ہند کے شمالی چمن میں مغربی دروازوں سے باغبانوں نے آ کر اردو کا بیج بویا،گنگا اور جمنا نے آبیاری کر کے چھوٹے پودے کو اگایا۔اسی کے قریب قریب گلزار دکن میں بھی انھیں ہاتھوں نے اس بیج کو زمین میں ڈالا۔کرشنا اور گوداوری و موسیٰ درخت کے اگانے میں معاون ہوئیں۔ہنوز شمالی چمن کا درخت بارآور نہ ہوا تھا کہ دکھنی پودا زمین کی

عمدگی اور بر وقت آبیاری سے بہت جلد تر وتازہ سرسبز اور شاداب ہو گیا۔اسی اثناء میں ایک دکھنی باغبان نربدا کے اس پار جا پہنچتا ہے اور اپنے فن زراعت دانی سے شمالی چمن کے درختوں کی پرداخت کرتا ہے۔ پرانی شاخیں قطع و برید کر کے چمن کی آراستگی میں مصروف ہو جاتا ہے۔پھر تھوڑی ہی مدت میں چمن سرسبز اور درخت بارآور ہو جاتے ہیں۔چمن نئے نئے گل بوٹوں سے اپنی بہار دو بالا کر دیتا ہے۔''(ایضاً 27)

نصیرالدین ہاشمی واضح طور پر اردو کی ابتدا اور ارتقا میں تاریخی عوامل کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہ بات تاریخی اور لسانی دونوں اعتبار سے درست ہے کہ اردو کی ابتدا شمال میں اور اس کا ارتقا دکن میں ہوا۔البتہ لسانیات کی روشنی میں ان کی یہ رائے قابل قبول نہیں کہ اردو کا بیج باہر سے آنے مسلم فاتحین نے لگایا۔اردو ایک جدید ہندآریائی زبان ہے جس کی نشو ونما شورسینی اپ بھرنش سے ہوئی ہے۔مسلم فاتحوں کی زبان فارسی نے اس پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ماہر لسانیات سنیتی کمار چٹر جی نے اپنی کتاب ہندآریائی اور ہندی میں واضح کیا ہے کہ مسلمان اگر ہندوستان میں نہ آتے تو بھی جدید ہندآریائی زبانیں وجود میں آتیں لیکن زبانوں کے ادبی آغاز وارتقا میں دو ایک صدی کی تاخیر ضرور ہو جاتی۔نصیرالدین ہاشمی نے اردو زبان کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ شمال میں اردو برج کے علاقے میں اپنی ابتدائی شکل میں تھی۔علاء الدین خلجی اور محمد بن تغلق کی کی دکن پر فوج کشی کی وجہ سے یہ دکن میں آئی۔اردو کے اس ارتقائی دور پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''یہ فاتح جو زبان دکن میں لے کر آئے وہ یہاں آزادانہ نشو ونما حاصل کرنے لگی کیوں کہ اس کے مقابل کوئی اور زبان جو اس کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ پیدا کرے، یہاں نہیں تھی۔اس کے برخلاف شمال میں برج مروّج تھی جو وہاں کے دیسی باشندوں کی عام زبان تھی۔اس طرح یہ زبان جو مسلمانوں کے ساتھ دکن پہنچی عام طور سے دیسی اور پردیسی دونوں نے استعمال کی۔ یہ بات واضح ہے کہ دوآبۂ گنگا و جمنا اور دکن کے علاقوں میں بہت فاصلہ حائل ہے۔ دکن میں جدید زبان جب بولی جانے لگی تو مسافت کی دوری کی وجہ سے اس پر برج کا صرف وہی اثر باقی رہا جو سرزمین برج سے نکلنے سے قبل اس میں قائم ہو چکا تھا۔غرض کہ اس طرح اس جدید زبان کا یہاں خیر مقدم ہوا اور عام طور سے ہر شخص اسی کو بولنے لگا اور وہ کام کاج میں بھی آنے لگی۔''(ایضاً 37)

یہاں نصیرالدین ہاشمی اردو زبان کے ارتقا کے بارے میں دکن کی اولیت اور اہمیت پر زور دے رہے ہیں۔ان کی رائے یہ ہے کہ اردو زبان اپنی خام شکل میں شمال کے فاتحین کے ذریعے دکن پہنچتی ہے جہاں یہ ہر عام وخاص کی زبان بن جاتی ہے۔دکن کی ریاستیں جب مرکز سے علاحدہ ہو کر خود مختار حکومت قائم کر لیتی ہیں تو اردو یہاں آزادانہ طور پر فروغ پاتی ہے۔اس تاریخی عمل کے نتیجے میں دکن کی اردو شمال کی اردو سے مختلف صورت اختیار کر لیتی ہے۔نصیرالدین ہاشمی دکن کی اس اردو زبان اور ادب کے ارتقا کی تفصیلی تاریخ بیان کرتے ہیں۔اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں وہ کوئی نیا نظریہ نہیں پیش کرتے ہیں بلکہ دوآبہ گنگ وجمن میں اردو کی ابتدا کے نظریے کو تسلیم کرتے ہیں۔لیکن اردو زبان کی ابتدائی نشو ونما اور اس زبان میں ادب کی ابتدا اور فروغ دکن میں ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جو کہ تاریخی اور لسانی دونوں لحاظ سے صحیح ہے۔بلا شبہ نصیرالدین ہاشمی نے اپنی کتاب ''دکن میں اردو'' کے ذریعے اردو کی قدیم شکل ''دکنی اردو'' کے آغاز اور ارتقا کی جامع تاریخ پیش کی ہے۔اردو زبان وادب کے ارتقا کے ابتدائی دور کی اس تحقیق سے اردو زبان وادب کی ابتدا اور ارتقا کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔اردو کے مشہور محقق محمود شیرانی اور ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے اردو کی ابتدا کے بارے میں اپنے نظریات پیش کرنے کے لیے قدیم اردو یعنی دکنی اردو کے ادب ہی سے مثالیں پیش کی ہیں۔اس لیے نصیرالدین ہاشمی کا نظریہ اردو کی پیدائش کے بارے میں نہیں بلکہ اردو کے ارتقا کے متعلق ہے اور ان کی کتاب ''دکن میں اردو'' دکن میں اردو کے ارتقا کی تاریخ ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ اردو زبان کی ارتقا کے بارے میں نصیرالدین ہاشمی کی رائے کیا ہے؟

2۔ نصیرالدین ہاشمی نے ہندوستان کے کس علاقے کی اردو خدمات کی تاریخ مرتب کی ہے؟

3۔ دکنیات کے حوالے سے نصیرالدین ہاشمی نے کن کتابوں کو مرتب کیا؟

3.6 خلاصہ

اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں با قاعدہ نظریات کا سلسلہ میر امّن دہلوی سے شروع ہوتا ہے۔ان کا نظریہ ہے کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے جس کی پیدائش اکبر کے عہد میں ہوئی۔ میر امن کے علاوہ سرسید احمد خاں، امام بخش صہبائی، سید احمد دہلوی اور انشاء اللہ خاں انشا نے بھی اردو کو مختلف زبانوں کے میل جول کا نتیجہ بتایا۔محمد حسین آزاد کا یہ نظریہ بہت مشہور ہوا کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔اس نظریے کی تائید اور تردید میں کئی علما نے اپنے نظریات پیش کیے اور اردو زبان کے آغاز و ارتقا پر غور وفکر کا سلسلہ شروع ہوا۔محمد حسین آزاد کے نظریے سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ اردو کی جائے پیدائش ہندوستان ہے۔اس کے بعد اردو کے محققین اردو زبان کے ماخذ کے سلسلے میں ہندوستانی زبانوں کو اہمیت دینے لگے اور ایسے نظریات سامنے آئے جن میں اردو زبان کے آغاز وارتقا کے رشتے ہندوستان کے مختلف علاقوں اور مختلف زبانوں سے دریافت کرنے کی کوشش کی گئی۔سید سلیمان ندوی نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں آئے۔ان مسلمانوں کا میل جول ہندوستان کے جس حصے میں پہلے واقع ہوا وہ سندھ ہے، اس لیے سندھ کی وادی ہماری متحدہ زبان کا پہلا گہوارہ تھی۔مسعود حسین خاں نے سلیمان ندوی کے اس نظریے کی تردید کی ہے۔سندھ میں سب سے پہلے پہنچنے والے مسلمان عرب تھے اور عربی ان کی زبان تھی۔عربی کا تعلق زبانوں کے سامی خاندان سے ہے۔جبکہ سندھی اور اردو ہند آریائی خاندان کی زبانیں ہیں۔ اس لیے سامی اور آریائی خاندان کے میل سے کسی آریائی زبان کی پیدائش ممکن نہیں ہے۔محمود شیرانی اردو کی جائے پیدائش پنجاب قرار دیتے ہیں کیونکہ مسلمانوں نے ہندوستان میں سب سے پہلے طویل عرصے کے لیے یہیں بود و باش اختیار کی تھی۔ پنجاب میں مسلمانوں کے طویل قیام کی مدت میں مشترک زبان کی ضرورت پیش آئی اور ایک نئی زبان نے جنم لیا۔ جب مسلمانوں نے پنجاب سے دہلی ہجرت کی تو یہ نئی زبان بھی ان کے ساتھ آئی۔ یہی زبان دہلی کی فتح کے بعد اردو کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔محمود شیرانی نے اپنے نظریے کی تائید میں قدیم اردو اور پنجابی کی مشترک خصوصیات کی مثالیں پیش کی ہیں۔ماہرین لسانیات مسعود حسین خاں اور گیان چند جین نے محمود شیرانی کے نظریے سے اختلاف کیا ہے۔نصیرالدین ہاشمی دوآبۂ گنگا جمنا میں اردو کی ابتدا کے نظریے کو تسلیم کرتے ہیں۔وہ سندھ، دکن اور پنجاب میں اردو کی ابتدا کے نظریے کی تردید کرتے ہیں۔نصیرالدین ہاشمی کی رائے یہ ہے کہ اردو کی ابتدا شمال میں ہوئی جب کہ اس کا ارتقا دکن میں ہوا۔انھوں نے اپنی مشہور کتاب ''دکن میں اردو'' کے ذریعے اردو کی قدیم شکل ''دکنی اردو'' کے آغاز اور ارتقا کی جامع تاریخ پیش کی ہے۔

3.7 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

1۔ سید سلیمان ندوی سندھ کو اردو کی جائے پیدائش کیوں قرار دیتے ہیں؟

2۔ اردو زبان کے آغاز کے بارے میں محمود شیرانی کے نظریے کا جائزہ لیجیے۔

3۔ اردو زبان کی ابتدا و ارتقا کے بارے میں نصیرالدین ہاشمی کا نظریہ کیا ہے؟

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

1۔ محمود شیرانی نے پنجابی اور دکنی اردو کی کن مشترک خصوصیات کا ذکر کیا ہے؟

2۔ محمود شیرانی کے نظریے کی تردید لسانیات کے کن ماہرین نے کی ہے؟

3۔ دکنی زبان وادب کے لیے نصیرالدین ہاشمی کی خدمات کیا ہیں؟

3.8 فرہنگ

الفاظ	معنی
لسانیات	زبان کا علم
مخلوط	ملا جلا، ملا ہوا
اختلاط	میل جول
ارتقا	فروغ، ترقی
ہیولیٰ	ڈھانچہ، خاکہ
اخذ کرنا	لے لینا، اختیار کرنا
دلائل	دلیل کی جمع، ثبوت، شہادت
جائے پیدائش	پیدا ہونے جگہ
مؤرخ	تاریخ لکھنے والا
تردید کرنا	رد کرنا، اعتراض کرنا، نامنظور کرنا
مولد	پیدا ہونے کی جگہ، جائے ولادت، وطن
تعیّن	ٹھہرانا، مقرر کرنا، مخصوص کرنا
تشخیص	جاننا، پہچاننا، شناخت کرنا
دوآبہ	دو دریاؤں کے درمیان کا علاقہ
مشترک	شریک، ساجھا، شرکت کیا ہوا

3.9 سفارش کردہ کتابیں

1۔ نقوش سلیمانی	سید سلیمان ندوی
2۔ پنجاب میں اردو	حافظ محمود شیرانی
3۔ دکن میں اردو	نصیرالدین ہاشمی
4۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو (آٹھواں ایڈیشن)	مسعود حسین خاں
5۔ مضامین مسعود	مسعود حسین خاں

6۔ اردو کی لسانی تشکیل	مرزا خلیل احمد بیگ
7۔ اردو زبان کی تاریخ	مرزا خلیل احمد بیگ
8۔ ہند آریائی اور ہندی	سنیتی کمار چٹرجی مترجم عتیق احمد صدیقی
9۔ اردو زبان کا ارتقا	ڈاکٹر شوکت سبزواری
10۔ داستانِ زبانِ اردو	ڈاکٹر شوکت سبزواری
11۔ اردو لسانیات	ڈاکٹر شوکت سبزواری
12۔ آبِ حیات	محمد حسین آزاد

اکائی 4 اردو کی ابتدا سے متعلق ماہرین لسانیات کے نظریات:
ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور مسعود حسین خاں کے نظریات

اکائی کے اجزا

4.0 مقصد

4.1 تمہید

4.2 ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا نظریہ

4.3 مسعود حسین خاں کا نظریہ

4.4 خلاصہ

4.5 نمونۂ امتحانی سوالات

4.6 فرہنگ

4.7 سفارش کردہ کتابیں

4.0 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبا کو اردو زبان کے آغاز وارتقا سے متعلق ماہرین لسانیات کے نظریات سے واقف کروانا ہے۔اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ

- ☆ لسانیات کی روشنی میں اردو کی ابتدا کے بارے میں اظہار خیال کرسکیں۔
- ☆ اردو کی ابتدا کے بارے میں ماہرین لسانیات کے نظریات پر روشنی ڈال سکیں۔
- ☆ ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور مسعود حسین خاں کے نظریات کی وضاحت کرسکیں۔

4.1 تمہید

گزشتہ اکائی میں آپ نے اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں اردو کے مختلف عالموں کے نظریات کا مطالعہ کیا تھا۔ یہ نظریات ان لوگوں

کے تھے جو لسانیات کے ماہر نہیں تھے۔ اس اکائی میں آپ اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں ماہر لسانیات کے نظریات پڑھیں گے۔ بیسویں صدی میں لسانیات کا علم عام ہوا اور اس کی روشنی میں زبانوں کے آغاز وارتقا کے بارے میں خالص علمی اور سائنسی طریقے سے تحقیق کی گئی۔ ہند آریائی لسانیات کے حوالے سے ٹی۔ گراہم بیلی، جارج ابراہم گریرسن اور سنیتی کمار چٹرجی کی لسانی تحقیقات سامنے آئیں۔ ان لسانی تحقیقات سے دیگر جدید ہند آریائی زبانوں کے ساتھ اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں بھی نئی بحث شروع ہوئی۔ اردو زبان کے آغاز وارتقا کے مسائل پر لسانیات کی روشنی میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور مسعود حسین خاں جیسے محقق اور ماہرین لسانیات نے تحقیق کی اور نتائج اخذ کیے۔ اس اکائی میں آپ ان ماہرین لسانیات کے نظریات کو تفصیل سے پڑھیں گے۔

4.2 ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا نظریہ

ڈاکٹر محی الدین قادری زور (1962-1905) اردو کے معروف ماہر لسانیات اور محقق تھے۔ انھوں نے لندن اور پیرس میں واقع لسانیات کی تعلیم کے عالمی مراکز میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ اس وقت تک لسانیات کی اہم شاخ علمِ صوتیات کا اردو میں کوئی واضح تصور نہ تھا۔ ڈاکٹر زور نے لسانیات کے اس پہلو پر خصوصی توجہ دی۔ انھوں نے علمِ صوتیات کی روشنی میں شمالی، دکنی اور گجراتی اردو میں فرق تلاش کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے علمِ صوتیات کی مدد سے اردو زبان کی ابتدا کے مسئلے کا نئے سرے سے جائزہ لیا اور اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کیا۔ ڈاکٹر زور نے لسانیات کے موضوع پر جو علمی تحقیقات کی تھیں انھیں کتابی صورت میں شائع کیا۔ ان کی پہلی کتاب ''ہندوستانی صوتیات'' (Hindustani Phonetics) 1930 میں اور دوسری کتاب ''ہندوستانی لسانیات'' 1932 میں شائع ہوئی۔ ان دونوں کتابوں میں ڈاکٹر زور نے اردو زبان کے آغاز کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ خصوصاً ہندوستانی لسانیات کے حصہ دوم میں اردو زبان کے آغاز وارتقا کے حوالے سے انھوں نے نہایت مدلل اور مفصل طور پر بحث کی ہے۔

ڈاکٹر زور نے اردو کے لسانی پہلوؤں پر تحقیق کی کمی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اردو زبان میں محمود شیرانی کی ''پنجاب میں اردو'' کے علاوہ کوئی اور قابل ذکر کتاب موجود نہیں ہے۔ ان کے مطابق ''پنجاب میں اردو'' اردو زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں اردو سے متعلق جدید ترین لسانی مواد پیش کیا گیا ہے۔ اس سے ہٹ کر اردو زبان کے آغاز وارتقا کے موضوع پر بہت کم مواد موجود ہے۔

ڈاکٹر زور نے ہندوستانی لسانیات میں اردو کی ابتدا کے متعلق سبھی اہم نظریات کا لسانیات کی روشنی میں جائزہ لیا ہے اور ان کے بارے میں اپنی رائے پیش کی ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے دکن سے اردو کے آغاز کے نظریے سے بحث کرتے ہوئے اس کی تردید کی ہے۔ ان کے مطابق اردو ایک آریائی زبان ہے۔ قدیم عرب مہاجرین نے دکن میں قیام کیا جہاں دراوڑی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ مہاراشٹرا میں مقیم ہوئے۔ کسی قسم کے میل جول سے اگر اردو پیدا ہوتی تو یہ عربی اور دراوڑی عناصر پر مبنی ہوتی۔ لیکن اردو عربی کے بجائے زیادہ تر فارسی سے متاثر ہوئی ہے۔ ڈاکٹر زور نے سندھ میں اردو کی ابتدا کے نظریے کی بھی اس طرح تردید کی ہے کہ دکن کے بعد سندھ دوسرا مقام ہے جہاں مسلمان سب سے پہلے آئے اور قریب چار صدیوں تک قیام کیا۔ لیکن سندھ میں جس زبان کا ارتقا ہوا وہ اردو نہیں بلکہ سندھی کی قدیم شکل تھی۔ کیونکہ دکن کی طرح سندھ میں آنے والے مسلمان فاتحین کی زبان بھی عربی تھی۔

پنجاب میں اردو کی ابتدا کے نظریے کے بارے میں ڈاکٹر زور کی رائے یہ ہے کہ پنجاب کو جن مسلمانوں نے فتح کیا وہ محمود غزنوی کی فوج تھی۔ ان مسلمانوں کی زبان فارسی تھی اور یہ پنجاب میں قریب دو سو سال تک مقیم رہے۔ اس لیے محمود شیرانی نے لسانی دلائل کی مدد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو، برج کے مقابلے میں پنجابی سے زیادہ قریب اور مشترک زبان ہے۔ ڈاکٹر زور نے محمود شیرانی کے نظریے کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کی حمایت کی ہے۔ ڈاکٹر زور کے مطابق محمود شیرانی نے اپنے دلائل کے لیے جو مواد پیش کیا ہے وہ اردو زبان کے آغاز وارتقا کو سمجھنے اور صحیح نتیجے تک پہنچنے میں

بہت مفید اور معاون ہے۔اردو کی ابتدا کے بارے میں ڈاکٹر زور اس نظریے کا بھی جائزہ لیتے ہیں کہ اردو دہلی میں فارسی اور ہندوستانی کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے۔اس نظریے کی بنیاد یہ ہے کہ محمد غوری نے دہلی کو فتح کیا اور طویل مدت تک یہاں مسلمان حکمران رہے۔محمد تغلق کی فوجیں جس زبان کو لے کر دکن جاتی ہیں وہ یہی زبان ہے۔اس کا تعلق ان زبانوں سے تھا جو دہلی اور اس کے گردو پیش میں بولی جاتی تھیں۔ڈاکٹر زور اس نظریے کو عام اور نسبتاً مستند قرار دیتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ مکمل طور پر صحیح نہیں ہے اور اس میں ترمیم کی گنجائش ہے۔

ڈاکٹر زور نے مذکورہ تمام نظریات کا جائزہ لینے کے بعد اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں اپنا نظریہ بھی پیش کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ اردو کی پیدائش دہلی کی فتح سے قبل ہو چکی تھی۔جب مسلمانوں نے دہلی کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو اردو نے ایک مستقل زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔اردو اس زبان سے نکلی ہے جو ہندوستان کے شمال مغربی سرحدی علاقے سے الہٰ آباد کے درمیانی حصے میں بولی جاتی تھی۔ڈاکٹر زور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارہویں صدی میں بولی جاتی تھی۔اس طرح وہ محمود شیرانی کے اس نظریے کی تائید کرتے ہیں کہ اردو کی ابتدا پنجاب میں اس وقت ہوئی جب وہاں غزنویوں کی حکومت تھی۔وہ لکھتے ہیں:

> ''اردو کا سنگِ بنیاد دراصل مسلمانوں کی فتح دہلی سے بہت پہلے ہی رکھا جا چکا تھا یہ اور بات ہے کہ اس نے اس وقت تک ایک مستقل زبان کی حیثیت نہیں حاصل کی تھی، جب تک مسلمانوں نے اس شہر کو اپنا پایۂ تخت نہ بنا لیا۔اردو اس زبان سے مشتق ہے جو بالعموم نئے ہند آریائی دور میں اس حصۂ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہدِ حاضر کا شمالی مغربی سرحدی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہٰ آباد۔اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارہویں صدی میں بولی جاتی تھی۔'' (ہندوستانی لسانیات، ڈاکٹر زور، ص 97)

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے جہاں محمود شیرانی کے نظریے کی حمایت کی ہے وہیں اردو زبان کے آغاز اور ارتقا میں پنجابی کے ساتھ ساتھ کھڑی اور ہریانی کی اہمیت کا بھی اعتراف کیا ہے۔وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ اردو پنجابی یا کھڑی بولی سے نہیں نکلی بلکہ اس زبان سے نکلی ہے جس سے یہ دونوں زبانیں نکلی ہیں۔اس لیے اردو کی پنجابی اور کھڑی بولی دونوں سے بہت مشابہت ہے۔لیکن اردو زبان پر کھڑی بولی کے اثرات پنجابی کی بہ نسبت زیادہ ہیں۔پنجابی اور کھڑی بولی کے علاوہ اردو پر ہریانی کا بھی کافی اثر ہے کیونکہ یہ دہلی کے آس پاس کی زبان ہے۔وہ پنجابی، کھڑی اور ہریانوی سے اردو کے لسانی رشتے کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے جو ان دونوں کی مشترک سرچشمہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ بعض باتوں میں پنجابی سے مشابہ ہے اور بعض میں کھڑی سے لیکن مسلمانوں کے صدر مقام صدیوں تک دہلی اور آگرہ رہے ہیں اس لیے اردو زیادہ تر کھڑی بولی ہی سے متاثر ہوتی گئی۔یہاں ایک اور بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ اردو پر بانگڑو یا ہریانی زبان کا بھی قابل لحاظ اثر ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زبان دہلی کے شمال مغرب میں انبالہ کے اطراف اس علاقہ میں بولی جاتی ہے جو پنجاب سے دہلی آتے ہوئے راستہ میں واقع ہے اور دہلی پر حملہ کرنے والوں یا وہاں کے حکمرانوں کے ہمراہ اسی علاقہ کے رہنے والے بہیرو بنگاہ کے میل کی حیثیت سے دہلی اور اس کے نواح میں آکر آباد ہوئے۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فاتح ومفتوح کے میل جول سے جو زبان بنتی چلی آرہی تھی اس میں ہریانی عنصر بھی شامل ہوتا چلا گیا۔'' (ہندوستانی لسانیات، ڈاکٹر زور، ص 90)

ڈاکٹر زور نے آگرہ کو بھی کھڑی کا علاقہ قرار دیا ہے جو درست نہیں ہے کیونکہ یہ خالص برج کا علاقہ ہے۔اس اقتباس میں انھوں نے ہریانی

اوراردو کے لسانی رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہریانی زبان اردو کے بعد پیدا ہوئی ہے۔اس لیے قدیم دکنی اردواور ہریانی میں جو مماثلت ہے اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ اردو ہریانی سے نکلی ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں زبانوں کا سرچشمہ ایک ہے۔اس طرح انھوں نے یہ واضح کر دیا کہ اردو کا رشتہ پنجابی، کھڑی اور ہریانی سے ماں بیٹی کا نہیں بلکہ بہنوں کا رشتہ ہے۔لیکن اپنی اکثر تحریروں میں ڈاکٹر زور نے اردو کے آغاز کے سلسلے میں پنجابی کو بہت اہمیت دی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو زبان پر پنجابی کا اثر دوسری زبانوں کی بہ نسبت زیادہ مانتے ہیں۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں اپنا نظریہ لسانیات کے اصولوں کی روشنی میں پیش کیا ہے۔انھوں نے اپنے ایک مضمون ''اردو کی ابتدا'' (1962) میں بھی اپنے نظریے کی مزید وضاحت کی ہے۔ماہر لسانیات مسعود حسین خاں نے ڈاکٹر زور کے نظریے سے علمی اختلاف کرتے ہوئے ان کی لسانی تحقیق سے استفادہ بھی کیا ہے۔مسعود حسین خاں اردو کی ابتدا کے سلسلے میں ہریانی زبان کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اردو پر ہریانی کے اثرات کی جانب سب سے پہلے ڈاکٹر زور نے ہی اشارہ کیا ہے۔اس طرح ماہر لسانیات ڈاکٹر زور کا نظریہ اردو زبان کی ابتدا کے متعلق تمام نظریات میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی دو اہم کتابوں کے نام لکھیے؟

2۔ ڈاکٹر زور نے دکن سے اردو کے آغاز کے نظریے کے متعلق کیا کہا ہے؟

3۔ سندھ میں اردو کی ابتدا کے بارے میں ڈاکٹر زور کی رائے کیا ہے؟

4۔ ڈاکٹر زور کے مطابق اردو کس زبان پر مبنی ہے؟

5۔ اردو کے لسانی رشتے کن زبانوں سے ہیں؟

4.3 مسعود حسین خاں کا نظریہ

پروفیسر مسعود حسین خاں (پ 1919) اردو کے نامور ماہر لسانیات اور لسانی محقق ہیں۔انھوں نے لسانیات کے کئی نئے پہلوؤں مثلاً صوتیات، تشکیلیات اور اسلوبیات وغیرہ موضوعات کو اپنی تحقیق کا مرکز بنایا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے بعد وہ دوسرے بڑے محقق ہیں جنھوں نے اردو زبان کے آغاز وارتقا کے مسائل پر خالص سائنسی اور لسانیاتی نقطۂ نظر سے غور کیا ہے۔ ڈاکٹر زور کی طرح مسعود حسین خاں نے بھی نے لندن اور پیرس میں واقع لسانیات کی تعلیم کے عالمی مراکز میں باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ 1953 میں انھیں پیرس یونیورسٹی نے لسانیات میں اعلیٰ تحقیق کے لیے ڈی۔لٹ کی ڈگری سے نوازا۔اس سے قبل 1945 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے مسعود حسین خاں کو ان کے تحقیقی مقالے ''مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو'' پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل ہو چکی تھی۔یہ تحقیقی مقالہ 1948 میں دہلی سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس کتاب کے ساتویں ایڈیشن میں انھوں نے نئی تحقیق کی روشنی میں مزید اضافے کیے ہیں۔انھوں نے اس تحقیقی کتاب میں اردو کی ابتدا کے تمام موجود نظریات پر سوال کھڑے کیے اور اس مسئلے پر نئے سرے سے بحث کا آغاز کیا۔مسعود حسین خاں کی اس کتاب نے انھیں ایک عہد ساز ماہر لسانیات کی شہرت عطا کی ہے۔ یہ کتاب اردو کے آغاز سے تعلق رکھنے والی زبانوں اور بولیوں کا توضیحی، تجزیاتی اور تقابلی مطالعہ پیش کرتی ہے۔ اردو کب، کہاں اور کیسے پیدا ہوئی جیسے اہم سوالوں کا جواب مسعود حسین خاں نے اسی جدید لسانیاتی مطالعے کی مدد سے تلاش کیا ہے۔اس طرح وہ اردو زبان کے آغاز کا سب سے قابلِ قبول نظریہ پیش کرتے ہیں۔

مسعود حسین خاں نے مقدمہ تاریخِ زبانِ اردو میں اپنا نظریہ پیش کرنے سے قبل اردو کی ابتدا سے متعلق معروف لسانیاتی نظریوں کا جائزہ لیا ہے۔اس سلسلے میں انھوں نے برج بھاشا اور پنجابی سے اردو کی پیدائش کے نظریات پر بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ محمد حسین آزاد کے علاوہ میر امّن،

ماسٹر رام چندر اور سرسید احمد خاں نے بھی اردو کو برج بھاشا سے منسوب کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ برج بھاشا نے قدیم اردو کو جدید اردو میں تبدیل کرنے میں مدد کی ہے اور اردو کے ارتقا میں برج کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔ لیکن چند لسانی مماثلتوں کے ساتھ ہی اردو کی بنیادی بولی کھڑی اور برج میں لسانی اختلافات بھی ہیں۔ اس لیے اردو اور برج بھاشا کے بیچ ماں بیٹی کا نہیں بلکہ بہنوں کا رشتہ ہے۔

برج سے اردو کی پیدائش کی تردید کے بعد مسعود حسین خاں نے پنجابی سے اردو کی پیدائش کے نظریے کی سخت تنقید کی ہے۔ یہ نظریہ محمود شیرانی کا ہے جس کی ڈاکٹر گراہم بیلی، ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے تائید کی ہے۔ مسعود حسین خاں نے اردو اور پنجابی کے لسانی رشتے پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ اس نظریے پر یہ سوال قائم کرتے ہیں کہ جب اردو کا ہیولیٰ تیار ہو رہا تھا اس وقت پنجابی خود اپنی ابتدائی منزل میں تھی۔ اس صورت میں ایک زبان سے دوسری زبان کی پیدائش کیسے ممکن ہے۔ انھوں نے پنجابی اور جدید و قدیم اردو میں اہم اور بنیادی اختلافات کی بھی نشان دہی کی ہے۔ ان کا یہ بھی اعتراض ہے کہ محمود شیرانی نے قدیم دور میں جو خصوصیات پنجابی کی بتائی ہیں وہ سب اس عہد میں ہریانی میں بھی موجود تھیں جنھیں محمود شیرانی نے سرے سے نظر انداز کر دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر شیرانی نے دہلی کی قدیم زبان کے متعلق محض قیاس آرائی سے کام لیا ہے اور ہریانوی زبان کو اردو کی قدیم شکل کہہ کر چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ سلاطینِ دہلی کے لشکر میں اور شہر کے بازاروں میں ہریانہ علاقہ کی آبادی کا عنصر ہمیشہ زیادہ رہا ہے۔ لہٰذا اردو کی ابتدا پر کام کرنے والوں کی توجہ نواح دہلی کی بولیوں پر مرکوز ہونی چاہیے۔''
>
> (مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، دیباچہ)

مسعود حسین خاں نے نواح دہلی کی بولیوں ہریانوی، کھڑی اور میواتی سے قدیم دکنی کے لسانی رشتے تلاش کرتے ہوئے نواح دہلی کی سبھی بولیوں کے لسانی اختلافات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ برج بھاشا، کھڑی بولی، پنجابی اور ہریانوی بولیوں کا تقابلی مطالعہ نہایت تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ انھوں نے اردو کی ابتدا کے سلسلے میں پنجابی کے بجائے ہریانوی پر زور دیا ہے۔ وہ اردو کی ابتدا کے بارے میں اپنے نظریے کا خاکہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے طلوع کے وقت ہریانوی اور پنجابی میں خطِ فاصل قایم کرنا دشوار تھا۔ قدیم اردو اور دکنی کا ''پنجابی پن'' اس کا ''ہریانی پن'' بھی ہے۔ البتہ شورسینی اپ بھرنش کی جانشین ہونے کی حیثیت سے پنجابی کے مقابلے میں ہریانوی اور کھڑی بولی کو زیادہ قدیم ماننا پڑے گا۔''
>
> (مقدمہ تاریخ زبانِ اردو، دیباچہ)

اردو زبان پر ہریانوی کے اثرات کا ذکر ژول بلاک اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے بھی کیا ہے۔ مسعود حسین خاں نے قدیم دکنی اور ہریانوی میں صوتی مماثلتوں کی نشان دہی کی ہے۔ وہ دکنی میں غنہ کے کثرت سے استعمال کی وجہ پنجابی کے بجائے ہریانوی سے رشتے کو بتاتے ہیں۔ انھوں نے کئی مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ دکنی ضمائر پنجابی کی بہ نسبت ہریانوی سے زیادہ قریب ہیں اور دکنی اور ہریانوی میں جمع بنانے کا طریقہ ایک جیسا ہے۔ مسعود حسین خاں پہلے اردو اور ہریانوی کے لسانی رشتے کی تلاش کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ قدیم اردو ہریانی سے بنی تھی جس پر بعد میں کھڑی بولی کے اثرات بھی مرتب ہوئے ہیں۔ لیکن بعد میں انھوں نے ہریانوی کے ساتھ کھڑی بولی کو بھی اہمیت دی ہے اور اردو کی پیدائش میں دونوں بولیوں کو برابر کا حصہ دار بتایا ہے۔ مقدمہ تاریخ زبانِ اردو کی ساتویں اشاعت (1987) میں یہ وضاحت کی کہ اردو زبان کے ماخذ کے بارے میں انھوں نے نظریاتی ترمیم کی ہے۔ اب وہ اردو کے آغاز کے سلسلے میں ہریانوی کے بجائے کھڑی کو اولیت دیتے ہیں۔ کھڑی بولی اور ہریانوی کے ساتھ ساتھ وہ

دہلی اورنواح دہلی کی دیگر بولیوں کا بھی تقابلی مطالعہ اور تجزیہ کرتے ہیں۔اردو زبان کے آغاز میں دہلی اور نواحِ دہلی کی بولیوں کی اہمیت کا اندازہ انھیں امیر خسرو (1253-1325) کے ایک فقرے ''دہلی و پیرامنش'' سے ہوا۔ امیر خسرو نے اپنی مثنوی ''نُہ سپہر''میں بارہ ہندوستانی زبانوں کی فہرست دی ہے۔اس فہرست میں ''زبانِ دہلی و پیرامنش'' سے مراد دہلی اور اس کے نواح کی بولیاں ہیں۔مسعود حسین خاں نے ان ہی بولیوں کو لسانی تحقیق کا مرکز بنایا اور اپنے نظریے کی بنیاد بھی ان ہی بولیوں پر رکھی۔ان کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ ''زبانِ دہلی و پیرامنش اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہے۔اور حضرت دہلی اس کا حقیقی مولد ومنشا۔''(مقدمہ تاریخ زبانِ اردو،ایڈیشن 1987،ص 262)مسعود حسین خاں نے دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقے کو اردو کی جائے پیدائش قرار دیا ہے۔دہلی اور اس کے اطراف کی لسانی اہمیت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''شہر دہلی تین بولیوں کے سنگم پر واقع ہے۔ جمنا پار مغرب میں ہریانوی رائج ہے۔شمال مشرق میں کھڑی اور جنوب میں برج کا علاقہ ہے۔اردو کے ارتقا میں ان تمام بولیوں کے اثرات مختلف زمانوں میں پڑتے رہے ہیں۔''
>
> (مقدمہ تاریخ زبانِ اردو،ایڈیشن 1987،ص 235)

مسعود حسین خاں نے اردو زبان کے آغاز کی تاریخ بھی اسی بنیاد پر طے کی ہے کہ جب مسلمانوں نے 1193 میں دہلی فتح کی تب دہلی اور اس کے نواح کی بولیوں میں عربی وفارسی کے لسانی اثرات داخل ہونے شروع ہوئے ۔اس لیے اردو کا آغاز دہلی میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہوتا ہے۔حالانکہ دہلی سے قبل سندھ اور پنجاب میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور دہلی اور اس کے نواح کی بولیوں میں عربی و فارسی کے الفاظ داخل ہو رہے تھے۔لیکن مسعود حسین خاں مقامی بولیوں میں عربی وفارسی الفاظ کے داخل ہونے کو اردو کی پیدائش کی وجہ نہیں تسلیم کرتے۔ان کے نظریے کے مطابق اردو کی ابتدا اور ارتقا کی اصل تاریخ محمد غوری کی فتح دہلی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کی زبانوں میں عربی فارسی الفاظ کا داخلہ ہی اردو کی تخلیق کی ضمانت نہیں کرتا، بلکہ جب یہ لسانی اثرات زبانِ 'دہلی و پیرامنش' میں نفوذ کرتے ہیں تب اردو کا پہلا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے، اور یہ ہوتا ہے مسلمانوں کی فتح دہلی (1193) کے بعد۔''
>
> (ایضاً،ص 235)

مسعود حسین خاں نے متعدد مثالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ عربی فارسی کے لسانی اثرات کا نفوذ سب سے پہلے دہلی کے اطراف میں رائج کھڑی بولی میں فتح دہلی کے بعد ہوا۔کھڑی بولی کے مستند نمونے سب سے پہلے دکن میں ملتے ہیں۔مسعود حسین خاں دکنی اردو کو اردو کی ہی قدیم شکل مانتے ہیں اور اسے قدیم اردو کا نام دیتے ہیں۔انھوں نے اس قدیم اردو کے دستیاب لسانی مواد کی صوتی خصوصیات، اسما،افعال اور حروف کا مطالعہ کر کے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔اس طرح انھوں نے قدیم اردو اور کھڑی کے علاوہ نواحِ دہلی کی دیگر بولیوں سے قدیم اردو کے باہمی رشتوں اور مماثلتوں کو تلاش کیا ہے۔ وہ اس مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو کا ابتدائی ڈھانچہ کھڑی اور ہریانوی سے تیار ہوا ہے جس پر رفتہ رفتہ علاقائی اثرات پڑنے لگے۔ وہ اردو کے ارتقا میں برج بھاشا کے اثرات پر بھی زور دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''قدیم اردو کی تشکیل براہ راست دوآبہ کی کھڑی اور جمنا پار کی ہریانوی کے زیر اثر ہوئی ہے۔اور جب سولھویں صدی میں آگرہ دارالسلطنت بن جاتا ہے اور کرشن بھگتی کی تحریک کے ساتھ برج بھاشا عام مقبول زبان ہو جاتی ہے تو سلاطین دہلی کے عہد کی تشکیل شدہ زبان کی نوک پلک برجی محاورے کے ذریعہ درست ہوتی ہے۔''
>
> (ایضاً،ص 236)

مسعود حسین خاں کے مطابق قدیم دکنی کے مراہٹی کے بعض لسانی اثرات کے علاوہ اکثر نامانوس الفاظ کی توجیہ نواح دہلی کی مذکورہ تین بولیوں یعنی کھڑی بولی، ہریانی اور برج بھاشا سے کی جاسکتی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ شمالی ہند میں زبانوں کے ارتقا کی رفتار بدلتے سیاسی حالات کے سبب تیز تر

رہی ہے جب کہ جنوبی ہند میں دراوڑی زبانوں کے اجنبی ماحول میں لسانی ارتقا کی رفتار نہایت سست رہی۔اس لیے دکنی اردو میں آج الفاظ کی وہی شکلیں ملتی ہیں جو شمالی ہند میں چھ صدی قبل رائج تھیں۔مسعود حسین خاں پہلے ماہر لسانیات ہیں جنھوں نے قدیم دکنی، ہریانی، کھڑی بولی اور برج بھاشا کا لسانیاتی تجزیہ کر کے اردو زبان کے آغاز وارتقا میں ان زبانوں کی اہمیت ثابت کی ہے۔انھوں نے اپنا نظریہ نہایت مستند لسانی مواد سے مثالیں دے کر اور دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس لیے مسعود حسین خاں کا یہ نظریہ تاریخی اور لسانی دونوں لحاظ سے قابل قبول ہے کہ اردو کی جائے پیدائش دہلی اور نواحِ دہلی ہے۔اردو کے آغاز وارتقا کے متعلق یہ سب سے قابل قبول نظریہ ہے جس کی تردید اب تک کسی ماہر لسانیات نے نہیں کی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ مسعود حسین خاں کا تحقیقی مقالہ کس نام سے شائع ہوا ہے؟

2۔ برج بھاشا کے متعلق مسعود حسین خاں کی رائے کیا ہے؟

3۔ مسعود حسین خاں کی نظر میں قدیم دکنی کا اردو سے کیا رشتہ ہے؟

4۔ زبانِ دہلی و پیرامنش سے کیا مراد ہے؟

5۔ اردو کی پیدائش کب ہوئی؟

6۔ اردو کے آغاز میں دہلی اور نواحِ دہلی کی کن بولیوں کی اہمیت ہے؟

4.4 خلاصہ

بیسویں صدی میں جب لسانیات کا علم عام ہوا تو اس کی روشنی میں زبانوں کے آغاز وارتقا کے بارے میں خالص علمی اور سائنسی طریقے سے تحقیق کی گئی۔ان لسانی تحقیقات سے دیگر جدید ہند آریائی زبانوں کے ساتھ اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں بھی نئی بحث شروع ہوئی۔اردو زبان کے آغاز وارتقا کے مسائل پر لسانیات کی روشنی میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور مسعود حسین خاں جیسے محقق اور ماہرین لسانیات نے تحقیق کی اور صحیح نتائج اخذ کیے۔ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اردو کی ابتدا کے متعلق سبھی اہم نظریات کا لسانیات کی روشنی میں جائزہ لیا ہے اور ان کے بارے میں اپنی رائے پیش کی ہے۔انھوں نے دکن اور سندھ میں اردو کی ابتدا کے نظریات کی تردید کی ہے لیکن محمود شیرانی کے پنجاب میں اردو کی ابتدا کے نظریے کی حمایت کی ہے۔ڈاکٹر زور نے اردو کے آغاز کے سلسلے میں پنجابی کو بہت اہمیت دی ہے جس یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو زبان پر پنجابی کا اثر دوسری زبانوں کی بہ نسبت زیادہ مانتے ہیں۔انھوں نے اردو زبان کے آغاز اور ارتقا میں پنجابی کے ساتھ ساتھ کھڑی اور ہریانی کی اہمیت کا بھی اعتراف کیا ہے۔وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ اردو پنجابی یا کھڑی بولی سے نہیں نکلی بلکہ اس زبان سے نکلی ہے جس سے یہ دونوں زبانیں نکلی ہیں۔اس لیے اردو کی پنجابی اور کھڑی بولی دونوں سے مشابہت بہت ہے۔لیکن اردو زبان پر کھڑی بولی کے اثرات پنجابی کی بہ نسبت زیادہ ہیں۔پنجابی اور کھڑی بولی کے علاوہ اردو پر ہریانی کا بھی کافی اثر ہے کیونکہ یہ دہلی کے آس پاس کی زبان ہے۔اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا نظریہ یہ ہے کہ اردو کی پیدائش دہلی کی فتح سے قبل ہو چکی تھی۔جب مسلمانوں نے دہلی کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو اردو نے ایک مستقل زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔اردو اس زبان سے نکلی ہے جو ہندوستان کے شمال مغربی سرحدی علاقے سے الہٰ آباد کے درمیانی حصے میں بولی جاتی تھی۔اردو اس زبان پر مبنی ہے جو پنجاب میں بارہویں صدی میں بولی جاتی تھی۔ڈاکٹر زور نے اردو زبان کے آغاز وارتقا کے بارے میں اپنا یہ نظریہ لسانیات کے اصولوں کی روشنی میں پیش کیا ہے اس لیے ان کا نظریہ اردو زبان کی ابتدا کے متعلق تمام نظریات میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

اردو کے نامور ماہر لسانیات مسعود حسین خاں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے بعد وہ دوسرے بڑے لسانی محقق ہیں جنھوں نے اردو زبان کے

آغاز وارتقا کے مسائل پر خالص سائنسی اور لسانیاتی نقطۂ نظر سے غور کیا ہے۔ان کی مشہور کتاب ''مقدمہ تاریخ زبانِ اردو'' اردو کے آغاز سے تعلق رکھنے والی زبانوں اور بولیوں کا توضیحی، تجزیاتی اور تقابلی مطالعہ پیش کرتی ہے۔اس کتاب میں انھوں نے اردو کی ابتدا سے متعلق معروف لسانیاتی نظریوں کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے برج بھاشا اور پنجابی سے اردو کی پیدائش کے نظریات کی تردید کی ہے ۔مسعود حسین خاں نے اردو اور پنجابی کے لسانی رشتے پر بڑی تفصیل سے بحث کرتے ہوئے یہ اعتراض کیا ہے کہ محمود شیرانی نے قدیم دور میں پنجابی کی جو خصوصیات بتائی ہیں وہ سب اس عہد میں ہریانی میں بھی موجود تھیں جنھیں محقق نے سرے سے نظر انداز کر دیا۔انھوں نے کئی مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ دکنی ضمائر پنجابی کی بہ نسبت ہریانوی سے زیادہ قریب ہیں اور دکنی اور ہریانوی میں جمع بنانے کا طریقہ ایک جیسا ہے۔مسعود حسین خاں نے اردو زبان کے آغاز وارتقا کے متعلق اپنا نظریہ نہایت مستند لسانی مواد سے مثالیں دے کر اور دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کا نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ اردو کی ابتدا اور ارتقا کی اصل تاریخ محمد غوری کی فتح دہلی ہے۔دہلی اور اس کے آس پاس کا علاقہ اردو کی جائے پیدائش ہے۔اردو کی قدیم شکل دکنی اردو ہے جس میں قدیم اردو کا مستند ادبی سرمایہ موجود ہے۔انھوں نے اس قدیم اردو کے دستیاب لسانی مواد کی صوتی خصوصیات، اسما، افعال اور حروف کا مطالعہ کر کے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔اس طرح انھوں نے قدیم اردو اور کھڑی کے علاوہ نواحِ دہلی کی دیگر بولیوں سے قدیم اردو کے باہمی رشتوں اور مماثلتوں کو تلاش کیا ہے۔وہ اس مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو کا ابتدائی ڈھانچہ کھڑی اور ہریانوی سے تیار ہوا ہے جس پر رفتہ رفتہ علاقائی اثرات پڑنے لگے۔وہ اردو کے ارتقا میں برج بھاشا کے اثرات پر بھی زور دیتے ہیں۔مسعود حسین خاں پہلے ماہر لسانیات ہیں جنھوں نے قدیم دکنی، ہریانی، کھڑی بولی اور برج بھاشا کا لسانیاتی تجزیہ کر کے اردو زبان کے آغاز وارتقا میں ان زبانوں کی اہمیت ثابت کی ہے۔اس لیے ان کا نظریہ اردو کے آغاز کا سب سے زیادہ قابل قبول نظریہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

4.5 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

1۔ اردو زبان کے آغاز کے متعلق ڈاکٹر محی الدین قادری زور کا نظریہ بیان کیجیے۔

2۔ مسعود حسین خاں نے اردو کی ابتدا اور ارتقا میں کن زبانوں کو اہم مانا ہے اور کیوں؟

3۔ اردو زبان کے آغاز کے بارے میں مسعود حسین خاں کے نظریے کا خلاصہ پیش کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

1۔ پنجاب میں اردو کی ابتدا کے نظریے کے بارے میں ڈاکٹر زور کی رائے کا جائزہ لیجیے۔

2۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اردو پر کن زبانوں کے اثرات کی نشاندہی کی ہے، بیان کیجیے۔

3۔ ہریانوی اور اردو کے لسانی رشتے پر مسعود حسین خاں کے خیالات بیان کیجیے۔

4۔ مسعود حسین خاں کے مطابق اردو زبان کب اور کہاں پیدا ہوئی، لکھیے۔

4.6 فرہنگ

الفاظ	معنی
بہیرو بنگاہ	فوج کے شاگرد پیشہ اور خیمہ وخرگاہ
لسانیات	زبان کا علم

مبنی	بنیاد رکھا ہوا
مشتق	ایک لفظ سے دوسرا لفظ بنایا ہوا
ہیولیٰ	ڈھانچہ، خاکہ
تردید کرنا	رد کرنا، اعتراض کرنا، نامنظور کرنا
نامانوس الفاظ	قدیم الفاظ، غیر رائج الفاظ، ایسے الفاظ جو اب چلن میں نہ ہوں
صوتیات	آواز سے تعلق رکھنے والا علم
مدلّل	دلیل سے ثابت کیا ہوا، معقول، ٹھیک، درست
مفصّل	تفصیل سے بیان کیا گیا، صاف، واضح، کھول کر بیان کیا گیا
تجزیہ	الگ الگ کرنا، کسی بات کے ہر پہلو کو واضح کرنا
دلائل	دلیل کی جمع، کئی ثبوت
تائید کرنا	حمایت کرنا، ساتھ دینا
سرچشمہ	نکلنے کی جگہ، سوتا، منبع
مشترک	شریک، ساجھا، شرکت کیا ہوا
تشکیلیات	تشکیل کی جمع، زبان کی ساخت اور بناوٹ کا علم
اسلوبیات	زبان کے طرز، انداز اور روش کا علم
تقابل کرنا	مقابلہ کرنا، موازنہ کرنا
توضیح کرنا	واضح کرنا، تشریح کرنا، وضاحت کرنا
مماثلت	یکسانیت، مشابہت، مانند ہونا
مشابہ	مانند، مثل، نظیر، ہم شکل، یکساں
ضمائر	ضمیر کی جمع، مختصر اسم
منبع	ماخذ، نکلنے کی جگہ
ارتقا	فروغ، ترقی

4.7 سفارش کردہ کتابیں

1۔	ہندوستانی لسانیات	ڈاکٹر محی الدین قادری زور
2۔	مقدمۂ تاریخ زبان اردو (آٹھواں ایڈیشن)	مسعود حسین خاں
3۔	اردو زبان: تاریخ، تقدیر، تشکیل	مسعود حسین خاں
4۔	اردو کی لسانی تشکیل	مرزا خلیل احمد بیگ
5۔	اردو زبان کی تاریخ	(مرتبہ) مرزا خلیل احمد بیگ

6۔	پنجاب میں اردو	حافظ محمود شیرانی
7۔	ہند آریائی اور ہندی	سنیتی کمار چٹرجی مترجم عتیق احمد صدیقی
8۔	اردو کی لسانیات	شوکت سبزواری
9۔	ہندوستانی لسانیات کا خاکہ	احتشام حسین
10۔	لسانی مطالعے	گیان چند جین
11۔	اردو ساخت کے بنیادی عناصر	نصیر احمد خاں

تیسرا باب: اردو ادب کے آغاز کا سماجی و تہذیبی پس منظر

اکائی 5 ہند عرب اور ہند ایران تعلقات

اکائی کے اجزا

5.0 مقصد

5.1 تمہید

5.2 ہند عرب تعلقات

5.2.1 مذہبی روایات

5.2.2 تاریخی شہادات

5.3 تعلقات کے اسباب

5.3.1 جغرافیائی محل وقوع

5.3.2 جزیرۂ نما عرب کے قدرتی احوال

5.3.3 ہندوستان کی شادابی

5.4 تجارتی تعلقات

5.5 تجارتی راستے

5.5.1 پہلا تجارتی راستہ

5.5.2 دوسرا تجارتی راستہ

5.5.3 تیسرا تجارتی راستہ

5.5.3.1 بحری راستہ

5.5.3.2 برمائی راستہ

5.5.4 ہندوستانی برآمدات

5.5.5 عربی برآمدات

5.6 دینی تعلقات

5.6.1 ہندوعرب دینی تعلقات اور بدھ مذہب
5.7 علمی وتمدنی تعلقات
5.7.1 لسانی تبادلہ
5.7.2 علمی وتمدنی تعلقات ظہور اسلام کے بعد
5.8 ہندایران تعلقات
5.9 خلاصہ
5.10 نمونہ امتحانی سوالات
5.11 فرہنگ
5.12 سفارش کردہ کتابیں

5.0 مقصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعدطلبہ ہندوستان اورعرب اور ہندوستان اور ایران کے درمیان زمانۂ قدیم سے قائم تعلقات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ان اسباب کوبھی جان لیں جنھوں نے ان تعلقات کو بنانے اورانھیں مضبوط کرنے میں اہم کردارادا کیا ہے۔اس اکائی کے ذریعے وہ اس تاریخی پس منظر سے بھی آگاہ ہوسکیں گے جس میں یہ تعلقات پروان چڑھے۔یہ اکائی ان تعلقات کی مختلف نوعیت پر بھی روشنی ڈالتی ہے،جیسے تجارتی تعلقات' مذہبی اورعلمی تعلقات وغیرہ۔

5.1 تمہید

انسان ایک سماجی جاندار ہے،اسے زندگی گزارنے کے لیے ایک سماج اورسوسائٹی کی ضرورت ہوتی ہے،وہ اپنی تمام ضرورتوں کوازخود پورانہیں کرسکتا ہے،ان کی تکمیل کے لیے اسے دوسرے انسانوں کی حاجت ہوتی ہے۔اپنی حاجتوں اورضرورتوں کی تکمیل کے لیے دوسروں سے ربط وتعلق کی ضرورت پڑتی ہے،جس کے نتیجے میں خاندان، قبیلے اورقومیں وجود میں آتی ہیں۔انسانوں کے درمیان تعلقات افراد کی سطح پر بھی ہوتے ہیں اورقبیلوں و قوموں کی سطح پر بھی ہوتے ہیں۔اس کی ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں لہذا اس کے تعلقات کی نوعیتیں بھی مختلف قسم کی ہوتی ہیں،کچھ تعلقات مادی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ہوتے ہیں تو کچھ روحانی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور کچھ تہذیبی اورتمدنی لحاظ سے اہم ہوتے ہیں،جیسے تجارتی تعلقات کھانے پینے ،لباس ومکان،آرائش وزینت اورآرام وراحت کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں، مذہبی تعلقات روحانی تقاضوں کواورعلمی تعلقات تہذیبی اورتمدنی حاجتوں کی تکمیل کا ذریعہ بنتے ہیں۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کے مابین قائم ہونے والے جملہ تعلقات ان ہی اہم عنوانات کے تحت آتے ہیں جیسے تجارتی، مذہبی اورعلمی تعلقات۔ ہندعرب اور ہندایران تعلقات نوع بشر کے درمیان قائم ہونے والے تعلقات کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ذیل میں ہم ان تعلقات کا جائزہ لیں گے۔

5.2 ہندعرب تعلقات

5.2.1 مذہبی روایات

ہندعرب تعلقات کی تاریخ بے حد قدیم ہے جو ہزاروں سال پر محیط ہے۔اگر مذہبی روایات کی مانیں تو ان تعلقات کا آغاز روئے زمین پر

پہلے انسان کے ظہور سے ہی ہو گیا تھا، اور وہ پہلے انسان ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام ہیں، جنہیں برصغیر میں اتارا گیا تھا، اور جنہوں نے حضرت حوا کی تلاش میں برصغیر سے جزیرہ نما عرب کا سفر کیا، جہاں جدہ میں حضرت حوا کو اتارا گیا تھا۔ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ: ''اللہ تعالی نے حضرت آدم کو ہندوستان میں اتارا، اور حضرت حوا کو جدہ میں، حضرت آدم ان کی تلاش میں نکلے اور مزدلفہ میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔'' ایک دوسری روایت ہے کہ: ''اللہ تعالی نے حضرت آدم کو سرزمین ہند میں اتارا''، ایک اور روایت میں جنوب ہندستان میں اتارنے کا ذکر بھی آیا ہے۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی متوفی 1785ء نے اپنی مشہور زمانہ کتاب (سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان) میں ان روایتوں کے لیے ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔

5.2.2 تاریخی شہادات

یہ مذکورہ تعلقات تو ماقبل تاریخ کے تھے اور وہ بھی بشرط صحت روایات، لیکن ہندوعرب کے ثابت شدہ تعلقات بھی تاریخ انسانی کی صبح صادق سے ملتے ہیں جب کہ کرۂ ارض پر صرف تین تہذیبیں پائی جاتی تھیں۔ جن میں سے پہلی مصر میں دریائے نیل کے کنارے پھیلی ہوئی تھی، دوسری دجلہ وفرات کے ساحلوں کے اطراف واکناف میں قائم تھی اور تیسری تہذیب سندھ ندی کے کناروں پر پروان چڑھی تھی۔ ان تہذیبوں کے محل وقوع اور معاصرت کے پیش نظر ان کے درمیان تعلقات کا ہونا بعید از قیاس نہیں ہے۔ شہرستانی نے اپنی کتاب الملل والنحل میں لکھا ہے کہ چار قومیں بڑی ہیں: عرب، عجم، روم، ہند اور ان میں سے ہندوعرب ہم فکر وہم مشرب ہیں۔

ان تہذیبوں کی تدوین شدہ تاریخ کا تعلق چوتھے سے تیسرے الفیے (ملینیم) ماقبل مسیح کے درمیانی عرصے سے ہے۔ ان تہذیبوں کے آثار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بے حد ترقی یافتہ اور باہم ایک دوسرے کے ربط میں تھیں۔ 1924ء میں جان مارشل اور آر۔ ڈی۔ بنرجی نے سندھ میں واقع موہنجوداڑو تہذیب کا انکشاف کیا اور اس کے بعد کے سالوں میں پے در پے سندھ، پنجاب بلوچستان اور راجستھان وغیرہ میں زمین کی کوکھ سے متعدد شہر دریافت کیے گئے جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تہذیب ایک بڑے زمینی خطے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ بعض ماہرین کے خیال میں اس کا سلسلہ دریائے گنگا کے میدانوں تک دراز تھا۔ دریائے سندھ کی تہذیب کے نام سے معروف یہ عظیم الشان تہذیب بے حد ترقی یافتہ تھی جو مصری اور بابلی تہذیب پر فوقیت رکھتی تھی اور سومری تہذیب کے ہم پلہ تھی۔ بابلی اور سومری تہذیب کا تعلق عراق کی سرزمین سے تھا۔

موہنجوداڑو سے دریافت ہونے والے آثار سے پتہ چلتا ہے کہ اس تہذیب کے عراق کی سومری تہذیب سے بڑے مستحکم تعلقات تھے۔ اور مؤرخ گارڈن چائلڈ کے مطابق ان دونوں تہذیبوں میں وادی سندھ کی تہذیب زیادہ قدیم تھی۔ ان دونوں کے مابین تعلقات کو مضبوط بنانے میں ان ہندوستانی نژاد جماعتوں کا بڑا ہاتھ تھا جو پورے جزیرہ نما عرب میں پھیلی ہوئی تھیں بالخصوص عرب کے مشرقی ساحلوں اور یمن میں ہندوستانیوں کی بڑی تعداد تھی۔ ان خطوں میں کثیر تعداد میں ہندوستانیوں کی موجودگی نے عربوں کی زندگی کے تمام گوشوں کو متاثر کیا تھا، اور ان کی فکری، سماجی اور لسانی تانے بانے پر ان ہندوستانیوں نے گہرا اثر ڈالا تھا۔ یہاں تک کہ عربی زبان کے علما کو یہ قاعدہ بنانا پڑا کہ عمان اور بحرین کے رہنے والوں کی عربی زبان معیاری نہیں مانی جائے گی کیونکہ وہاں کثیر تعداد میں ہندوستانی اور ایرانی رہتے تھے، اور نہ یمن والوں کی زبان کا اعتبار کیا جائے گا کیونکہ وہاں بھی ہندوستانیوں اور حبشہ والوں کی کثرت ہے جس سے ان علاقوں کے عربوں کی زبان خراب ہوگئی ہے۔

یمن میں ہندوستانیوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ جب اہل حبشہ نے یمن پر قبضہ کر لیا تو وہاں کا ایرانی صوبے دار سیف بن ذی یزن کسری کے پاس بھاگ کر آیا اور اس سے مدد کا طالب ہوا اور کہا کہ: اے شہنشاہ! ہمارے ملک پر اجنبیوں نے قبضہ کر لیا ہے، تو کسری نے اس سے پوچھا کہ کن اجنبیوں نے؟ اہل حبشہ نے یا ہندوستانیوں نے؟۔ کسری کا سوال بتاتا ہے کہ ماقبل اسلام یمن میں ہندوستانی اتنی بڑی تعداد میں تھے اور ایسی قوت کے

مالک تھے کہ ان کی جانب سے ملک پر قبضہ کر لینے کا احتمال اور امکان موجود تھا۔

عہد رسالت میں ہندوستانی کمیونٹی عربوں میں معروف ومشہور تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ہندوستان اور ہندوستانیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ ابن ہشام نے روایت کیا ہے کہ جب نجران کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی وفات کے چند ماہ قبل ملنے کے لیے آیا تو آپ نے انھیں دیکھ کر فرمایا کہ یہ لوگ کس قوم سے ہیں جو ہندوستانیوں کی طرح لگ رہے ہیں۔عرب میں رہنے والے ان ہندوستانیوں کے کئی گروہ تھے جیسے 1۔ الزط، 2۔ الاساورۃ، 3۔ السیابجہ، 4۔ البیاسرہ اور 5۔ النکاترہ۔ ان جماعتوں کا تذکرہ عربی زبان کی ادبی اور تاریخی کتابوں میں کثرت سے آیا ہے۔ جاہلی شاعری میں بھی ان ہندوستانیوں کا ذکر ملتا ہے۔

ہندوعرب کے تعلقات کثیر جہتی اور بے حد متنوع تھے، یہ تعلقات دینی بھی تھے اور تجارتی بھی، علمی بھی تھے اور تہذیبی بھی۔

5.3 تعلقات کے اسباب

ہندوعرب کے تجارتی تعلقات بے حد قدیم ہیں۔ یہ تعلقات صرف سندھی وعراقی تہذیبوں تک محدود نہیں تھے بلکہ جزیرۂ نما عرب کے تمام خطوں سے اور برصغیر کے مختلف علاقوں سے یہ تجارتی لین دین ہوتا تھا۔ ہندوعرب تجارتی روابط کے آغاز واستحکام کے پس پشت کئی عوامل کارفرما تھے جن میں سرفہرست تین تھے۔

5.3.1 جغرافیائی محل وقوع

جزیرنما عرب تین جانب سے سمندر سے گھرا ہوا تھا، بحرعرب کے مغربی ساحل پر واقع تھا اور ہندوستان کے روبرو تھا۔ دونوں ملکوں کے درمیان سمندر کے علاوہ کوئی چیز فاصل نہ تھی، اور ایک طرح سے یہ دونوں پڑوسی ملکوں کی طرح تھے۔

5.3.2 جزیرۂ نما عرب کے قدرتی احوال

عرب کے قدرتی احوال بے حد دشوار گزار تھے۔ اس کی بیشتر زمین بنجر اور غیر اپجاؤ تھی، لہذا وہاں کے رہنے والوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ تجارت کا سہارا لیں اور ضرورت کی اشیا غیر ملک سے برآمد کریں اور تجارت و جہاز رانی کے ذریعے بے رحم فطری حالات کا مقابلہ کریں۔

5.3.3 ہندوستان کی شادابی

ہندوستان اپنی سرسبزی وشادابی کے لیے ہر دور میں مشہور رہا ہے۔ ہندوستانی پیداوار کی کثرت اور اس کا تنوع بھی ہر دور میں دنیا والوں کے لیے جاذب نظر اور پرکشش رہا ہے۔ ہندوستان کی اس شہرت نے عرب تجار اور جہاز رانوں کو اپنی طرف متوجہ کیا، متعدد عرب ملاحوں اور تاجروں نے اپنے سفرناموں اور کتابوں میں ہندوستان کی معدنیات، جواہر، خوشبویات اور ادویات وغیرہ کا دلفریب ذکر کیا ہے۔

5.4 تجارتی تعلقات

ہندوستانی پیداوار، اس کی خوبی وتنوع کی یہی شہرت تھی جس نے انسانی تہذیب کے اس مظہر کو جنم دیا جو 'مشرقی تجارت' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اور جس تجارت پر قبضہ کرنے کے لیے دنیا کی مختلف قوموں نے طویل جدوجہد کی ہے۔ عربوں کے ساتھ ساتھ رومیوں، فارسیوں، یونانیوں اور یوروپ کی مختلف قوموں نے اس تجارت پر قبضہ کرنے اور اس پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ لیکن تاریخ کے بیشتر ادوار میں اس مشرقی تجارت پر عربوں کی بالادستی رہی ہے۔ اور ہم تاریخ کی ابتدا سے دیکھتے ہیں کہ عربی سفینے ہندوستان کی مختلف بندرگاہوں سے مال تجارت لے کر بحرین، حضرموت، عمان اور مسقط وغیرہ کی بندرگاہوں تک پہنچتے ہیں اور وہاں سے اونٹوں کے ذریعے وہ مال تجارت حجاز ہوتے ہوئے شام اور مصر پہنچتا ہے، اور پھر انطاکیہ اور اسکندریہ

کی بندرگاہوں سے وہی سامان یوروپ روانہ ہو جاتا ہے۔

توریت میں ان تجارتی قافلوں کا ذکر ملتا ہے جو جزیرہ، شام اور مصر کے درمیان چکر لگاتے ہیں۔ان ہی قافلوں میں سے وہ قافلہ بھی تھا جس نے حضرت یوسف کو کنویں سے نکال کر مصر پہنچایا تھا۔عہد نامہ قدیم میں ابھیرا کی بندرگاہ اور وہاں سے درآمد شدہ سامانوں کا ذکر ملتا ہے۔مورخ کرسٹن لاسان (Christian Lassan) کے مطابق ابھیرا کیرالا کی قدیم بندرگاہ تھی جواب بے پور (Bey pur) کے نام سے جانی جاتی ہے۔اس بندرگاہ سے حضرت سلیمان سونا، چاندی اور ہاتھی دانت وغیرہ منگوایا کرتے تھے۔

مورخ گورڈن چائلڈ (Gorden Childe) اپنی کتاب 'تاریخ میں کیا پیش آیا' (What happend in the History) میں رقمطراز ہیں کہ:

> ''سندھی شہروں کی مصنوعات دجلہ وفرات کے کنارے بسے ہوئے (سومری تہذیب کے) شہروں تک پہنچتی تھیں، اور اس کے مقابلے میں وادی سندھ میں اسطوانی انگوٹھی سمیت سجاوٹ اور زینت کے کئی سامان دریافت ہوئے ہیں جو سومری شہروں میں تیار کیے گئے تھے۔اور (ان دونوں قدیم تہذیبوں کے درمیان) یہ تجارت صرف خام مال اور اشیائے زینت و سجاوٹ تک محدود نہیں تھی، بلکہ عربی ساحلوں سے درآمد کی جانے والی مچھلیاں پابندی کے ساتھ موہنجوداڑو کے دسترخوان کی زینت بنتی تھیں''۔

دائرہ معارف برطانیہ نے بھی عراق کی موسوپوٹامین تہذیبوں اور ہندوستان میں موہنجوداڑو اور ہڑپا کی تہذیبوں کے درمیان تجارتی تعلقات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

عرب ہند تجارتی تعلقات ان تہذیبوں کے خاتمے کے بعد بھی قائم رہے۔جب ہندوستان میں آرین عہد شروع ہوا تو جزیرہ عرب میں کنعانیوں کو عروج ملا، یونانی کتابوں میں انھیں فینیشی یا فینیقی کہا گیا ہے۔ہندوعرب تجارتی تعلقات کو مضبوط و مستحکم کرنے میں ان فینیشیوں کا اہم کردار رہا ہے۔یہی فینیشی قوم تھی جس نے انسانی تاریخ میں سب سے پہلے بحری تجارت کو فروغ دیا اور اسے بڑے پیمانے پر اختیار کیا۔

جنوب جزیرہ میں حکومت سبا کے قیام کے بعد عرب ہند تعلقات اپنی بلندیوں پر پہنچ گئے۔اس عہد میں مشرقی تجارت پوری طرح سے عربوں کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔اس عہد میں یمن اور جنوب جزیرہ نما عرب کی جس ترقی، خوشحالی اور رونق کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے اس کا سبب یہی تجارت تھی۔چنانچہ گوسٹاؤلی بان نے اپنی کتاب تمدن عرب میں یونانی مورخین ہیروڈٹس، ارتھیمیڈور اور اسٹرابون وغیرہ کے حوالے سے یمن کی مادی ترقی اور تمدنی خوشحالی کا زبردست تذکرہ کیا۔قرآن کریم میں بھی 'سبا' کے نام کی ایک سورت ہے جس میں یمن کی شادابی وخوشحالی اور وہاں کے باغات کا ذکر ہے۔

5.5 تجارتی راستے

ہندوستان سے بحیرہ روم کی بندرگاہوں تک مشرقی تجارت کے تین اہم راستے تھے ان کا استعمال ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔تاہم تاریخ کے مختلف ادوار میں ان کی اہمیت میں کمی بیشی ہوتی رہی ہے۔

5.5.1 پہلا تجارتی راستہ

ہندوستان کے شمال غربی سرحدوں سے گزر کر بلخ اور صحرائے کرمان ہوتے ہوئے ایران وعراق کے ذریعے انطاکیہ، اور بحیرہ روم کی دوسری بندرگاہوں تک کا راستہ۔

5.5.2 دوسرا تجارتی راستہ

ہندوستان کے مغربی ساحلوں سے خلیج فارس ہوتے ہوئے ابلہ (موجودہ بصرہ) تک، اور وہاں سے دریائے فرات کے ذریعہ انطاکیہ اور دوسری بندرگاہوں تک کا راستہ۔ ابلہ کی اس بندرگاہ کا ہندوستان سے اس قدر مضبوط تجارتی رشتہ تھا کہ عرب اس کو 'ارض ہند' یعنی ہندوستان کی زمین کہتے تھے۔

5.5.3 تیسرا تجارتی راستہ

تیسرا راستہ سمندر کے ذریعے ہندوستان سے عمان اور یمن کی بندرگاہوں تک جاتا تھا، جہاں سے یہ راستہ دو حصوں میں منقسم ہو جاتا تھا۔

5.5.3.1 بحری راستہ

یہ راستہ بحر قلزم (Red Sea) سے ہوتا ہوا ایلہ پہنچتا تھا، جہاں آج اردن کی مشہور بندرگاہ عقبہ واقع ہے اور وہاں سے شام و مصر کی بندرگاہوں تک پہنچتا تھا۔

5.5.3.2 بر مائی راستہ

یہ وہ راستہ تھا جس پر عرب قافلے یمن اور شام کے درمیان سفر کرتے تھے۔ یہ راستہ عربوں کی تجارتی زندگی میں شریان کی طرح تھا۔ قرآن کریم نے اس راستے کو روشن شاہراہ کا نام دیا ہے۔ یہ بری راستہ نہ صرف مشرقی تجارت میں غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا، بلکہ ہندو عرب تجارتی تعلقات کو فروغ دینے میں بھی اس کا ایک اہم کردار تھا۔

مکہ مکرمہ اس بری راستے کے تقریبا درمیان میں واقع تھا، اس امتیازی محل وقوع نے مکہ کو اہم تجارتی مرکز بنا دیا تھا، عرب تجارتی قافلے اسی شاہراہ پر ہندوستان سے درآمد شدہ سامان تجارت لے کر شام تک کا سفر کیا کرتے تھے۔ اسی راستے کی بدولت قریش مکہ کو تجارت کے میدان میں زبردست فوقیت حاصل ہوئی، جس کے نتیجے میں عرب کے تمام قبائل میں قریش کو ایک نمایاں اور برتر مقام حاصل ہوا۔ ان کے تجارتی قافلے سردیوں میں یمن کا سفر کرتے تھے اور گرمیوں میں شام کا سفر کرتے تھے قریش کے ان اسفار کا ذکر قران کریم میں بھی ہوا ہے: ''لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ'' (قریش کو رغبت دلانے کے لیے، انھیں سردیوں اور گرمیوں کے (تجارتی) سفر سے رغبت دلایا)۔

عرب تاجروں نے مالابار (کیرالا) کے ساحلوں پر اپنی کوٹھیاں بنا رکھی تھیں جہاں وہ طویل عرصے قیام بھی کیا کرتے تھے۔ بعض عربوں نے مقامی عورتوں سے شادیاں بھی کر لی تھیں۔ اسلام کی آمد کے بعد ان عربوں نے جنوب ہندوستان میں اسلام کی نشر و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔

5.5.4 ہندوستانی برآمدات

ہندوستان سے جو اشیا عرب ملکوں اور وہاں سے یوروپین ممالک کو بھیجی جاتی تھیں ان کی ایک طویل فہرست ہے جن میں معدنی، نباتی اور حیوانی پیداوار وغیرہ شامل تھیں۔ اہم اشیا حسب ذیل تھیں۔

1۔ بیش قیمت پتھر اور جواہرات
2۔ مسالہ جات اور خوشبویات
3۔ دوائیں اور جڑی بوٹیاں
4۔ مختلف قسم کی لکڑیاں
5۔ مختلف انواع کے رنگ اور رنگائی میں کام آنے والی چیزیں
6۔ روئی اور مختلف قسم کے کپڑے

7۔ پھل اور معدنی اشیا

8۔ جانور اور پرندے

9۔ تلوار، بھالے اور کمان

10۔ گینڈے کی سینگ اور کھمبات کی چپلیں

ان ہندوستانی برآمدات کے ذکر سے عربی ادب اور عربی شاعری بھری پڑی ہے، بالخصوص ہندوستانی تلوار یا ہندوستانی فولاد سے بنی ہوئی تلوار کا عربی ادب میں خوب ذکر ملتا ہے۔اوران تلواروں کے کئی نام عربی ادب وشاعری کا جزو لاینفک بن گئے ہیں، جیسے ہندوانی، ہندی اور مہند وغیرہ۔

5.5.5 عربی برآمدات

عرب بھی بہت ساری چیزیں ہندوستان بھیجتے تھے، ان میں سے کچھ مقامی مصنوعات ہوتی تھیں اور کچھ مصروشام اور افریقہ کی درآمدات بھی شامل ہوتی تھیں۔ان عربی برآمدات میں سرفہرست عربی گھوڑے، شراب، مرجان، کپڑے، چاندی، زعفران اور کھجور وغیرہ شامل تھے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنی کس کتاب میں ہندوستان سے متعلق اسلامی روایات کا ذکر کیا ہے؟

2۔ شہرستانی نے اپنی کتاب میں دنیا کی کن چار بڑی قوموں کا تذکرہ کیا ہے؟

3۔ مصری تہذیب کس دریا کے کنارے قائم تھی؟

4۔ عرب کی دو بندرگاہوں کے نام بتایئے۔

5۔ قران کی کس سورت میں قریش کے تجارتی سفر کا ذکر ہوا ہے؟

6۔ قلزم کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟

7۔ حضرت سلیمان ہندوستان کی کس بندرگاہ سے سامان منگواتے تھے؟

5.6 دینی تعلقات

ہندوستان میں موہنجوداڑو اور ہڑپا اور موسوپوٹامین (مابین النہرین) تہذیبوں کے زیرزمین ملنے والے آثار سے اس بات کا بھی سراغ ملتا ہے کہ ماضی قدیم کی ان تہذیبوں کے درمیان صرف تجارتی اور فنی تعلقات ہی نہیں تھے بلکہ دینی اور فکری روابط بھی ان تہذیبوں کو باہم جوڑتے تھے۔

عرب اور ہندوستانیوں کے درمیان بہت سے دینی عقائد اور رسوم مشترک تھے چنانچہ شرک، بت پرستی، سیاروں اور ستاروں کی تعظیم اور ان کی عبادت وغیرہ دونوں کے درمیان مشترک دینی اقدار تھے۔ دنیا کے کئی بڑے بتکدے بھی دونوں کے نزدیک اہم زیارت گاہ تھے۔شہرستانی متوفی 1153ء نے مذاہب عالم کے تذکرے پر مشتمل اپنی کتاب الملل والنحل میں عرب و ہند کے سات عدد مشترک بتکدوں کا تذکرہ کیا ہے، ان میں سے اصفہان، ملتان، بلخ، فرغانہ اور یمن کے بتکدوں کے ساتھ ساتھ مکہ میں کعبہ اور ہندوستان میں واقع سدوسان نامی شہر کا بتکدہ بھی شامل تھا۔شہرستانی نے ایک ہندوستانی فرقے کا ذکر کیا ہے جو کہ ملت ابراہیمی پر تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل مکے کی کئی اہم شخصیات کا تعلق بھی ملت ابراہیمی سے تھا جن میں زید بن عمر، امیہ بن ابی صلت اور قس بن ساعدہ وغیرہ سرفہرست تھے۔عرب تاجر ہندوستان سے صرف تجارتی سامان ہی نہیں لے گئے بلکہ بہت سے افکار وعقائد بھی لے گئے تھے، جن میں تناسخ اور لاہوتیت (ادویت واد) وغیرہ شامل ہیں۔ ہندوستانی کعبہ کی تعظیم کرتے تھے، اور وہاں نذر وتحائف بھیجتے تھے۔جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب نے زمزم کے کنویں کو از سرنو کھدوایا تو اس میں سے سات ہندوستانی تلواریں برآمد ہوئیں ممکن

ہے کہ یہ تلواریں ہندوستانی تحفوں میں شامل رہی ہوں۔

5.6.1 ہندعرب دینی تعلقات اور بدھ مذہب

ہندعرب کے دینی تعلقات کو استوار کرنے میں بدھ مذہب نے اہم کردار ادا کیا ہے۔عرب ملکوں میں بدھ ازم سمنیہ یا شمنیہ کے نام سے معروف تھا۔عربی کتب تاریخ اور سفرناموں میں کوئی بھی قابل ذکر کتاب بدھ ازم (سمنیہ) کے ذکر سے خالی نہیں ہے۔شہرستانی نے بھی اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے ندیم متوفی 945ء نے اپنی کتاب الفہرست میں بدھ کے مجسمے کا تفصیلی ذکر کیا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے بدھ کے ایک مجسمے کو بغداد میں دیکھا بھی ہے۔

بدھ ازم نے قبل اسلام عربوں کی دینی فکر پر گہرا اثر ڈالا تھا،اوراس وقت یہ مذہب جزیرہ نما عرب،عراق،شام اور مصر میں پھیلا ہوا تھا،مؤرخ مسعودی متوفی 957ء نے بدھ مذہب اور قریش کی عبادت میں کئی چیزیں قدر مشترک کے طور پر ذکر کی ہیں، یہ مشابہت عرب و ہند کے دینی تعلقات کا نتیجہ بھی ہوسکتی ہے اور یہ محض ایک اتفاق بھی ہوسکتا ہے۔اسلام کے بعد بھی بدھ ازم کے فکر وفلسفے نے مسلم فلسفے اور علم کلام کے کئی اسکولوں کو متاثر کیا چنانچہ بعض معتزلی علما اور متکلمین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بدھ ازم کے افکار اور فلسفے سے متاثر تھے۔

5.7 علمی وتمدنی تعلقات

عرب و ہند کے تعلقات کا ایک نمایاں پہلو علمی و تمدنی تعلقات بھی ہیں ،یہ تعلقات بھی تجارتی اور دینی تعلق کی طرح متنوع اور ہمہ جہتی ہیں عرب اور ہندوستان دونوں نے ایک دوسرے کے علوم وفنون سے استفادہ کیا، ہندوستانی علوم اور علما نے عرب اسلامی تہذیب کے قیام اور ترقی میں اہم کردار ادا کیا تو اسلامی عربی تہذیب سے ہندوستان نے بھی ہمہ جہت اثر قبول کیا اور فائدہ اٹھایا ہے۔

ہندوعرب علمی تعلقات متنوع ہی نہیں قدیم بھی ہیں۔اس کا ایک قدیم ترین مظہر ہندوستان میں فینیشی رسم الخط کا وجود ہے۔مولانا سید سلیمان ندوی نے مستشرق بوہلر(Buhler) کے حوالے سے لکھا ہے کہ قدیم ہندوستانی رسم الخط جس میں موریہ(Mouryan) اور آندھرا(Andhara) حکومتوں کے نقوش دریافت ہوئے ہیں وہ سامی الاصل ہیں، یعنی جزیرہ نما عرب میں نشو نما پانے والے رسم الخط میں سے کوئی خط اس کی اصل ہے بلکہ وہ فینیشی حروف سے مشابہت رکھتے ہیں جو فینیشی تاجروں کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئے ہوں گے۔علاوہ ازیں شہنشاہ اشوک نے 203 سے 201 ق م کے درمیان بدھ ازم کی تعلیمات کی نشر واشاعت کے لیے جو کتبات تیار کروائے تھے ان سب کی تحریر داہنے سے بائیں جانب لکھی گئی ہے، جو عربی اور سامی رسم الخط کی خاصیت ہے جبکہ سنسکرت اور دوسری ہندوستانی زبانیں بائیں سے دائیں لکھی جاتی ہیں۔

326 ق م میں ہندوستان پر سکندر اعظم کے حملے کے بعد ہندوستان، عرب اور یونان کے درمیان علمی تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ میگستھنیز (Magasthenes) نامی یونانی سفیر نے چندر گپت موریہ کے عہد کے ہندوستان کا عمدہ وصف بیان کیا ہے۔اس نے اپنی ان یادداشتوں میں اس وقت کے ہندوستان کے سیاسی ،سماجی ،فکری اور اقتصادی احوال کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے، یہ یادداشت ایک اہم تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔اسی طرح اسکندریہ مصر کے یونانی حاکم اور فلکیات کی مشہور کتاب مجسطی کے مصنف بطلیموس بھی ہندوستان سے سفارتی تعلقات رکھتا تھا۔ان تعلقات کی بدولت بہت سے ہندوستانی افکار اسکندریہ پہنچے اور یونانی افکار ہندوستانی فکر کا حصہ بن گئے اور ہندو یونان کے یہ تعلقات ہندوعرب کے علمی وتمدنی تعلقات کو مضبوط بنانے میں بے حد معاون ثابت ہوئے کیونکہ عرب کی سرزمین ہی ان علمی قافلوں کی گزرگاہ تھی اور ان فکری تبادلوں کا راستہ تھی۔

مدرسہ اسکندریہ کے خاتمے کے بعد ایرانی حکمران نوشیرواں (531-579ء) نے ایرانی شہر جندیسا پور (Gundeshapur) میں واقع علمی درسگاہ کو ایک عظیم الشان علمی مرکز میں تبدیل کردیا۔اس درسگاہ یا علمی اکادمی کی بنیاد شاپور اول نے ڈالی تھی جہاں ہندی، فارسی ،عربی اور یونانی علوم وفلسفہ

باہم شیر وشکر تھے۔ یہ علمی ادارہ اسلامی فتوحات کے بعد بھی کافی عرصے تک برسر کار رہا۔

سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب عرب ہند کے تعلقات میں سوامی دیا نند سرسوتی کی کتاب ستیا رتھ پرکاش کے حوالے سے لکھا ہے کہ مہابھارت کی جنگ کے دوران جب کورو نے پانڈو کو موم سے بنے ہوئے گھر میں جلا کر مارنے کی سازش کی تو ان دونوں کے مشترکہ استاد درونا چاریہ نے یدھشٹر کو اس سازش کے بارے میں عربی زبان میں اطلاع دی اور یدھشٹر نے بھی اسی زبان میں ان کو جواب دیا۔ اگر یہ حکایت درست ہے تو اس بات کی غماز ہے کہ ہندو عرب کے علمی تعلقات حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے بھی پہلے قائم تھے اور ہندوستان میں عربی زبان خفیہ زبان کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔

بلاد عرب میں ہندوستان کی دوائیں اور جڑی بوٹیاں بہت مقبول و مشہور تھیں جن میں عود ہندی، اطریفل (تری پھلا) ہلیلج (ہریں) بلیلج (بہیرا) قسط ہندی، بلاذر اور ذریرہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس تمدنی لین دین میں ہندوستان سے عرب پہنچنے والی چیزوں میں دو مشہور کھیل چوسر اور شطرنج بھی شامل ہیں۔ یہ دونوں محض کھیل نہیں ہیں بلکہ زندگی کے دو فلسفوں کی نمائندگی کرتے ہیں، چوسر فلسفہ جبر کی نمائندگی کرتا ہے اور یہ پیغام دیتا ہے کہ انسان اپنی زندگی میں مجبور محض ہے اور اس کے اپنے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے جبکہ شطرنج کا کھیل اپنے لامحدود امکانات کے ساتھ چوسر اور اس سے نکلنے والے فلسفے کی ضد ہے۔

5.7.1 لسانی تبادلہ

اگر لسانی لین دین اور الفاظ کا تبادلہ علمی تعلقات کا مظہر اور اس کی دلیل ہے تو عربی اور ہندوستانی دونوں زبانیں ان تعلقات کی قوت و قدامت کی گواہ ہیں۔ ہم ہندوستانی زبانوں بالخصوص اردو زبان پر عربی کے اثرات سے بخوبی واقف ہے اور ہزاروں عربی الفاظ اپنی روزمرہ کی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ اگر ہماری زبان سے عربی کے الفاظ نکال دیے جائیں تو اس میں گفتگو کرنا محال ہو جائے۔ لیکن یہاں ہم صرف عربی زبان میں ہندوستانی زبانوں کے الفاظ کا سرسری جائزہ لیں گے کیونکہ یہ ہندو عرب کے علمی و تمدنی تعلقات کی مضبوط اور عمدہ دلیل ہیں۔

زیادہ تر ہندوستانی الفاظ جو عربی زبان میں داخل ہوئے ان کا تعلق انھیں اشیا سے ہے جنھیں عرب ہندوستان سے منگواتے تھے۔ ان میں خوشبویات، مسالہ جات اور جواہرات وغیرہ شامل تھے۔ ان سے متعلق زیادہ تر عربی الفاظ ہندوستانی الاصل ہیں اور یہ بات عربی لسانیات کے مسلمات میں سے ہے۔ ان میں سے چند الفاظ حسب ذیل ہیں:

مسک	(Mushka)	قرنفل	(Kanakphal)
صندل	(Chndan)	کافور	(Karpura)
ہیل	(الائچی Eil)	جائفل	(Jaephal)
فلفل	(سیاہ مرچ Pipalli)	زنجبیل (ادرک۔ Zanjabira)	
ساج	(Sag)	ساسم	(Sheesham)
نارجیل	(Narkila)	انج	(Amba)
موز	(Mocha)	لیمون	(Limu)
اطریفل	(Triphala)	ہلیلج	(Harra)
بلیلج	(Bahera)	فوطہ	(Pat)
قرفس	(Kerpas)	شیت	(کپڑے کی قسم۔ Cheet)

ان میں سے کم از کم تین الفاظ قرآن کریم میں وارد ہوئے ہیں اور وہ ہیں: مسک (مشک) کافور اور زنجبیل (ادرک)۔

5.7.2 علمی وتمدنی تعلقات ظہور اسلام کے بعد

ہندوعرب کے درمیان علمی وتمدنی روابط کا تسلسل ظہور اسلام کے بعد بھی قائم رہا بلکہ اور مضبوط ہوا اور ان تعلقات کا دائرہ بھی وسیع ہوا۔ اسلامی فتوحات کے بعد ہندوستانی لوگ امن اور رزق کی تلاش میں فوج در فوج عرب شہروں اور تہذیبی مراکز کی طرف متوجہ ہوئے ۔ یہ لوگ اپنے ساتھ اپنی تہذیبی شناخت کو بھی لے کر گئے اور انھیں عربی تہذیب و ثقافت میں ضم کر دیا ۔عرب سرزمین پر پہلے سے موجود ہندوستانی جماعتوں اور ان نووارد ہندوستانیوں نے مل کر عربی تہذیب و ثقافت کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا ۔ان ہندوستانیوں میں بڑے نامور لوگ بھی ہوئے جنھوں نے اموی اور عباسی حکومتوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

ابو حارثہ ہندی نامی شخص عباسی خلیفہ مہدی کے عہد میں بیت المال کا نگراں تھا۔ یہ ہمارے ملک میں ریزرو بینک کے گورنر کے برابر کا منصب تھا۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ ابو سالم زوطی نامی ایک شخص حضرت علی کی خلافت میں بصرہ کے بیت المال کا ذمہ دار تھا۔ ہندوستانیوں کو طب اور مالیاتی امور میں خاص مہارت حاصل تھی ۔حساب و کتاب میں اپنی مہارت کی وجہ سے مالیاتی امور میں ہندوستانیوں کو خصوصی ترجیح دی جاتی تھی۔ ان میں ابو رواح سندھی کا نام بے حد مشہور ہے۔ جاحظ نے خصوصیت سے ان کا ذکر کیا ہے۔ دواؤں کی ہر دکان پر کوئی نہ کوئی سندھی ضرور ہوتا تھا۔

بے شمار ہندوستانی خواتین مختلف حیثیتوں سے عرب خاندانوں میں داخل ہوئیں، مشاہیر عرب نے ان سے شادیاں کیں، مشہور ہے کہ محمد بن حنفیہ کی ماں خولہ بنو حنیفہ سے نہیں تھیں بلکہ بنو حنیفہ کی باندی تھیں اور ہندوستانی نسل سے تھیں۔ امام حسین کی ایک اہلیہ بھی سندھ سے تھیں جن کا نام سلافہ تھا۔ علاوہ ازیں حضرت علی بن حسین زین العابدین کی اہلیہ اور زید شہید کی والدہ حیدان بھی ہندوستانی نژاد تھیں۔ خلیفہ یزید بن عبدالملک کی ایک منھ بولی بیٹی تھی جس کا نام حبابہ تھا۔ خلیفہ نے اس کی شادی عراق کے اپنے گورنر کے ساتھ کرائی تھی۔

نغمہ سراؤں میں بھی ہندوستانی مرد وخواتین کی اچھی تعداد تھی، جن میں سرفہرست نام خمار قندھاریہ کا تھا جن کے نغموں کو ابراھیم موصلی جیسے ماہر فن نے موسیقی دی تھی۔

جن ہندوستانی خاندانوں کو عباسی عہد میں غیر معمولی عروج حاصل ہوا ان میں سندھی بن شاہق کا خاندان بھی تھا۔ اس کے دو بیٹوں ابراھیم اور نصر کا جاحظ نے بہت تذکرہ کیا ہے اور دونوں کے علم وفن کو اپنی کتاب البیان والتبیین میں جا بجا سراہا ہے۔

ہندوعرب کے مابین علمی اور ثقافتی تعلقات کا ایک اور اشاریہ عرب کے مختلف شہروں اور خلفا وامرا کے درباروں میں ہندی نژاد علما اور فنانین کی کثرت بھی ہے ،جنھوں نے عربی تہذیب اور اسلامی تمدن کے محل کی تعمیر میں خصوصی کردار ادا کیا ۔انھیں علما کے ذریعے ہندوستانی علوم وفنون عربی زبان میں منتقل ہوئے ۔خلفائے بنی عباس اور ان کے وزرا بالخصوص برامکہ اہل علم کا غیر معمولی اکرام کرتے تھے جس کے نتیجے میں مختلف علوم وفنون کے بے شمار ہندوستانی علما اور ماہرین بغداد میں جمع ہوگئے ۔طب، نجوم، فلکیات، حساب اور فلسفہ وغیرہ کے ماہرین سے بغداد پٹ گیا تھا، جن میں ایک بڑی تعداد ہندوستانیوں کی بھی تھی۔

ہندوستانی اطبا خلفا کے درباروں اور امرا کی مجلسوں میں خاص مقام رکھتے ہیں ۔ہندوستانی اطبا اور ادویہ دونوں اہمیت کے حامل تھے۔ مشہور طبیبوں میں منکہ ہندی سرفہرست تھے جنھیں یحییٰ برمکی نے ہندوستان سے بلوایا تھا۔ بہلہ ہندی نامی طبیب بھی خاص مقام رکھتا تھا۔ ان کا بیٹا صالح بھی نامور طبیب تھا۔اس نے خلیفہ کے بہنوئی ابراہیم کا کامیاب علاج کیا تھا جب کہ دربار کے سب سے بڑے طبیب بختیشوع نے ان کے مرض کو لاعلاج قرار دے دیا تھا۔ ابن دہن، شاناق اور صنجہل ہندی کا نام بھی اس عہد کے بڑے اطبا میں شمار ہوتا ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے اپنی کتاب 'عیون الانباء فی طبقات

الاطباء میں بارہواں باب ہندوستانی اطبا کے ذکر کے لیے مخصوص کیا ہے۔کتاب الفہرست کے ساتویں مقالے کے تیسرے فن (فصل) میں ہندوستانی طبی کتابوں کا اور اسی مقالے کے دوسرے فن میں یہاں کے اطبا کا ذکر کیا گیا ہے۔

ہندوستانی اصل علما نے مختلف علوم وفنون میں بھرپور حصہ لیا، جیسے حدیث، فقہ، تاریخ، ادب اور شعر وغیرہ۔ان مشاہیر علما میں ابومعشر نجیح بن عبد الرحمان سندھی متوفی 786ھ کا نام سب سے نمایاں ہے۔ان کی کتاب 'المغاری' اسلامی عربی میراث میں اہم مقام رکھتی ہے۔ان کی نماز جنازہ خود خلیفہ ہارون رشید نے پڑھائی تھی۔ان کے علاوہ ہندوستانی نژاد محدثین کی ایک طویل فہرست ہے جن کا ذکر اسماء رجال کی کتابوں میں ملتا ہے۔

فقہا میں امام مکحول متوفی 735ء، امام عبدالرحمان اورزاعی متوفی 774ء اور ابوسعید مالکی وغیرہ وہ مشاہیر ہیں جن کے بارے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ ہندوستانی نژاد تھے۔خود امام اعظم ابوحنیفہ متوفی 767ء کے بارے میں بعض محققین کی رائے ہے کہ ان کے آبا واجداد ہندوستانی تھے۔ ہندوستانی الاصل مشاہیر میں منصور بن محمد سندھی بھی تھے، جن کا شمار علم تجوید ونحو کے اماموں میں ہوتا ہے۔اس ضمن میں ابراہیم بن سندھی بن شاہک بھی ایک اہم نام ہے جو علم کلام کے بڑے علما میں گنے جاتے تھے۔مشہور معتزلی عالم عمر بن عبید باب سندھی کے نام بھی قابل ذکر ہے، جن کے نام سے معتزلہ کا ایک فرقہ عمریہ بھی معروف ہے۔

شعر وادب کے حوالے سے ابوعطا سندھی متوفی 796ء، ابوالہندی متوفی 796ء، کشاجم بن سندھی بن شاہک متوفی 961ء اور ابوصلع سندھی وغیرہ وہ نام ہیں جو عربی ادب کے آسمان پر ہمیشہ ستاروں کی مانند روشن رہیں گے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوعرب تعلقات خواہ اسلام سے پہلے ہو یا اسلام کے بعد میں، ہر دور میں بے حد مضبوط اور مستحکم رہے ہیں۔اوردونوں ملکوں کے باشندوں نے ان تعلقات سے غیر معمولی فائدہ اٹھایا ہے۔بلاشک وشبہ یہ تعلقات انسانی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ ہندوعرب کے درمیان کتنے مشترک بتکدے تھے؟

2۔ ملت ابراہیمی پر عمل پیرا مکے کی کسی شخصیت کا نام بتائیے۔

3۔ عرب ملکوں میں بدھ ازم کو کیا کہا جاتا تھا؟

4۔ آندھرا کے نقوش کس رسم الخط میں لکھے گئے ہیں؟

5۔ سکندر اعظم نے ہندوستان پر کس سنہ میں حملہ کیا تھا؟

6۔ فلکیات کی مشہور کتاب مجسطی کس کی تصنیف ہے؟

7۔ عربوں میں مشہور ہندوستانی دوائی اطریفل کو ہندی میں کیا کہتے ہیں؟

8۔ قرآن میں وارد کوئی ہندوستانی لفظ بتائیے۔

9۔ معتزلہ کا فرقہ عمریہ کس ہندوستانی الاصل شخصیت کی جانب منسوب ہے؟

10۔ خلیفہ ہارون رشید نے کس ہندوستانی الاصل محدث کی نماز جنازہ پڑھائی؟

5.8 ہند ایران تعلقات

ہندوستان اور ایران کے باہمی سیاسی، تمدنی، ثقافتی اور لسانی تعلقات کی تاریخ، ازمنہ قدیم میں آریائی قبائل کی نقل مکانی اور توسیعی تحریکات کی تاریخ سے جاملتی ہے۔یہ آریائی قبائل حضرت عیسیٰ سے دو ہزار سال سے بھی پہلے اپنے اصلی وطن سے ہجرت کر کے ایک طرف تو یوروپ کے مختلف مقامات

کو پہنچتے ہیں تو دوسری طرف ایشیائے کوچک سے ہوتے ہوئے ایران اور پھر ہندوستان کے زرخیز علاقوں میں قیام پذیر ہوتے ہیں۔اور مآخذ کی روشنی میں 2000 قبل مسیح میں آریائی قبیلے کی شمال مغربی ایران میں موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔جب کہ 1500 قبل مسیح میں یہ قبائل ایران کے مشرقی علاقوں تک پھیل چکے ہیں اور سرزمین ہندوستان کی جانب کوچ کرتے جاتے ہیں۔اس طرح ہندوستان میں آریائی قبائل کے داخلہ کی تاریخ 1500 قبل مسیح طے پاتی ہے۔

آریائی تہذیب یا ہندآریائی ثقافت، اپنے آپ میں ایک کثیر الجہات خصوصیات کی حامل واقع ہوئی ہے۔جس کے ہر پہلو کے تجزیاتی مطالعے صدیوں سے اہل علم و دانش حضرات کی خاص توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ان میں ماہرین عمرانیات اور ماہرین لسانیات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

زبانوں کے ارتقائی منازل کے مطالعہ اور لسانیاتی تجزیات سے حاصل ہونے والے نتائج کی رو سے انسانی تمدن کی تاریخ مرتب کرنے کی کوششیں بھی بڑی اہم ہیں۔جس کی روشنی میں، موجودہ متمدن دنیا کی مشہور زبانیں جو ارتقائی منزل میں اعلیٰ سطح پر ہیں، ان کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ایک گروہ ہندآریائی یا آریائی کہلاتا ہے اور دوسرا گروہ سامی۔

ہندآریائی زبان، آریائی اقوام میں مشترکہ طور پر رائج رہی، جو موجودہ عہد کے ہندوستان کی اکثر ہند یوروپی زبانوں کی اساس ہے۔اس لحاظ سے ایرانی اور ہندی گروہ کی زبانیں ایک ہی مشترکہ اصل کی شاخیں ہے۔ ہندآریائی یا آریائی گروہ ثقافتی اور سماجی اہمیت کے علاوہ لسانیاتی نقطۂ نظر کے لحاظ سے بھی سب سے بڑا اور اہم ترین لسانی خانوادہ تسلیم کیا جاتا ہے۔اس کا دائرہ اثر بہت ہی وسیع ہے۔شمالی اور جنوبی یوروپ، روس، ایشیائے کوچک، ڈنمارک کی اسکینڈینیویائی، لاطینی، البانی، اطالوی، یونانی، فرانسیسی، ٹیوٹانوی زبانیں، سرزمین ایران کی تمام ہندایرانی زبانیں، لہجے اور بولیاں، جیسے قدیم پارسی، اوستائی، پہلوانیک، پارسیک، پہلوی، جدید فارسی، طبری، تاجیکی، گیلیکی، پشتو، دری، افغانی، بلوچی وغیرہ، اور سرزمین ہند کی تمام ہندآریائی زبانیں، لہجے یا بولیاں جیسے قدیم سنسکرت، پراکرت، برج بھاشا، پنجابی، ہریانوی، قنوجی، کھڑی بولی، اودھی، بنگالی، مراٹھی، ہندوی، اپ بھرنش زبانیں تمام ایک ہی لسانی خانوادہ ہندآریائی سے تعلق رکھتی ہیں۔ جب کہ سامی زبانوں کی اصل جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی خطہ سے تعلق رکھتی ہے۔سامی گروہ کی مشہور زبانوں میں بابلی، سریانی، عبرانی، ارامی، فینیقی، حبشی اور عربی زبانیں شامل ہیں۔

ہندوستان اور ایران کی زبانوں کا ایک ہی اساس سے تعلق رکھنا ہی وہ بنیادی وجہ ہے کہ قدیم پارسی زبان اور قدیم سنسکرت زبان ایک دوسرے سے لسانی اعتبار سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی ہیں۔اور ان کا تقابلی مطالعہ ماہرین لسانیات کے لیے ایک بہت ہی اہم اور دلچسپ موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی ہمیں دسویں صدی عیسوی کے عہد میں دستیاب ہوتی ہے۔1000ء میں جب ہندوستان کی وسیع سرزمین پر جدید آریائی زبانوں اور لہجوں کا فروغ ہو رہا تھا اور اپ بھرنش بولیوں میں ادبی ارتقا عروج پر تھا تو سارے شمالی ہندوستان میں گنگا جمنا کے میدانی علاقوں میں پنپنے والی شورسینی اپ بھرنش ادبی زبان کی شکل اختیار کر رہی تھی۔اس صورت حال میں جب مغربی خطوں میں جدید فارسی زبان سے اس کا پہلے تصادم ہوتا ہے پھر اختلاط، جس کے نتیجہ میں ایک نیا لہجہ ایک نئی بولی ہندوی (اردو) کی تشکیل عمل میں آتی ہے جو کہ نئی اصوات، نئے الفاظ کے ذخیرے اور نئے ثقافتی ورثہ کی بنا پر اپنی قدیم مقامی خصوصیات کے ساتھ ساتھ جدت طرازیوں کے ڈھانچوں میں ڈھالی جاتی ہے اور ایک نئے امتزاجی مزاج کے ساتھ سرزمین ہند میں پروان چڑھتی ہے۔ایک ہی لسانی خانوادہ سے تعلق رکھنے کی بنا پر یہ اثر پذیری اور اثر اندازی بڑی ہی تیز رفتار رہی اور برصغیر ہند کی سرزمین میں برج بھاشا، کھڑی بولی اور دیگر ہندوستانی بولیاں، فارسی زبان کے اثر و تاثیر کے تحت اس ہندوی لہجہ، یا مستقبل کی اردو زبان کی تکوین میں مشغول نظر آتی ہیں۔لسانی جہت کے علاوہ ہندوستان اور ایران کے عہد قدیم سے ہی سیاسی، تجارتی اور سفارتی تعلقات کے حوالے بھی تاریخ میں درج ہیں۔

قدیم ایران کے ہخامنشی دور کے عظیم فاتح کوروش کبیر اور داریوش اعظم کی فتوحات ہندوستان کی سرحدیں عبور کر چکی تھیں۔اس کے علاوہ ایران اور ہندوستان کے حکمران، شہنشاہوں اور مہاراجاؤں کی سرپرستی میں بحیرہ عرب اور خلیج فارس کے درمیان تجارتی اغراض سے بحری بیڑے رواں دواں رہتے

تھے۔سکندر رومی کے ہاتھوں ہخامنشی سلطنت کے خاتمہ کے بعد سکندر کے نائب سیلوکس کی حکمرانی ، ایرانی اور ہندوستانی مفتوحہ علاقوں پر یکساں رہی ۔رومی حکمرانی کے اس دور میں بھی شمال مغربی ہند کے بیشتر علاقے ایرانی تہذیبی وثقافتی عناصر کے اثرات قبول کر رہے تھے۔

ساسانی خاندان کی وسیع اور مستحکم سلطنت کے تحت ایران نے اپنی شان وشوکت اور جاہ وجلال کا لوہا پھر سے منوالیا۔اور خاص طور پر شہنشاہ عادل کیخسر ونو شیروان کے عہد میں ہندو ایران تعلقات کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔انو شیروان ادبیات کے فروغ کے لیے بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔اس کے عہد میں کئی علمی ،فلسفیانہ اور اصول اخلاق پر مبنی اہم کتابیں یونانی اور سنسکرت زبانوں سے پہلوی زبان میں ترجمہ ہوئی تھیں جس میں سنسکرت کی مشہور اصول اخلاق کی کتاب پنچ تنتر بھی شامل ہے۔یہ کتاب ہندوستانی اخلاقی ادب کی مایہ ناز تالیف سمجھی جاتی ہے۔اس میں جانوروں کی زبان میں حکایتوں کے ذریعہ اصول اخلاق بیان کیے گئے ہیں۔حکیم برزویہ یا بزرجمہر نے جو کہ ایرانی بادشاہ نو شیروان کے دربار کا طبیب تھا' وہ ہندوستان سے یہ کتاب لے آیااور''کلیلک دمنک'' کے نام سے اس کا پہلوی میں ترجمہ کیا۔اس کتاب کا اگلے ادوار میں بھی پہلے پہلوی سے عربی میں کلیلہ ودمنہ' نام سے ،عربی سے جدید فارسی میں کلیلہ ودمنہ،انوار سہیلی اور پھر اکبر بادشاہ کے زمانے میں ہندوستان میں عیار دانش کے نام سے بار بار ترجمہ اور ترمیمات کی جاتی رہیں جو اس کتاب اور اس میں شامل اصول اخلاق کی اہمیت کے مظہر ہیں۔

ساسانی خاندان کی حکومت ،عرب افواج کے ہاتھوں شکست کھا جاتی ہے اور ایران کی سرزمین عرب حکمرانوں کے زیرنگین ہو جاتی ہے۔ایک جانب تو عربی فاتح قوم کی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ اس مذہب کی نمائندہ زبان تھی جسے تقریباً پورے ایران نے قبول کر لیا تھا۔اس کے علاوہ اس وقت ایران میں متعدد بولیاں رائج تھیں۔ پہلوانیک ،پارسیک، پہلوی اور وہ درباری فارسی ، جسے دری کہتے تھے مرکزیت کی حامل تھی لیکن اس کا رسم الخط انتہائی پیچیدہ تھا۔جب ایرانیوں نے عربی رسم الخط پر اپنی زبان کا رسم الخط اختیار کیا تو فارسی پر عربی اثرات بہت تیز رفتاری سے رونما ہونے لگے۔الفاظ کا ایک وسیع ذخیرہ جدید پارسی یا فارسی زبان میں درآیا۔

سیاسی برتری ، مذہبی تقدس اور لسانی اعتبار سے ایک طاقتور زبان کی حیثیت سے عربی زبان تمام مفتوحہ علاقوں پر اپنی چھاپ چھوڑ رہی تھی۔اس کے اثرات اتنے دوررس تھے کہ اس کے سیلاب سے کوئی زبان محفوظ نہ رہ سکی۔ یہاں تک کہ ایرانی زبان جو کہ لسانی اعتبار سے مختلف خانوادہ سے تعلق رکھتی تھی ،اس کو بھی کافی حد تک متاثر کیا۔اس اثر ونفوذ کے اسباب میں سیاسی ، مذہبی اور ثقافتی کے علاوہ لسانی اسباب بھی شامل رہے۔لیکن ایک امر مسلمہ یہ بھی ہے کہ ایران میں تقریباً تین صدیوں تک علمی وادبی حلقوں پر اپنا تسلط بنائے رکھنے کے باوجود مقامی ایرانی زبانوں یا ایرانی لہجوں کی جگہ لینے میں کامیاب نہ ہوسکی۔عربی زبان چونکہ سامی الاصل ہے اس بنا پر بھی ہند ایرانی یا ہند آریائی زبانوں کے علاقے میں عوام میں اپنا کوئی مقام نہ بنا سکی۔گو کہ درباروں میں اور علما اس کی مذہبی اور علمی برتری کی بنیاد پر سرپرستی کرتے رہے۔عربی رسم الخط کے اختیار کرنے کی بنا پر بھی اگرچہ فارسی زبان نے بڑی تیزی اور آسانی سے بے شمار عربی الفاظ مستعار لیے اور اپنے دامن کو کشادہ اور مالا مال کیا۔لیکن لسانی خانوادہ کے جداگانہ ہونے کی بنا پر فارسی زبان نے اس سامی الاصل الفاظ کو ہند ایرانی مزاج کے مطابق ڈھال کر اپنایا اور مفرس عربی الفاظ کی ایک کثیر تعداد فارسی زبان میں دخیل الفاظ کی حیثیت سے مستعمل ہوتی رہی۔عربی الفاظ کو مفرس کرنے کے اس عمل کی بدولت ایرانی فارسی زبان کی اپنی ذاتی حیثیت اور انفرادی شناخت باقی رہ سکی اور عربی اثرات صرف ذخیرہ الفاظ کی تشکیل تک محدود رہ گئے۔ان عربی اثرات کی بنا پر جدید پارسی زبان ، فارسی جدید یا اسلامی فارسی بھی کہلائی جانے لگی۔مستعار عربی الفاظ سے اپنے ذخیرہ الفاظ کو جہاں فارسی زبان نے رونق بخشی وہیں ،عربی زبان دیگر لسانی جہات پر اثر اندازی میں پیش رفت کے لیے رکاوٹ کا سبب بنی اور ایک علمی وادبی زبان کی حیثیت سے فارسی زبان ،ترقی کے منازل طے کرتی رہی۔

سامانی دربار میں فارسی زبان وادب کی سرپرستی بڑے پرشکوہ پیمانے پر ہونے لگی۔رودکی اور دیگر شعرا کے نغموں کی گونج ، فارسی کی شیرینی کو علما

اور امرا میں مقبول کر رہی تھی۔غزنوی، سلجوقی، تیموری حکمران گو کہ ایران پر حکومت کرنے والے ترک نژاد فاتح تھے لیکن ان کے درباروں میں فارسی کی حکمرانی عروج پر تھی۔فردوسی، عنصری، انوری، خیام، عطار، سنائی، رومی، حافظ' سعدی وہ نام ہیں جنھوں نے اپنی عظیم تخلیقات کے ذریعہ فارسی زبان و ادبیات کو آسمان کی بلندیوں سے ہمکنار کیا۔

مسلمانوں کی فتح سندھ کے نتیجہ میں سلطنت اسلامی کی سرحدیں جو کہ مشرقی ایران تک محدود تھیں، توسیع پا کر صوبہ سندھ تک پھیل گئیں۔ دوسو سال بعد جب صفاریوں کے تحت ایک خودمختار ایرانی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو مشرقی ایران وخراسان کا بیشتر علاقہ بشمول سندھ اور ہندوستانی وافغانی سرحدوں کے صوبہ جات، ایرانی حکومت کے تحت آ گئے اور ایرانی تہذیب وثقافت کے راست اثرات نمایاں ہونے لگے۔مزید برآں، محمود غزنوی کی فتوحات کے بعد لاہور اسلامی بلکہ ایرانی تمدن کا گہوارہ بن گیا۔محمود غزنوی کی قیادت میں سرانجام پانے والی مہمات میں شامل ترک افواج فارسی تمدن و ثقافت کے اثرات کو سرزمین ہند کے شمال مغربی علاقوں میں تقویت بخش رہی تھیں۔ایک بڑی مقامی آبادی ان سے باہمی رابطہ بنا رہی تھی۔دوسری جانب فارسی زبان کے قادر الکلام شعرا ابوالفرج روفی، حسن غزنوی اور مسعود سعد سلمان اپنے کلام کی جولانیوں سے لاہور کے دربار کو روشن کیے ہوئے تھے اور امیر خسرو نے دہلی کے درباروں کا ذمہ اپنے مستحکم کاندھوں پر لے رکھا تھا۔سماج میں علمی اور ادبی حیثیت فارسی دانی کے معیار سے مقرر کی جانے لگی۔مقامی ہندو، برہمن اور دیگر راجپوت اقوام فارسی سیکھنے میں مشغول نظر آنے لگے۔ہر کوئی فارسی زبان میں اظہار خیال کرتا۔فارسی کو اشرافیہ کی زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

ہندوستان میں عہد غزنی سے سلطنت مملوکیہ، خلجی عہد پھر تغلق خاندان کی حکومت تک دربار کی زبان فارسی تھی۔ یہ حکمران اور امرا ترک نژاد تھے یا افغان نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ان کی مادری زبان ترکی یا پھر پشتو ہوتی لیکن ادبی اور ثقافتی زبان کی حیثیت صرف فارسی کو حاصل تھی۔گو کہ عربی زبان کی علمی اور مذہبی زبان کی حیثیت سے ان جدید مفتوحہ علاقوں پر برتری باقی رہی لیکن ہند آریائی لہجوں پر وہ اپنی گرفت نہ بنا سکی اور اس ہند آریائی لسانی خطے میں مقامی بولیوں پر براہ راست اثر انداز نہ ہوسکی۔

سولہویں صدی عیسوی سے مغلیہ دور کا ثقافتی وتہذیبی اعتبار سے بہت ہی پرشکوہ نقش ابھر کر آتا ہے۔ فارسی ادبیات کا ایک نیا اسلوب سبک ہندی کے نام سے معروف اور مقبول ہوتا ہے۔شعروسخن کی زبردست سرپرستی کی جاتی ہے۔درباری فارسی مفرس عربی الفاظ کے ذخیرہ کے ساتھ اپنے عروج کا کامیاب سفر طے کرتی جارہی تھی اور عوام میں فارسی زبان کے اثرات مرتسم ہوتے جارہے تھے۔برج بھاشا ایک بولی سے ادبی ارتقا کے منازل طے کر رہی تھی۔یہاں تک عہد عالمگیری میں'' ریختہ'' اپنی ایک پشت کو پہنچ چکی تھی۔لیکن محمد شاہ کا زمانہ ہی وہ زمانہ ہے جب اردو اس تشکیلی وتکوینی دور کی تکمیل کر لیتی ہے اور اسے کبھی ریختہ، کبھی دہلوی، ہندوی، یا پھر ہندی یا ہندوستانی کہا جاتا رہا۔فارسی زبان کی آب وتاب کے ساتھ اردو قلعہ شاہی کی شاہی زبان کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

زبان فارسی کے رنگ و روغن میں وہ نیا صوتیاتی نظام بھی شامل تھا جس کی بنا پر کئی نئی اصوات اور صوتیے مفرس عربی یا فارسی الفاظ کے ساتھ ہندوستانی لہجوں میں جگہ پا گئے۔اردو کی تصرفات کی بنا پر اردو میں یہ عربی یا فارسی الفاظ جوں کے توں نہیں بلکہ مقامی لسانی مزاج کے مطابق ڈھالے جانے کے بعد ہی قبولیت کے درجہ کو پہنچے۔ ہند آریائی خانوادہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے فارسی الفاظ کو ہندوی قالب میں ڈھالنے کا عمل بالکل فطری رہا۔وہ عربی الفاظ جو فارسی کے ذریعہ ہم تک پہنچے ان کی قبولیت آسان ہوئی جب کہ عربی کے وہ الفاظ جو راست ہندوستانی لہجوں سے اختلاط کے عمل سے دوچار ہوئے ان کو اردو لہجے میں قبولیت پانا مشکل رہا۔عربی کی طرح ترکی، مغول اور افغانی الفاظ کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ایسا ہے جو فارسی کے راستے اردو میں جگہ پاتا گیا اور اسی زبان کا حصہ بن گیا ہے۔اس طرح اس نئے صوتیاتی نظام کو قلم بند کرنے کے لیے جو رسم الخط اپنایا گیا وہ عربی خط سے ماخوذ فارسی رسم الخط

تھا جس پر مقامی اصوات کے اضافہ کے ساتھ اردو کے لیے ایک مکمل رسم الخط وضع کیا گیا۔جس میں نہ صرف مقامی اصوات، ٹ، ڈ، ڑ کے علاوہ ہا کاری صوتیوں کی ترجمانی کی قابلیت تھی بلکہ فارسی اور عربی الفاظ کی ادائیگی کا پورا ملکہ تھا۔ فارسی رسم الخط ،نستعلیق کو اردو کے لیے مخصوص قرار دیا گیا۔اردو کی تشکیل میں اس کے خط کے سبب بھی ایک کثیر تعداد مفرس عربی اور فارسی الفاظ کی شامل ہوتی گئی ۔ اردو ایک منفرد لسانی خصوصیات کی حامل ہندوستانی زبان کی حیثیت سے ہندوستان کے مشترکہ ثقافتی وتہذیبی ورثہ کی ترجمان تسلیم کی جاتی ہے۔

اس قدیم دور میں فارسی ادب کی روایت مختلف اصناف سخن مثنوی،قصیدہ،ہجو،غزل اور مرثیہ کے ذریعہ اردو زبان میں پیوست ہونے لگی۔ یہ دور فارسی اسلوب وآہنگ کے رواج پانے اور اردو کی ہئیت سازی میں فارسی ہئیت کے انجذاب کا دور تھا۔فارسی ادبی روایات کے زیر اثر فارسی مثنویوں اور قصوں وداستانوں سے ماخوذ مثنویاں نظم کرنے کا رجحان بہت فروغ پا رہا تھا۔ایک جانب قصہ کہانیاں فارسی سے اردو میں ترجمہ ہورہی تھیں تو دوسری جانب اسلوب واظہار کے سانچے،محاورے،روزمرے،خیالات اور اشارات بھی اردو کا جامہ پہن رہے تھے۔اور اس تہذیبی رجحان کے ساتھ معاشرے کا طرز احساس پسند وناپسند کا معیار فنی شعور اور شعر گوئی کے اعتبارات،اردو زبان کے لیے ایک نیا معیار اور ایک نیا رخ متعین کررہی تھیں۔ان نئے معیارات اور جدید اسلوب کے ساتھ، اردو زبان معاشرے میں رفتہ رفتہ فارسی زبان کی جگہ لے رہی تھی۔خیالات اور احساسات کے ادبی اظہار اور شعر گوئی اردو زبان نے فارسی کے سبک ہندی کی روایت کو جاری رکھا۔جس کو ایک جانب سے دکنی دبستان کی طویل مثنویوں مثلاً رسمتی کے خاور نامہ، ملک خوشنود کی جنت سنگھار، نصرتی کی علی نامہ، ابن نشاطی کی پھولبن جیسی معرکتہ الآرا مثنویوں کے فروغ نے تقویت بخشی تو دوسری جانب قصیدہ وغزل گوئی کو محمد قلی،شوق،صنعتی،اور ولی دکنی وغیرہ نے ہندی روایات سے فروغ دیا۔

فارسی کے تمام تر اصناف،علامات،رمزیات،تلمیحات،محاورات،تصورات،تشبیہات اور استعارات، اپنی تہذیبی وتخلیقی روح کے سبب اردو زبان کو ادبی حیثیت سے ایک ستر ہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں دکن سے لے کر دہلی دربار تک، پورا ہندوستان عشق کے نغمہ سرائیوں کی سحر آفرینی سے مسحور نظر آتا ہے۔سینکڑوں شاعروں کی برسوں تک کی گئی ان تھک کاوشیں ان کے خون جگر سے اس ادبی روایت کی آبیاری کرتی رہیں جس کی بدولت اردو زبان وادب کی روایات کو ایسی بہار اور شادابی حاصل ہوئی ہے کہ اردو زبان نے ہر بدلتے دور کے تقاضوں کا سامنا کرنے کا حوصلہ اور ہر قسم کے جدید تصورات ورجحانات کو اپنے دامن میں سمیٹے کا سلیقہ حاصل کرلیا اور آج یہ ایک مشترکہ تہذیبی وثقافتی روایات سے ہم آہنگ روح عصر کی ترجمان زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ سرزمین ہند پر مسلمانوں کی فتوحات سے قبل ایران اور ہندوستان کے قدیم لسانی اور تہذیبی تعلقات کا جائزہ لیجیے۔

2۔ ایرانی تمدن اور اسلامی تہذیب کے مرکز کی حیثیت سے لاہور کس طرح اردو زبان کی تشکیل کے لیے سازگار بنیاد فراہم کرسکا؟ تشریح کیجیے۔

3۔ اردو یا ہندی کے تکوینی دور میں مغل دربار کی سرپرستی کیا اہمیت رکھتی ہے، واضح کیجیے۔

5.9 خلاصہ

ہندعرب تعلقات کی تاریخ بے حد قدیم ہے جو ہزاروں سال پر محیط ہے۔اگر مذہبی روایات کی مانیں تو ان تعلقات کا آغاز روئے زمین پر پہلے انسان کے ظہور سے ہی ہوگیا تھا۔لیکن ہندعرب کے ثابت شدہ تعلقات بھی تاریخ انسانی کی صبح صادق سے ملتے ہیں۔ان تعلقات کے قیام کے پس پشت کئی عوامل کارفرما تھے جن میں سرفہرست ہندوعرب کا جغرافیائی محل وقوع تھا جو انھیں دو پڑوسی ملکوں کی طرح بنا دیتا ہے، کیوں کہ دونوں کے درمیان سمندر کے سوا کوئی شئے نہیں ہے۔اس کے علاوہ عربوں کے سخت جغرافیائی حالات اور ہندوستان کی سرسبزی وشادابی بھی ایک اہم عامل ہے۔ یہ تعلقات قدیم بھی

تھے اور مضبوط بھی تھے، تجارتی بھی تھے اور علمی و ثقافتی بھی تھے۔ دراصل مشرقی تجارت نے بھی ہند و عرب کے تعلقات کو مستحکم بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ عرب ایک بے آب و گیاہ صحرا تھا وہاں رہنے والوں کو اپنی تمام ضرورتوں کے لیے باہری درآمدات پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ عرب اپنی اکثر ضرورت کی چیزیں ہندوستان سے منگایا کرتے تھے۔ تجارت کے علاوہ فکر و عقیدے کی قربت و مشابہت بھی ان دونوں کو ایک دوسرے سے قریب لاتی تھی۔ شرک و بت پرستی دونوں میں مشترک تھے۔ دنیا کے کئی بتکدے بھی دونوں کے نزدیک متبرک تھے۔ ہند عرب کے علمی تعلقات بھی ہر دور میں بے حد مستحکم رہے ہیں۔ قبل اسلام ہندوستان کی دوائیں عرب میں بے حد مقبول تھیں۔ اسلام کی آمد کے بعد بھی ہندوستانی علما و فضلا نے عرب اسلامی تہذیب کی نشو و نما میں اہم کردار ادا کیا۔ عرب ہند تعلقات انسانی ربط و تعلق کی تاریخ کا ایک قابل ذکر باب ہے۔

ہندوستان اور ایران کے باہمی سیاسی، تمدنی، ثقافتی اور لسانی تعلقات کی تاریخ کا آغاز، ازمنہ قدیم میں آریائی قبائل کی مشرق کی جانب نقل مکانی کی تاریخ سے ہی ہوتا ہے۔ آریائی قبائل دو ہزار سال قبل مسیح سے پہلے ہی ایرانی اور پھر ہندوستان کے علاقوں میں موجود تھے۔ اور مآخذ سے پتہ چلتا ہے کہ 1500 قبل مسیح کے بعد یہ آریائی قبائل ہندوستان کی سرزمین میں اپنی آبادیاں قائم کر چکے تھے۔

آریائی تہذیب یا ہند آریائی ثقافت ایران اور ہندوستان کے لیے کئی طرح سے مماثلت اور یکسانیت رکھتی ہے۔ مشترکہ لسانی اساس تمام مشترکہ بنیادوں میں سب سے زیادہ مستحکم تسلیم کی گئی ہے۔

ہند آریائی زبان، آریائی اقوام کی مشترکہ زبان تھی اور اسی بنیاد پر ایرانی اور ہندوی گروہ کی زبانیں ایک ہی مشترکہ اصل کی شاخیں ہیں۔ یہی وہ سبب ہے کہ قدیم پارسی زبان اور قدیم سنسکرت زبان ایک دوسرے سے لسانی اعتبار سے بہت زیادہ مشابہت رکھتی ہیں۔ عہد وسطی میں جب سرزمین ہندوستان میں آریائی لہجے اور اپ بھرنش بولیاں فروغ پا رہی تھیں، اسی عہد میں ایرانی تہذیب کی ترجمان کی حیثیت سے فارسی زبان کا ان کے ساتھ اختلاط ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں ایک نیا مخلوط لہجہ ہندوی یا اردو تشکیل پاتا ہے۔ کثیر تعداد میں مفرس عربی الفاظ اور فارسی کے محاوروں کے ترجموں کی موجودگی اس لہجہ کو انفرادیت بخشتی ہے جو اٹھارہویں صدی عیسوی تک پہنچتے پہنچتے ایک مستقل لہجہ ہی نہیں بلکہ ایک معتبر رسم الخط کی حامل معاصر تہذیبی و ثقافتی اقدار کی نقیب اور روح عصر کی ترجمان ادبی زبان کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔ جس کو ریختہ، ہندوستانی، ہندوی یا پھر اردو کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس تکوینی و تشکیلی مراحل میں مغل سلاطین کی سرپرستی کو بھی دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ بڑی اہمیت حاصل ہے۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں دکن سے لی کر دہلی دربار تک تمام برصغیر میں اردو کی ادبی روایات اور غزل گوئی اور شعر و سخن کا رواج فروغ پاتا رہا اور عوام و خواص کو متاثر کرتا رہا۔

5.10 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

1۔ عرب ہند تعلقات کا تاریخی تسلسل کے ساتھ جائزہ لیجیے۔

2۔ عرب ہند کے تجارتی تعلقات پر ایک مقالہ لکھیے۔

3۔ عرب ہند کے دینی اور علمی روابط کا جائزہ لیجیے۔

4۔ اردو پر فارسی کے لسانی اثرات مرتب ہونے کے اسباب کو بیان کیجیے۔

5۔ اردو ادب میں فارسی روایت کے آغاز پر روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

1۔ عرب اسلامی تہذیب کے نشو ونما میں ہندوستانی علما وفضلا کے کردار پر روشنی ڈالیے۔

2۔ ہندوعرب کے درمیان ہونے والی تجارت کے راستوں پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

3۔ ہندوستان سے عرب برآمد کی جانے والی اشیا اور عرب سے درآمد کی جانے اشیا پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔

4۔ اردو بنیادی طور پر کس لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہے؟

5۔ اردو زبان وادب کے فروغ میں مغل بادشاہ محمد شاہ رنگیلے کی سرپرستی کی اہمیت کو واضح کریں؟

5.11 فرہنگ

الفاظ	معنی
برمائی	زمینی وسمندری
محل وقوع	واقع ہونے کی جگہ
معاصرت	ہم زمانہ ہونا
ہم مشرب	ایک مزاج یا ایک طریقے کا
تدوین	ترتیب، تحقیق
باہم	آپس میں
نژاد	اصل، نسب
نجران	جنوب مغربی سعودی عرب کا ایک شہر، یمن سے متصل، عہد رسالت میں یہاں عیسائیوں کا مرکز تھا۔
عوامل	اسباب
معدنیات	زمین سے برآمد ہونے والی قیمتی اشیا
مظہر	علامت، دلیل
رقمطراز ہیں	لکھتے ہیں
امتیازی	نمایاں، دوسروں سے الگ
استوار کرنا	ہموار کرنا
کتبات	تحریریں
غماز	اشارہ کرنے والا
قدامت	پرانا پن
روابط	تعلقات
تسلسل	پیہم، لگاتار

شناخت	پہچان
تشکیل	تعمیر
مشاہیر	مشہور لوگ
معتزلہ	مسلمانوں کا ایک فرقہ
بے آب و گیاہ	بے پانی و گھاس، چٹیل
درآمدات	باہر سے منگوائی گئی اشیا
نقل مکانی	ہجرت
توسیعی تحریکات	پھیلنے کی کوشش کرنا
ازمنہ	زمانے
کوچ کرنا	روانہ ہونا
گروہ	جماعت
عمرانیات	اقوام کا علم
تمدن	ترقی یافتہ
پارسی	فارسی کی قدیم صورت
اوستائی	کتاب اوستا کی زبان
پارسیک لہجہ، پہلوزبان،	فارسی کی قدیم صورتیں، پہلوانیک لہجہ
تکوین	ارتقائی مرحلہ
کوروش	قدیم ایرانی بادشاہ
ہخامنشی	قدیم ایرانی شاہی خاندان
کیخسر وانوشیروان	قدیم ایرانی بادشاہ
حکیم برزویہ یا بزرجمہر	قدیم ایرانی عالم
زیرنگیں	حکومت کے تحت
درآنا	داخل ہونا
مستعار لینا	اپنا لینا
دخیل الفاظ	داخل ہونے والے الفاظ
اشرافیہ	شرفا کا طبقہ
پرشکوہ	شاندار
مرتسم	نقش کی گئی

مفرس	فارسی سے متاثر
ہا کاری اصوات	کھ گھ بھ پھ جیسی اصوات
سبک ہندی	(فارسی شاعری کا) ہندوستانی اسلوب
اصناف	صنف کی جمع، شاعری کی قسم
روح عصر	اس زمانے کی روح

5.12 سفارش کردہ کتابیں

1۔ عرب و ہند کے تعلقات، سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، 1984ء

2۔ تفسیر وحدیث میں ہندوستان کا تذکرہ، سید علیم اشرف، (اردو ترجمہ شمامۃ العنبر ،غلام علی آزاد بلگرامی)، دارالعلوم جائس، 2003ء

3۔ عرب وہند عہد رسالت میں، قاضی اطہر مبارکپوری، ندوۃ المصنفین ، دہلی

4۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو، ڈاکٹر مسعود حسین خان، آزاد کتاب گھر دہلی، 1954ء

5۔ اردو پر فارسی کے لسانی اثرات، ڈاکٹر عصمت جاوید، پونے، 1987ء

6۔ بزم مملوکیہ، صباح الدین عبدالرحمٰن، اعظم گڑھ

7۔ تاریخ ایران، مقبول بیگ برخشانی، لاہور، 1965ء

8۔ تاریخ ادبیات ایران، ڈاکٹر رضازادہ شفق، ندوۃ المصنفین دہلی، 2005ء، مترجمہ سید مبارز الدین رفعت

اکائی 6 شمالی ہند میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر

اکائی کے اجزا

6.0 مقصد

6.1 تمہید

6.2 سماجی و تہذیبی پس منظر

6.2.1 شمالی ہند میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر

6.2.2 دہلی کا سماجی و تہذیبی منظر نامہ

6.2.3 لکھنؤ کا سماجی و تہذیبی منظر نامہ

6.3 شمالی ہند میں اردو ادب کا پس منظر

6.3.1 دبستانِ دہلی

6.3.2 دبستانِ لکھنؤ

6.4 دہلی و لکھنؤ کی معاشرت کا ایک سرسری جائزہ

6.5 شعر و ادب پر ماحول کے اثرات

6.6 خلاصہ

6.7 نمونۂ امتحانی سوالات

6.8 فرہنگ

6.9 سفارش کردہ کتابیں

6.0 مقصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو شمالی ہند میں اردو ادب کے سماجی اور تہذیبی پس منظر سے واقف کرانا ہے تا کہ آپ اردو ادب کے شمالی ہند میں فروغ، سماجی و تہذیبی پس منظر سے آگاہ ہو سکیں۔ ساتھ ہی اس اکائی کے مطالعے سے آپ اس قابل ہو جائیں کہ اردو ادب کے شمالی ہند میں ہوئے ارتقا اور لسانی

پس منظر سے متعلق پوچھے گئے سوالات کا جواب بھی دے سکیں۔

☆ اردو کے سماجی وتہذیبی پس منظر پر اظہارِ خیال کرسکیں۔

☆ اردو کے فروغ میں خانقاہ وصوفیائے کرام کے کردار کی نشاندہی کرسکیں۔

☆ دہلی اور آس پاس کی سماجی وتہذیبی صورت حال پر اپنی ایک رائے قائم کرسکیں۔

☆ شمالی ہند میں اردو کے آغاز وارتقا کا سماجی وتہذیبی حال بیان کرسکیں۔

6.1 تمہید

شمالی ہند میں اردو کے سماجی وتہذیبی پس منظر کو سمجھنے کے لیے اس کے تاریخی، سماجی، لسانی اور تہذیبی عوامل کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا' جس میں اردو کا ڈول تیار ہوا اور ایک تناور درخت کی شکل میں آج پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ عہد وسطیٰ میں دہلی کی مرکزیت سے بہت سی چیزیں پروان چڑھیں، جس میں اردو بھی ایک ہے۔ اردو ادب کے فروغ میں درباروں، خانقاہوں، بازاروں اور میلوں ٹھیلوں کا بھی اہم کردار ہے۔ عوام الناس اشیا کے لین دین کے لیے بازاروں میں جب یکجا ہوتے تھے تو سامان کے ساتھ زبان کا بھی تبادلہ کیا کرتے تھے۔ مقامی اور خارجی لوگوں کا یہ میل جول ایک زبان کے پیدا ہونے کا سبب بنا اور اس میل جول سے جو زبان تیار ہوئی اس کا سلسلہ ریختہ' اردوئے معلیٰ' شاہجہانی اردو اور ہندوی سے ہوتے ہوئے اردو تک پہنچا جس کا شمار آج دنیا کی بڑی زبانوں میں ہوتا ہے۔ اس اکائی میں انھیں باتوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ عہد وسطیٰ میں دہلی اور لکھنؤ میں اردو ادب کے فروغ کو سمجھا جا سکے۔

6.2 سماجی وتہذیبی پس منظر

سماج ایک ایسے گروہ کو کہتے ہیں جو کسی ایک جغرافیائی حدود میں رہتا، کھیتی کرتا، خوشی، غم اور زندگی کے مختلف مراحل میں ایک جیسے عمل کرتا ہو اور سماج کے ذریعے بنایا گیا قانون ہر کسی پر یکساں لاگو ہوتا ہو۔ ساتھ ہی پورے سماج کا نفع اور نقصان بھی مشترک ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پیدائش سے مرنے تک کی جو رسوم ہیں وہ ایک جیسی ہوں۔ زمانۂ قدیم میں پورے سماج میں ایک ہی جیسی رسمیں ہوا کرتی تھیں مگر آج دولت مند لوگوں نے اپنے لیے ممتاز طرح کی رسوم بنالی ہیں اور متوسط طبقہ وغریبوں کے لیے الگ طرح کی رسمیں برسہابرس سے چلی آرہی ہیں۔ کسی سماج کے زندگی گزارنے کے جو طور طریقے ہوتے ہیں، پیدائش سے وفات تک کی جو رسمیں ہوتی ہیں، ان تمام کے میل جول سے تہذیب بنتی ہے۔ آئندہ چند عناوین کے تحت ہم شمالی ہند بالخصوص دہلی اور لکھنؤ کی سماجی وتہذیبی پس منظر کا مطالعہ کریں گے۔

6.2.1 شمالی ہند میں اردو ادب کا سماجی وتہذیبی پس منظر

اردو ادب کے سماجی وتہذیبی پس منظر کو سمجھنے کے لیے عہد وسطیٰ میں زبانوں کی گروہ بندی کو بھی مدنظر رکھنا ہوگا تاکہ زبانوں کی خصوصیت کو بہتر طریقے سے سمجھا جا سکے۔ جب زبانوں کے نام ان کے علاقوں کے نام سے منسوب کیے گئے تو اردو کا کوئی خاص علاقہ نہیں تھا۔ جیسے کہ مراٹھی، گجراتی، شورسینی (متھرا) اردھ ماگدھی، ماگدھی اور بنگالی، وغیرہ کا تھا۔ انھیں میں شورسینی اپ بھرنش سے کھڑی بولی پروان چڑھی، جس سے دو زبانیں وجود میں آئیں، جن کا نام اردو اور ہندی ہے۔ اردو کا کوئی خاص علاقہ نہیں تھا، اس کے باوجود آج پورے برِصغیر میں اردو رابطے کی زبان ہے۔

عہد وسطیٰ میں دہلی لشکروں کی آماج گاہ تھی، جہاں فوجی مقامی لوگوں سے ضروری اشیا خریدتے تھے۔ بازار میں اسی دوران تاجر اور گاہک کے درمیان سامانوں کے ساتھ ساتھ زبانوں کا بھی تبادلہ ہوا کرتا تھا۔ ان فوجیوں میں باہر سے آئے ہوئے فوجی عرب، ایرانی وافغانی ہوا کرتے تھے، انہیں کے

میل جول سے ایک ملی جلی زبان پروان چڑھی۔

اسی طرح اس عہد میں خانقاہوں ،درگاہوں اور صوفیا کے مساکین عوام الناس کے لیے ایک روحانی سکون کا مرکز تھے، جہاں ہر کوئی بلا تفریق مذہب وملت جایا کرتا تھا۔ان مقامات پر صوفیائے کرام عوام کی زبان میں خطاب کرنے کی کوشش کرتے تھے،جس میں ان کی زبان کے ساتھ ساتھ مقامی زبان کے الفاظ بھی شامل ہوتے تھے۔صوفیا کے یہ دربار عوام کی ایک بڑی آماجگاہ تھے، جہاں مخلوط زبان کو خاطر خواہ پذیرائی اور فروغ ملا۔تاریخی اعتبار سے دہلی کی مرکزیت ہر اعتبار سے اہم تھی ۔بیرونی ممالک سے آنے والے حملہ آور لشکر کے ساتھ جب دہلی کو لوٹنے کی غرض سے آتے تھے تو سبھی واپس نہیں جاتے تھے بلکہ ان میں سے کچھ یہیں سکونت اختیار کر لیتے تھے۔ایسے لوگ بھی ایک نئی زبان یا مخلوط زبان کے استعمال پر مجبور ہوتے تھے۔ان باتوں کے شواہد بابر نامہ،تزک جہانگیری اور دیگر تاریخی کتابوں میں مل جاتے ہیں ۔مغلیہ سلطنت کے کمزور ہونے کے باعث دہلی پر بار بار ہورہے حملوں سے پریشان ہوکر ادبا اور شعرا نزدیکی ریاست اودھ (فیض آباد،لکھنؤ) کا رخ کرنے لگے جو اس وقت ایک خوش حال ریاست ہوا کرتی تھی۔دہلی پر بار بار ہورہے حملوں سے دہلی حکومت کی حیثیت کاغذی رہ گئی تھی ، جب کہ اس کے مقابلے اودھ میں خوش حالی اور ادبا وشعرا کی خاطر خواہ پذیرائی ہورہی تھی۔یہی وجہ تھی کہ دہلی سے کئی ایک شعرا لکھنؤ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔دہلی کے بار بار لٹنے اور ویران ہونے کے سبب دہلی میں ہونے والی شاعری پر اس کا گہرا اثر دیکھنے کو ملتا ہے جب کہ اس کے برعکس لکھنؤ کی شاعری میں رومان پروری نظر آتی ہے۔

6.2.2 دہلی کا سماجی وتہذیبی منظر نامہ

دہلی کے سماجی منظر نامے پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو مغل دربار،صوفیا کے مساکین، جمنا کے گھاٹ،اردو بازار وغیرہ کے عوامل پر غور کرنا ہوگا۔اسی کے ساتھ ساتھ دلی کی تہذیبی زندگی کو سمجھنے کے لیے دہلی کی سیاسی زندگی لوٹ مار قتل و غارت اور یلغار کو بھی سمجھنا ہوگا، کیوں کہ سیاسی عدم استحکام سماج کی امیدوں کو معدوم کر دیتا ہے ۔ایسے حالات میں عوام مذہبی اور روحانی سکون کی طرف مائل ہوجاتے ہیں ۔ایسے وقت میں جو ادب تخلیق ہوتا ہے اس میں زیادہ تر رنج والم، افسردگی، زمانے کی ناہمواری اور تصوف کو مرکزیت حاصل ہوجاتی ہے ۔ایسا ہی کچھ دہلی میں تخلیق ہونے والے ادب کا بھی ہوا۔چوں کہ مغلیہ سلطنت اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد بے حد کمزور ہوگئی تھی لہٰذا دہلی کی حکومت آس پاس کی حکومتوں کی طرف سے ہونے والے حملوں کا مقابلہ بھی کرنے سے قاصر تھی۔ایسی حالت میں شعرا رومان پرور خیالات ،امید افزا تصورات کو قلم بند کرنے سے گریز کرنے لگے۔اسی لیے دبستان دہلی کی شاعری میں غم ،حرماں نصیبی،تڑپ اور کسک کے ساتھ ساتھ تصوف نے اہمیت حاصل کر لی ۔یہی وجہ ہے کہ دبستان دہلی کی شاعری کو آہ کی شاعری کا دبستان کہا گیا۔ایسا صرف دبستان لکھنؤ کی شاعری کو دیکھ کر اور ددونوں دبستانوں کی انفرادیت کو قائم کرنے کے لیے کہا گیا۔

دہلی کی سماجی زندگی میں ہندو مسلمان مذہب ومسلک کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔دربار سے لے کر صوفیا کے مساکن اور میلوں ٹھیلوں میں سبھی بلا لحاظ مذہب وملت شریک ہوتے تھے ۔اسی لیے اردو ادب کے سرمائے پر مشترکہ تہذیب کے گہرے اثرات مرتب ہوئے جسے عرف عام میں آج کل گنگا جمنی تہذیب کہتے ہیں ۔چوں کہ اردو کا پورا خمیر شروع سے اسی نظریے کا حامی رہا یعنی ملی جلی تہذیب کو بہتر طریقے سے پیش کیا گیا اور مذہبی دکھاوے کو ہمیشہ طنز کا نشانہ بنایا گیا۔خانقاہوں کے دروازے عوام الناس کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے اور ہر کسی کے ساتھ ایک جیسا ہی سلوک، رہنمائی اور روحانی تربیت کو اہمیت دی جاتی تھی۔اسی لیے ابتدائی اردو ادب کے فروغ میں صوفیا کے ملفوظات کا اہم کردار ہے ۔حالاں کہ بنیادی اعتبار سے ان کے ملفوظات مذہبی تبلیغ کے لیے ہوتے تھے لیکن اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی تھی جو کسی کو ناگوار محسوس ہو۔یہیں سے اردو کے کردار میں مشترکہ تہذیب شامل ہوئی اور رفتہ رفتہ مزید قوی ہوتی چلی گئی۔اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام خاصی اہمیت کا حامل ہے ۔ہر چند کہ ان کا مقصد اپنے خیالات اور تصورات کا پھیلاؤ تھا لیکن مقامی زبان کے استعمال نے اردو کے فروغ کی راہیں ہموار کیں۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ دہلی میں اردو کے سماجی وتہذیبی منظرنامے پر ایک اجمالی مضمون قلم بند کیجیے۔

6.2.3 لکھنؤ کا سماجی وتہذیبی منظرنامہ

دہلی کے مقابلے لکھنؤ کی آب و ہوا پرسکون تھی اور سیاسی طور سے بھی یہ ایک مستحکم وخوش حال ریاست تھی۔ دہلی پر بار بار ہورہے حملوں سے پریشان ہوکر شعرا وادبا لکھنو کا رخ کررہے تھے۔ اودھ کے نوابین نہ صرف یہ کہ ادب پرور تھے بلکہ ان کے یہاں سیاسی استحکام کی وجہ سے کچھ خاص چیزیں فروغ پارہی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ میرؔ جیسا بڑا شاعر، جس نے اپنی زندگی کے بیشتر ایام دہلی میں گزارے، وہ بھی لکھنؤ کا رخ کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اس وقت ریاست اودھ کی حیثیت پورے ہندوستان میں دوطرح سے اہم تھی۔ اول خوش حالی اور دوم ادب پروری۔ اسی کے ساتھ ساتھ امن کا ہونا بھی ایک اہم خوبی تھی۔ دہلی پر بار بار ہورہے حملوں سے دہلی کی بساط اجڑ چکی تھی مگر دہلی کے مقابلے لکھنؤ پرامن تھا۔ دہلی کے عدم استحکام کے مقابلے لکھنؤ کے سیاسی استحکام نے وہاں کی فضا میں مستقبل کے خواب پرو دیے تھے، جس کے سبب لکھنؤ کی زندگی امید افزا، پرسکون اور رومان پروری سے مزین تھی۔ اسی خوش حالی، امید افزا ماحول اور فارغ البالی نے لکھنؤ کے ادبی ماحول میں رومان پروری، مستی اور عیش کوشی جیسے موضوعات کو ادب میں جگہ دی۔ اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ لکھنؤ دہلی کی ماتحتی سے الگ ہوا تھا، اس لیے ممکن ہے کہ دہلی سے اپنی انفرادیت قائم کرنے کے لیے اہلِ لکھنؤ نے کچھ الگ چیزوں کو پروان چڑھانے کی کوشش کی ہوتا کہ اس کی انفرادیت دہلی سے جداگانہ قائم ہو سکے۔ یہی وجوہ رہیں جس کے سبب علی جواد زیدی نے اپنی کتاب دو ادبی اسکول میں دہلی کو ''آہ'' اور لکھنؤ کو ''واہ'' کا دبستان کہا۔

ہر ادب اپنے عہد کا عکاس اور ترجمان ہوتا ہے۔ اس نظریے سے دکنی، دہلوی اور لکھنؤ کے سماجی وتہذیبی پس منظر کو اگر دیکھا جائے تو ان دبستانوں نے اس نظریے کو سچ ثابت کیا ہے۔ دکنی اردو کے سماجی پس منظر نے اسے وہ کیفیات عطا کیں جو اس کے تمدن میں شامل تھیں۔ اسی طرح دہلی کی تہذیبی فضا نے بھی اسے ایک خاص رنگ عطا کیا، جس میں تصوف، دلی واردات، کیفیات اور حرماں نصیبی کا ایک خاص رنگ شامل ہے لیکن لکھنؤ کی فضا دہلی سے مختلف تھی لہٰذا اس کی شاعری کا رنگ دکن اور دہلی دونوں سے الگ قائم ہوا۔ دبستان لکھنؤ سے مراد شعر وادب کا وہ ایک خاص رنگ ہے جو لکھنؤ کے ابتدائی دور کے شعرا نے اختیار کیا اور اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر وہ رنگ، دکنی اردو اور دہلوی شاعری کے رنگ وآہنگ سے جدا اپنی ایک شناخت رکھتا ہے یعنی دہلی کی داخلیت کے برعکس لکھنؤ نے خارجیت اختیار کی۔ یہ رنگ وآہنگ لکھنؤ کو اس کی تہذیبی فضا نے عطا کیے، جس سے اس کی ایک خاص حیثیت اردو ادب میں قائم ہوئی۔ جب دہلی تباہ و برباد ہوئی اور لکھنؤ اہل دانش وحکمت کا مرکز ومحور بنا تو اس سے قبل علم وادب کے دو بڑے مراکز یعنی دکن اور دہلی کی حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال اور آئے دن کے حملوں سے جب دہلی میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا تو دہلی کے شعرا، حکما اور ارباب علم و دانش نے دہلی کو خیرآباد کرکے لکھنؤ کا رخ کیا، جس کے باعث فیض آباد اور لکھنؤ میں ادب کی محفلوں کو کافی فروغ ملا۔ اورنگ زیب کے جانشین تخت کے لیے آپس میں لڑنے مرنے لگے جس کے سبب دہلی کی مرکزی سلطنت کمزور سے کمزور تر ہوتی گئی۔ اس کے بعد رہی سہی کسر مرہٹوں، جاٹوں، نادرشاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے پوری کر دی۔ 1722ء میں دہلی نے سعادت علی خان کو اودھ کا صوبیدار مقرر کیا۔ دہلی کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سعادت علی خان نے بہت جلد اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ صفدر جنگ اور شجاع الدولہ نے اودھ کی حکومت کو مستحکم کرنے کی بے مثال کوششیں کیں۔ حکومت کی خوش حالی، امن وامان اور سلطنت کے استحکام کے باعث اودھ کے حکمران عیش ونشاط کے دلدادہ ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طوائفیں ہر گلی کوچے میں نظر آنے لگیں۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ طوائفوں کے کوٹھے اعلیٰ تہذیب کے مراکز قرار دیے گئے جہاں بچوں کو آدابِ محفل سکھانے کے

لیے بھیجا جانے لگا۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ لکھنؤ کے سیاسی استحکام نے کس طرح ادب کی راہیں ہموار کیں؟

6.3 شمالی ہند میں اردو ادب کا پس منظر

شمالی ہند میں اردو کا سماجی تانا بانا 2000 ق م سے آریوں کی آمد سے بننا شروع ہوتا ہے۔ آمد کا یہ سلسلہ متواتر سینکڑوں سال تک قائم رہتا ہے۔ شمالی ہند میں باہر سے آنے والوں اور مقامی حضرات کے میل جول سے ایک ایسے سماج کی بنیاد پڑی جس میں ہر طرح کے لوگوں کی یکساں اہمیت تھی۔ اسی کو دیکھتے ہوئے فراقؔ گورکھپوری نے کہا ہے:

سرزمین ہند پر اقوام عالم کے فراقؔ
قافلے بستے گئے ہندوستاں بنتا گیا

اسی ملی جلی تہذیب نے ایک ایسی زبان کے لیے راہیں ہموار کیں، جس میں کسی مذہب کی کوئی خاص گنجائش نہیں تھی۔ اس زبان کا مزاج سماجی دکھاوا، ریاکاری اور مذہب کی جکڑ بندیوں کے خلاف اور رندی و سرمستی کی حمایت میں رہا۔ دہلی کو صدیوں سے مرکزیت حاصل ہے، اسی وجہ سے یہ بار بار اجڑتی اور بستی رہی لیکن اس کی مرکزیت کبھی ختم نہیں ہوئی۔ ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب دہلی تمام عالم کے لیے باعث رشک ہوگئی تھی۔ اسی کو دیکھتے ہوئے میرؔ نے کہا تھا:

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

شمالی ہند میں اردو کے پس منظر پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو ہمیں امیر خسرو (متوفی 1325) کے علاوہ اور کوئی ادیب نظر نہیں آتا۔ ساتھ ہی ایسا ممکن بھی نہیں لگتا کہ چودھویں، پندرھویں اور سولھویں صدی میں کوئی تخلیق کار شمالی ہند میں پیدا ہی نہ ہوا ہو۔ انہیں صدیوں کے اوقات کے درمیان محمد بن تغلق اور مغلیہ افواج کے ساتھ اردو دکن پہنچتی ہے اور ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے قابل قدر تصانیف منظر عام پر پیش کرتی ہے۔ اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں۔ اول یہ کہ شمالی ہند میں دربار کی زبان فارسی تھی لیکن بول چال یعنی رابطے کی زبان کی حیثیت سے اردو کا استعمال عوام الناس میں ہو رہا تھا۔ درباری زبان چوں کہ فارسی تھی اس لیے اردو میں تصنیف و تالیف کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا رہی تھی۔ جب کہ اسی دوران دکن میں اچھا خاصا ذخیرہ تیار ہو گیا۔ اس کی ایک خاص وجہ تو یہ ہے کہ دکن میں بہمنی سلطنت اور بعد میں بہمنی سلطنت کے ٹوٹنے پر پانچ آزاد ریاستوں کا بننا کافی اہمیت رکھتا ہے۔ انہیں پانچ ریاستوں میں دو نے یعنی گولکنڈہ اور بیجاپور نے اردو کو خاص طور سے فروغ دیا۔ چوں کہ یہ ریاستیں شمالی ہند سے دشمنی کے سبب قائم ہوئی تھیں، اسی لیے انہوں نے فارسی کے بجائے مقامی زبان اور مقامی تہذیب کو فروغ دیا جو آگے چل کر اردو کے لیے بے حد اہم ثابت ہوا۔ زیر بحث تقریباً چار صدیوں کے دوران شمالی ہند میں جو بھی ادبی و لسانی سرمایہ ابھی تک دستیاب ہوا ہے، ان میں صوفیائے کرام کے ملفوظات خاصی اہمیت کے حامل ہیں جو مختلف تذکروں میں بکھرے پڑے ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب ''اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام'' میں ان تمام ملفوظات کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ مغلیہ دربار کی زبان فارسی ہونے کے باعث ادبا و شعرا فارسی ہی میں اپنی تخلیقات کو پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے تاکہ ان کی رسائی دربار تک ہو سکے اور کچھ مراعات حاصل ہوسکیں۔ ولیؔ دکنی اسی دوران جب دہلی تشریف لاتے ہیں اور اپنی مقامی زبان میں شعر سناتے ہیں تو دہلی والوں پر اس کا خاص اثر ہوتا ہے۔ یہیں سے دہلی میں بھی اردو کی نشو ونما کی راہیں ہموار ہونے لگتی ہیں اور دہلوی شعرا بھی اس زبان میں طبع آزمائی کرنے

لگتے ہیں۔

دہلی اور لکھنؤ کا امتیاز دراصل دو حکومتوں اور اجڑتی اور آباد ہوتی ریاستوں کی کہانی بھی ہے۔ ان باتوں کا بھی ایک قاری کی حیثیت سے ہمیں خیال رکھنا چاہیے۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے اپنی کتاب دلّی کا دبستانِ شاعری میں دہلویت اور لکھنویت کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''دہلویت نام ہے ایک نقطۂ نظر، ایک افتادِ ذہنی، ایک مزاج شعری کا، جسے سمجھنے کے لیے لکھنویت سے قدم قدم پر مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ اختلاف دراصل آصف الدولہ کے زمانے سے شروع ہوتا ہے جب کہ دہلی بگڑ چکی تھی اور دیگر فن کاروں کی طرح شعرا بھی اپنا ملجا و ماوا دوسرے مقامات میں تلاش کر رہے تھے۔ ان دوسرے مقامات میں سب سے زیادہ پُر امن اور مستحکم مقام اودھ تھا اس لیے دہلی سے جو اٹھا وہ اودھ آیا۔ آرزوؔ، فغاںؔ، سوداؔ، میر حسنؔ، حسرتؔ، مصحفیؔ کے علاوہ دیگر اوسط درجے کے شاعر، ادیب اور فن کار شجاع الدّولہ کے عہد میں فیض آباد اور آصف الدّولہ کے زمانے میں لکھنؤ آتے رہے اور آخر یہیں پیوند زمین ہو گئے۔'' (دلّی کا دبستانِ شاعری، ص 68۔367)

چند لوگوں کے ایک جگہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر یہاں دلی کے نامور شعرا کے ساتھ ساتھ نورالحسن ہاشمی نے مصحفیؔ کے تذکرہ کے حوالے سے 42 شعرا کے نام درج کیے ہیں (جنہیں انہوں نے اوسط درجے کا شاعر کہا ہے) جو دہلی سے صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے تھے۔ ان میں بہت سے ایسے ہیں جن کا مزاج دہلی میں پختہ ہو چکا تھا لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن کی شاعری لکھنؤ میں پروان چڑھی۔ ایسے شعرا نے جب خوش حالی، فارغ البالی اور رومان پروری دیکھی تو انہوں نے لکھنؤ کا وہی رنگ اختیار کر لیا جس میں مضمون کے بجائے ظاہری چیزوں کو اہمیت حاصل تھی۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ اردو کے پس منظر کے بارے میں اپنی معلومات سے واقف کروایئے۔

6.3.1 دبستانِ دہلی

ہندستان ایک ایسا ملک ہے، جہاں زمانۂ قدیم ہی سے اقوام عالم کے آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے یہاں ایک مخلوط تہذیب پروان چڑھی۔ باہر سے دہلی وارد ہونے والی مختلف اقوام کے میل جول سے یہاں ایک ہمہ رنگ تہذیب پیدا ہوتی ہے۔ حقیقت میں دہلی قدیم جنگی استراتجی (strategy) کے اعتبار سے بہت اہم مقام پر قائم ہے، اسی لیے اسے اس زمانے میں اہمیت دی گئی تھی۔ دہلی میں حکومت ہونے کے باعث اس کو ہندستان کا دل کہا جاتا رہا ہے، اسی سبب سے اس کی مرکزی اہمیت سے آج بھی انکار ممکن نہیں ہے۔ سکندر لودھی نے سلطنت کو آگرہ منتقل کیا اور مغل حکمرانوں میں بابر، ہمایوں اور اکبر نے آگرہ ہی سے ہندوستان پر اپنی حکمرانی بنائے رکھی۔ شاہ جہاں نے حکومت کو آگرہ سے دہلی منتقل کیا اور شاہ جہان آباد کو دارالسلطنت بنایا اور اس طرح آباد کیا کہ آج بھی دہلی کو ہندوستان کا دل ہونے کا افتخار حاصل ہے۔

دہلی میں مغلیہ حکومت کے قیام نے اردو کی راہ ہموار کر دی۔ کیوں کہ فارسی سے اردو نے بہت کچھ حاصل کیا ہے، جن میں فارسی کی چار مخصوص آوازیں یعنی ''پ، چ، ژ اور گ''۔ زبان کے سماجی و تہذیبی ڈھانچے اور ارتقا سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح اردو نے دربار میں رسائی حاصل کی اور حاکم و محکوم کی زبان ایک ہو گئی۔ شاہی لشکر میں ہر علاقے اور ہر طبقے کے لوگ ہوا کرتے تھے، انہیں ایک ایسی زبان کی ضرورت تھی جو سب کی سمجھ میں آتی ہو، یہیں سے اردو کا کینوس تیار ہوا اور رفتہ رفتہ وقت کے ساتھ ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے آج یہ ایک بڑی عالمی زبان کے طور پر ہمارے سامنے ہے۔

مغلیہ حکمراں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت اور فارسی کا زوال اور اردو کی ارتقا و عروج کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اس عہد میں مغلیہ

حکومت کا یہ حال ہو گیا تھا کہ

سلطنتِ شاہ عالم از دلی تا پالم

یعنی وہ حکومت جس کی سرحدیں افغانستان سے برما تک تھیں، اس کا یہ حال ہو گیا تھا کہ صرف دہلی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ دربار کی ویرانی کے ساتھ ہی فارسی کی بساط الٹ جاتی ہے اور اردو اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ اب مشاعروں میں اردو کا شاعر اپنے کلام کو پیش کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں سوچتا کہ وہ فارسی نہیں بلکہ اردو میں شعر کہہ رہا ہے۔ اس طرح اردو زبان نے فارسی کا مقام حاصل کر لیا اور دھیرے دھیرے اس میں باقاعدہ ادب بھی تخلیق ہونے لگا۔ ابھی یہ صورتِ حال چل ہی رہی تھی کہ ولی دکنی کا دلی (1700ء) میں ورود ہوتا ہے۔ ولی کے کلام کو سن کر دہلی کے شعرا کو حوصلہ ملتا ہے کہ وہ بھی اس زبان میں شاعری کریں۔ ولی کے کلام کی دہلی میں بڑی ستائش ہوئی۔ اس سے دہلی کے شعرا کو کافی تقویت ملی اور یہیں سے اردو ادب کے ایک باب کا آغاز ہوتا ہے۔ سب سے پہلے شاعر غالباً جعفر زٹل زٹلی کو مانا جاتا ہے، جنہیں ان کے ایک سکۂ شعر پر تہِ تیغ کیا جاتا ہے۔

سکّہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر

بادشاہ دانہ کش فرخ سیر

چوں کہ اس میں بادشاہِ وقت کو نشانہ بنایا گیا تھا، اس لیے ان کو اس کی سزا دی گئی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ شاعر نے دہلی کی بدحالی بیان کی تھی۔

مغلیہ حکمران مسلم ضرور تھے لیکن وہ ہندستانی معاشرے میں اس طرح گھل مل گئے تھے کہ سب کے لیے انصاف اور برابری کو قائم رکھنا ان کے لیے اولین فریضہ تھا۔ وہ یہاں کے سماج میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ انہوں نے راجپوتوں سے رشتے قائم کیے اور جمہوری قدروں کو پروان چڑھایا۔ اکبر نے دینِ الٰہی نام سے ایک مذہب چلایا، جس میں سبھی مذاہب کے لوگ شامل تھے۔ آگے چل کر مغلیہ حکمرانوں کے دربار تک اردو کی رسائی ہوئی۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر خود ایک بہترین شاعر تھے۔ یہ وہ سماجی و تہذیبی پس منظر ہے جس میں اردو کی داغ بیل پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کا خمیر ابتدا ہی سے غیر مسلکی، غیر مذہبی، رواداری، اخوت کو فروغ اور مذہبی ریاکاری پر طنز کے تیر چلانا اس کے مزاج میں آیا۔

اٹھارہویں صدی کی ابتدا سے اردو ادب میں ایک نئے دور کی شروعات ہوتی ہے کیوں کہ اس وقت تک ولی کی دہلی آمد ہو چکی تھی اور دہلی کے بہت سے شعرا اردو میں تخلیق کا کام کرنے لگے تھے۔ اِدھر دہلی میں یہ صورتِ حال تھی، اُدھر کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں اردو کے ایک نئے باب کا آغاز ہو رہا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ زبان کو سنوارنے کا کام بھی دہلی اور لکھنؤ کے اہلِ قلم نے کیا، جس سے اردو نکھر گئی اور لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرنے لگی۔ اردو کی ایک شعری صنف غزل ہے جس کا تمام شعری اصناف پر غلبہ ہے اور اس نے پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان حکمرانوں نے اس طرح کی سماجی و تہذیبی فضا قائم کی کہ عید اور تعزیہ داری میں ہندو شامل ہونے لگے اور ہولی و دیوالی میں مسلمان شریک ہو کر انہیں مبارکباد دینے لگے۔ اس ماحول نے دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کیا اور ایک نئی تہذیب وجود میں آئی جسے گنگا جمنی تہذیب کہتے ہیں۔

6.3.2 دبستانِ لکھنؤ

ہندستانی تہذیب کی اپنی کچھ خاص خوبیاں ہیں، جس میں برسہابرس سے چلی آ رہی ہماری کہانیاں، داستانیں اور روایتیں موجود ہیں۔ لکھنؤ کی داغ بیل نواب آصف الدولہ نے ڈالی تھی۔ ان کا ارادہ شاہ جہان آباد سے بہتر شہر آباد کرنے اور بہتر ریاست قائم کرنے کا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس ریاست میں الگ الگ خطوں سے لوگ آ کر آباد ہو رہے تھے، جن میں خاص طور سے دہلی کے لوگ تھے۔ لکھنؤ واقعتاً کثیر الجہت ترقی کی راہوں پر آگے بڑھا اور ایک ایسی سماجی فضا تیار کی کہ جس کی مثال دنیا کے کسی ملک میں نہیں پائی جاتی۔ مسلمان ہونے کے باوجود اودھ کے حکمرانوں نے السلام علیکم کی جگہ آداب، تسلیم، کورنش اور مجرا عرض ہے جیسے نئے آداب و اطوار وضع کیے۔ لکھنوی تہذیب ہر چند کہ مٹ چکی ہے پھر بھی

ابھی اس کی بو باس کہیں نہ کہیں نظر آجاتی ہے۔لکھنؤ والوں نے جس تہذیب کو گلے لگایا اور پروان چڑھایا اسے آج لکھنوی تہذیب کہتے ہیں۔اس تہذیب میں مذہبی رواداری، ہمدردی، ایمانداری، قوت برداشت، خود داری، نفاست، خوش طبعی، شریف النفسی، وضع قطع، لباس غرض زندگی کے ہر شعبے میں اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی جس کا ہر کوئی گرویدہ ہوگیا۔۱۸۵۶ء یعنی واجد علی شاہ کی گرفتاری تک لکھنؤ کی تہذیب، اس کے گلی کوچے، اس کی محفلیں، آرائش و زیبائش کا کوئی جواب نہیں تھا۔اسی دور میں اردو ادب بھی خوب پھولا پھلا۔اردو زبان کی اس ریاست میں وہ ترقی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔مثنوی میں سحرالبیان، گلزارِنسیم اور زہرِ عشق جیسی بے نظیر تخلیقات سامنے آئیں تو مرثیے میں میر انیس اور مرزا دبیر جیسے بہترین مرثیہ گو بھی لکھنؤ ہی میں پیدا ہوئے، جن کا اردو ادب میں کوئی بدل نہیں۔انہیں اساتذہ کے ساتھ ان کے شاگرد چلا کرتے تھے۔مشاعرے میں انیسیے اور دبیریے ایک دوسرے کی گرفت کیا کرتے تھے جس سے زبان صاف وشستہ ہوتی چلی گئی۔اسی خوش حالی اور رومان پرور فضا میں اردو بھی خوب سے خوب تر ہوتی چلی گئی۔ریاست میں ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں تھیں لیکن حکمرانوں کی کاوشوں سے وہ اس طرح شیر وشکر ہوگئیں کہ دونوں نے ایک دوسرے کے کلچر کو اپنانے سے گریز نہیں کیا۔اس سے ایک نئے معاشرے کی داغ بیل پڑی، جسے مشترکہ کلچر کہنے لگے یعنی ہندو تعزیہ داری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے تو مسلمان ہولی اور دیوالی جیسے تہواروں میں شریک ہونے لگے۔ہر طرف خوشحالی کے شادیانے بجتے تھے، راگ و رنگ کی محفلیں سجتی تھیں، مشاعروں کا بڑے پیمانے پر انعقاد ہوتا تھا۔شعرا کو انعام واکرام سے نوازا جاتا تھا۔اس بخشش کے لیے رعایا کی کوئی تخصیص نہیں کی جاتی تھی۔دہلی کی حیثیت شعر وادب میں مسلم ہو چکی تھی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ لکھنؤ میں بھی وہ باکمال پیدا ہوئے کہ اس کی اپنی ایک ممتاز ساکھ قائم ہوگئی۔رفتہ رفتہ لکھنؤ کا تخلیقی ادب بھی ایک دبستان کی حیثیت اختیار کر گیا، جس کی تمام عالم میں اپنی ایک منفرد حیثیت قائم ہے۔آج اردو ادب میں دو دبستانوں کا ذکر عموماً ملتا ہے اور وہ ہے دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ۔

اودھ کی ریاست نے تقریباً سوا سو سال میں اردو ادب پر وہ اثرات ثبت کیے کہ یہ ریاست اپنی اعلیٰ تہذیب وثقافت کے لیے پوری دنیا میں مشہور ومقبول ہوگئی۔یہاں کے حاکم ونوابین نے وہ سماجی وتہذیبی روایات قائم کیں کہ وہ اپنے انوکھے پن کی وجہ سے بے حد مشہور ہوئے اور آج تک لوگ اس تہذیب کو پہلے آپ پہلے آپ کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ایک دوسرے کی عزت کرنا، القاب وآداب کا خیال رکھنا، بڑوں اور چھوٹوں سے تخاطب میں امتیاز رکھنا آج بھی ہم اہلِ لکھنؤ سے سیکھ سکتے ہیں۔محفل، مجلس اور طعام وغیرہ کے ایسے اطوار طے کیے کہ آج بھی زمانہ ان کو یاد کرتا ہے۔نواب آصف الدولہ نے عمارتوں میں آصفی امام باڑہ، رومی گیٹ اور باغات کا اس طرح اہتمام کیا کہ لکھنؤ کو باغوں کا شہر کہا جانے لگا۔یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ دہلی اور اودھ کے حکمراں مسلمان تھے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بجا ہے کہ انہوں نے پہلے حکومت کے انتظام وانصرام کو اولیت دی اور تمام باشندگانِ ریاست کو ایک نگاہ سے دیکھا۔سماج میں انصاف قائم کرنے کو اہمیت دی اور اسی کو اپنا نصب العین سمجھا۔انہیں اصولوں کے پیش نظر لکھنؤ آج دنیا میں اپنی منفرد شناخت ومرتبہ کا نمائندہ شہر سمجھا جاتا ہے اور اپنی تہذیبی وراثت کے سبب اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ان چیزوں کے پیچھے اودھ کے نوابوں کا اعلیٰ ظرف اور ان کی دور اندیشی کار فرما ہے، جنہوں نے اسے اپنی محنت ولگن سے سنوارا اور حکمت ودانائی سے اس کی آبیاری کی۔

لکھنؤ کی تہذیب جسے اودھ کے نوابوں نے پروان چڑھایا وہ حقیقت میں ایرانی تہذیب تھی لیکن اس میں انہوں نے مقامی سماج اور شہریوں کو دیکھتے ہوئے ہندو اور مسلم تہذیب کے عناصر کو اس طرح پرویا کہ وہ حسین ترین تہذیب وتمدن کا نمونہ بن گئی۔ہندو مسلم اتحاد کا معاملہ یہ تھا کہ اس کا کوئی توڑ انگریزوں کے پاس بھی نہ تھا۔انگریز جب ہندو مسلم اتحاد سے پریشان ہوگئے تو انہوں نے اس کو توڑنے کے لیے مذہب کا سہارا لیا۔جب دو بڑی قومیں آپس میں اس طرح شیر وشکر ہو جائیں کہ دونوں ایک دوسرے کی شادی بیاہ، خوشی وغم، میلے ٹھیلے اور تیج تہواروں میں شامل ہونے لگیں تو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ایک نئے کلچر کو فروغ ملے۔یہی اسباب تھے، جن کے باعث مشترکہ تہذیب پروان چڑھی اور دنیا کے سامنے ایک نئی تہذیب گنگا جمنی تہذیب کے نام سے متعارف ہوئی۔اسی مشترکہ تہذیب کی بدولت اردو ادب میں یہی گنگا جمنی تہذیب پروان چڑھی، جہاں مذہب کے بجائے رندی وسر

مستی کو زیادہ اہمیت دی گئی۔

دبستان لکھنؤ کے شعرا نے اپنی تمام تر توجہ ظاہری حسن، کشش، جاذبیت اور خوبصورتی پر صرف کی۔ داخلیت، دلی کیفیات، وارداتِ قلبی اور جذبات نگاری پر توجہ دینے کے بجائے تکلف اور تصنع کو لکھنوی تہذیب و معاشرت نے اہمیت دی۔ ناسخ لکھنوی نے اصلاح زبان کی تحریک شروع کی۔ جس کے سبب انہوں نے دیسی اور سنسکرت کے الفاظ کو متروک کر کے فارسی اور عربی کے لفظوں کو جگہ دی۔ دہلی کے شاعروں نے ہندی اور دوسری زبانوں سے بھی فیض حاصل کیا لیکن لکھنوی شعرا نے زبان کی اصلاح کے نام پر عربی اور فارسی کو فوقیت بخشی۔ شعرائے لکھنؤ کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ان لوگوں نے لغت پر زیادہ توجہ دی اور زبان کی ادائیگی کے معاملے میں اس پر زور دیا جب کہ دہلی کے شعرا نے مروجہ زبان کو اہمیت دی۔ دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں میں زبان کے استعمال میں خاص فرق ہے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دبستانِ دہلی کی شاعری داخلی شاعری ہے اور دبستانِ لکھنؤ کی شاعری میں محبوب کا سراپا اور ظاہری شکل و صورت کو مرکزیت کا درجہ حاصل ہے۔ اس بحث کا منجملہ ماحصل یہ ہے کہ دونوں دبستانوں کی اپنی اپنی انفرادیت ہے، جس سے دونوں دبستانوں کا امتیاز قائم ہے۔ اس سلسلے میں ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> ''شاعری اور صنعت گری، جذبات نگاری اور الفاظ کی شعبدہ کاری کو باہم ملا کر لکھنوی شعرا نے ایک نیا رنگ پیدا کر دیا۔ ہر رنگ کی نمایاں خصوصیت صنعت ہی کو ٹھہرایا گیا۔ رعایت لفظی یا ضلع جگت جو اول الذکر کی ایک بدنما شکل تھی اس کے باعث ظہور میں آئی۔ تشبیہ اور استعارے میں سادہ اور نیچرل تشبیہات کے بجائے تشبیہہ درتشبیہہ یا تشبیہوں کے اجزا کی تحلیلی ترکیب پر توجہ کی گئی۔۔۔ دو غزلے سہ غزلے چوغزلے لکھنے کا رواج ہوا۔ خیال آفرینی۔۔۔ یہاں آ کر ایک مستقل خصوصیت بن گئی۔'' (لکھنؤ کا دبستان شاعری، جلد اول، ص 49)

یہ وہ چند باتیں یا خصوصیات ہیں جن کا سماجی و تہذیبی پس منظر کے ضمن میں ذکر کرنا ضروری تھا۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ داخلیت اور خارجیت کی وضاحت کیجیے۔

6.4 دہلی و لکھنؤ کی معاشرت کا ایک سرسری جائزہ

سیاسی استحکام اور انتظامی امور کو اگر مدنظر رکھیں تو دہلی کی حالت، لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت سے ایک حد تک بالکل جداگانہ تھی۔ دلی کی اقتصادی صورتِ حال ابتر ہوتی جا رہی تھی، جب کہ اردو فروغ پا رہی تھی۔ دہلی آئے دن طرح طرح کے حملوں یا سازشوں کا نشانہ بن رہی تھی، جس سے شہری پریشان ہو کر آس پاس کی ریاستوں کا رخ کرنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ ایسے دور میں جب کہ راجا سے پرجا تک سبھی معاشی بدحالی کا شکار ہوں، آئے دن نئے فتنے اٹھ رہے ہوں تو ایسے میں شہریوں میں مایوسی، ناکامی اور مستقبل کی ناامیدی کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اس کے برخلاف لکھنؤ میں آسودگی، خوش حالی اور انتظامی امور مستحکم تھا جس کے سبب وہاں کے لوگوں میں رومان پروری، سرمستی، عیش و عشرت، مرغ بازی اور پتنگ بازی جیسے کھیل کھیلے جا رہے تھے۔ ادھر دہلی کے لوگوں کا حال مایوس کن تھا تو لکھنؤ کے لوگوں کا حال امید افزا۔ اسی سے دونوں دبستانوں کے ادبا کا نظریہ زندگی سے متعلق جدا جدا ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دہلی تباہی کے دہانے پر تھی تو لکھنؤ تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔ اسی ماحول کے سبب دہلی کا دبستان ''آہ'' کا دبستان بنا تو لکھنؤ کا دبستان ''واہ'' کا۔ یعنی دہلی کی شاعری میں داخلی جذبات و کیفیات، افسوس و مایوسی، تصوف اور روحانیت کی ترجمانی کی گئی تو لکھنؤ میں خارجی حسن، واردات اور حرکات و سکنات کی منظر کشی کو ترجیح دی گئی۔ دہلی کی شاعری میں نازک مزاجی، دلگدازی اور حقیقت حال کا ہونا ضروری سمجھا گیا

جب کہ اس کے مقابلے لکھنؤ میں سراپا نگاری، معاملہ بندی وغیرہ کی پیش کش پر سارا زور صرف کیا گیا۔ حقیقت حال یہ ہے کہ لکھنویت اور دہلویت ایک ہی سکے کے دو الگ الگ رخ ہیں۔ دہلوی شاعری اور لکھنوی شاعری کے فرق کی شناخت سب سے پہلے شیخ امام بخش ناسخ نے کی تھی۔ انہوں نے جن خصوصیات کی نشاندہی کی تھی، ان خصوصیات کا خود اپنی شاعری میں لحاظ رکھا۔ شاید اسی سبب سے ناسخ کو دبستان لکھنؤ کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ دہلی اور لکھنؤ کی معاشرت کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیجیے۔

6.5 شعروادب پر ماحول کے اثرات

یہ ایک قاعدۂ کلیہ ہے کہ جس طرح کی سیاست، سماج اور ماحول ہوگا، اسی طرح کا ادب تخلیق ہوگا۔ شاید اسی لیے ساحر لدھیانوی نے کہا ہے

دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

یہی سبب ہے کہ ہر ادب کو اپنے عہد کی عکاسی و ترجمانی کا وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں۔

> شاعری اپنے عہد کے طرز تمدن، طریقۂ تفکر کی آئینہ دار ہوا کرتی ہے۔ دہلی میں جو تمدن عہد مغلیہ میں جاری تھا اور جس کا اثر تھوڑا بہت 1947ء تک باقی رہا۔ اسلام کا وہ تمدن تھا جو اس کے زوال کے زمانے میں پیدا اور تمام ممالک اسلامی کی طرح ہندوستان میں بھی مقامی خصوصیت سے متاثر ہوا اس عہد زوال کے تمدن میں خوبیاں کم تھیں اور برائیاں زیادہ۔ برائیوں میں تصنع رواج پرستی قدامت پرستی، شخصی و دیگر اخلاقی خرابیاں جو غلط تعلیم اور افلاس کے باعث پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً خودغرضی، حرص، جھوٹ، نفاق، حسد وغیرہ وغیرہ عام ہوگئی تھیں۔ طریقۂ فکر اور طرز تمدن کا چولی دامن کا ساتھ ہے ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور نتیجے کو تہذیب کہا جاتا ہے۔ (دلّی کا دبستانِ شاعری، ص 89)

اس نظریے سے جب ہم دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کے تہذیبی و سیاسی حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کے ادب میں اتنا امتیاز کیوں ہے؟ سیاسی عدم استحکام سے سماج مایوسی کا شکار ہوتا ہے، ایسے ماحول میں رومان پرور خیالات کی شاعری شاعر نہیں کر سکتا اور اگر شاعر کر بھی لے تو قاری پڑھنا پسند نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ رومانی خیالات اسی وقت اچھے لگتے ہیں، جب انسان کے پیٹ میں اناج ہو اور وہ آسودہ حال ہو۔ دہلی کا جو ماحول تھا، ویسے ماحول میں جو ادب تخلیق ہوا، اس نے اپنے عہد اور سماج کی بھرپور عکاسی کی اور اسی طرح لکھنؤ کے ادب نے لکھنؤ کے امن و امان، شان و شوکت اور عیش پرستی کی عکاسی کی۔ ایسے پرسکون ماحول میں فنون لطیفہ، رقص و سرور کے ساتھ ساتھ شعروشاعری کو بھی بہت فروغ ملا۔ دہلی کی بدامنی اور انتشار نے اہل علم کو اودھ اور خاص کر لکھنؤ میں اکٹھا ہونے پر مجبور کیا۔ اس طرح ایک ایسا وقت بھی آیا جب شاعری کا مرکز دہلی کے بجائے لکھنؤ میں قائم ہوتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ امرا و رؤسا کی سرپرستی نے شاعری کا ایک ماحول بنایا، جس کے سبب شعروشاعری کا چرچا بہت عام ہوا۔ ابتدا میں شعرائے دہلی کے اثر کی وجہ سے لکھنؤ کی زبان پر ان کا اثر نمایاں رہا لیکن رفتہ رفتہ اس میں کمی آنے لگی۔ میر جب لکھنؤ پہنچے تھے تو انہوں نے اپنا تعارف کچھ اس طرح پیش کیا تھا:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دہلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

یہ وہ شعر ہیں جنہیں میرؔ نے اپنے تعارف کے طور پر لکھنؤ میں پیش کیا تھا۔ میر کی زندگی کے زیادہ تر ایام دہلی میں گزرے لہٰذا ان پر لکھنوی رنگ کا اثر بالکل نہیں ہوا۔ اس کے بعد مصحفیؔ اور انشا تک تو دہلی کی داخلیت اور جذبات نگاری کہیں نہ کہیں برقرار رہی اور اس کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کی خارجیت اور رعایت لفظی بھی کہیں نہ کہیں قائم رہی۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے لکھنؤ کی خاص زبان، تہذیب اور رکھ رکھاؤ نمایاں ہوتا گیا۔ اس طرح اردو ادب میں ایک نئے دبستان کی بنا پڑی، جس نے آگے چل کر اردو ادب میں دبستان لکھنؤ کے نام سے اپنا ایک منفرد مرتبہ حاصل کیا۔ دہلی کے داخلی رنگ کی ایک مثال میرؔ کے کلام سے ملاحظہ ہو۔

ضعف بہت ہے میرؔ تمہیں کچھ، اس کی گلی میں مت جاؤ
صبر کرو کچھ اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو

اس شعر میں خود کلامی کی کیفیت ہے یعنی شاعر کا تخاطب کسی اور سے نہیں بلکہ خود سے ہے۔ اسی طرح کا ایک اور شعر دیکھیں۔

ٹک دیر جو آ جانے میں جاناں نے لگائی
ساون کی جھڑی دیدۂ گریاں نے لگائی

درج بالا دونوں شعروں میں شاعر اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوا نظر آتا ہے، جسے داخلی شاعری کی ایک کیفیت کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس خارجی شاعری کا رنگ بالکل جداگانہ ہوتا ہے۔ مثلاً

کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت
ٹال کر کہنے لگا دن ہے ابھی رات کے وقت

انتہائے لاغری سے جب نہ میں آیا نظر
ہنس کے فرمانے لگے بستر کو جھاڑا چاہیے

یہ ایک معمولی سی مثال داخلی اور خارجی شاعری سے ہم نے پیش کی تاکہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ دونوں دبستانوں میں بنیادی اعتبار سے کیا فرق ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ داخلی اور خارجی شاعری کی مثال کے ساتھ وضاحت کیجیے۔

6.6 خلاصہ

ہندوستان میں باہر سے آنے والوں کی زبان کیا تھی؟ اس پر بہت سی کتابیں دستیاب ہیں لیکن یہاں کے مقامی لوگ اس زمانے میں کون سی زبان آپسی بول چال کے لیے استعمال کرتے تھے، اس پر کوئی کتاب نہیں ملتی۔ اس کے باوجود لسانیاتی نقطۂ نظر سے اتنا تو طے ہے کہ ہندوستان کے مقامی لوگ بھی کوئی نہ کوئی زبان ضرور بولتے رہے ہوں گے۔ ہندوستان آنے والے قافلے ایران اور افغانستان سے ہوتے ہوئے بھارت آئے تھے، اس لیے ان پر ایرانی تہذیب کے گہرے اثرات تھے۔ ہندوستانی کلاسیکی موسیقی میں امیر خسرو نے ترکی اور ایرانی اثرات کو استعمال کر کے نئے تجربے کیے۔ عربی رسمِ خط نسخ کو ترقی دے کر ایرانیوں نے فارسی رسمِ خط نستعلیق ایجاد کیا اور آج یہی رسمِ خط اردو کا سب سے مقبول رسمِ خط بھی ہے۔ ہندوستان کے بیشتر مسلم

حکمرانوں پر ایرانی تہذیب وتمدن کا اتنا گہرا اثر تھا کہ فارسی ہی کو ہمیشہ مہذب ،درباری اور تہذیبی زبان سمجھا گیا۔ بادشاہ اور نوابین جب عام لوگوں سے بات کرتے تو انہیں ہندی یا ہندوی (اردو) کے استعمال پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ باہر سے آنے والے نو وارد بازاروں میں مقامی لوگوں سے ملی جلی زبان میں بات کرتے تھے، جس سے ایک نئی زبان کے بننے کے اسباب پیدا ہوئے۔ اسی میل جول نے ہندوستان میں ایک نئی تہذیب کو پروان چڑھایا، جسے گنگا جمنی یا مشترکہ تہذیب کہتے ہیں۔ ہندوستانی تہذیب میں مغلوں سے پہلے رات کی محفلیں، مجلسیں اور آرائش کا کہیں ذکر نہیں تھا، یہ خالص مغلیہ سلطنت کی دین ہے۔ ہندوستان میں سورج غروب ہونے کے بعد زندگی ختم اور سورج طلوع ہونے سے شروع ہوتی تھی۔ باہر سے آنے والوں میں فوجیں اور لشکر کے علاوہ اللہ کے ایسے نیک بندے بھی شامل ہیں جنہیں اپنے مذہب اور انسانیت کے پیغام سے سروکار تھا۔ یہ اللہ کے نیکوکار بندے جنہیں ہم آج صوفیائے کرام کہتے ہیں، اردو زبان کے فروغ میں ان کا اہم کردار ہے۔ اللہ کے یہ نیک بندے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں دین کی تبلیغ کے لیے پھیل گئے اور اپنے اپنے طور پر اپنے دین کی اشاعت میں لگ گئے۔ حالاں کہ ان کا زبان سے کوئی واسطہ نہیں تھا لیکن انہیں اپنے پیغام عوام الناس تک پہنچانے کے لیے ایک ملی جلی زبان کی ضرورت تھی اور وہ کام یہی ملی جلی نئی زبان جو اس زمانے میں پروان چڑھ رہی تھی، اس نے پورا کیا۔ اس سے اردو زبان کے فروغ میں مدد ملی۔ یہی سبب ہے کہ اردو زبان کے اولین نمونے صوفیائے کرام کے ملفوظات' خالق باری وغیرہ میں سب سے پہلے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اردو نہ صرف عوام کی زبان تھی بلکہ اس کی روز افزوں ترقی کو دیکھتے ہوئے حاکمینِ وقت بھی آہستہ آہستہ اس کی جانب متوجہ ہونے لگے تھے۔ ظہیرالدین محمد بابر کے ترکی دیوان میں اردو کا ایک مصرع ، اکبر اعظم کا ایک اردو دوہا اور ''توزک جہانگیری'' میں تو اردو کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ شاہجہاں کے وقت تک تو شاہ جہانی اردو کا چلن ہو چکا تھا۔ اسی دور کا ایک اردو شاعر پنڈت چندر بھان برہمن (1662ء-1574ء) کے کلام سے اس دور کی اردو کے لسانی ارتقا کی منزل اور ادبی اظہار کا تخمینہ لگایا جا سکتا ہے۔ عوام اور بادشاہ کے درمیان یہی اردو زبان ہی رابطے کا کام کرتی تھی۔ ہندوستانی فوجیں، جن میں تقریباً ہر خطے کے مضبوط قد کاٹھی کے لوگ شامل ہوتے تھے، ان کو بھی آپسی رابطے کے لیے ایسی ہی ایک مخلوط زبان کی ضرورت تھی، جس سے وہ آپس میں تبادلۂ خیال کر سکیں۔ ان کی اس ضرورت کی بھرپائی اسی زبان سے ہوئی، جس کے استعمال پر کوئی پابندی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی اونچا اور کوئی نیچا ہوتا تھا۔ اسی روزمرہ کی ضرورت نے اردو زبان کو فروغ دیا اور سب کا ہم نوا بنایا۔ لفظ 'اردو'، اردو زبان کے لیے بہت بعد میں استعمال کیا گیا۔ اس سے پہلے اس زبان کی شناخت کے لیے ریختہ، ہندی، ہندوی، اردوئے معلیٰ جیسے لفظ استعمال کیے گئے۔ 'اردو' کے لفظی معنیٰ لشکر کے ہیں لیکن اس کا استعمال زبان کے معنوں میں غالباً 1775ء میں سب سے پہلے مصحفی نے کیا تھا، اس کے بعد سے لفظ اردو زبان کے لیے مستعمل ہو گیا۔ یہ ایک عجیب معاملہ ہے کہ ایک طرف مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور دوسری طرف اردو کا عروج ہو رہا تھا۔

دہلی میں ذاتی طور پر ادبا و شعرا دیسی/مقامی زبان کے الفاظ اپنے کلام میں استعمال کرتے تھے لیکن اس کے خاطر خواہ استعمال کی نہ تو ان میں ہمت تھی اور نہ ہی ماحول اس کے لیے سازگار تھا۔ ایسے میں ولی دکنی کی 1700ء کے آس پاس دہلی میں آمد اور ان کے کلام کی سماعت سے ان میں یہ حوصلہ پیدا ہوا کہ وہ اپنی روزمرہ کی زبان میں ادب تخلیق کریں۔ ولی کی آمد سے شمالی ہند کا منظر نامہ بالکل تبدیل ہو گیا۔ وہ زبان جس میں بات چیت تو کی جا سکتی تھی مگر ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا تھا، اب اس میں بھی ادب تخلیق ہونے کے امکانات روشن ہوئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دہلی میں تخلیق کاروں کی ایک پود تیار ہو گئی۔ شمالی ہند میں اگر غور کیا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں صحیح معنوں میں نثری تصانیف کا سلسلہ فضل علی فضلی کی کربل کتھا سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد دوسری نثری تصنیف ہونے کا فخر قصہ مہر افروز ولبر کو حاصل ہے، جسے عیسوی خاں بہادر نے 1732ء اور 1759ء کے درمیان تخلیق کیا۔ دونوں تصانیف کی زبان کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ پہلی کی زبان میں فارسی غالب ہے جب کہ دوسری کی زبان پہلے کے مقابلے سادہ، صاف اور رواں ہے۔ اس کے بعد اردو میں بہت سی کتابیں دوسری زبانوں سے ترجمہ کی گئیں۔ اسی کے ساتھ ہی ساتھ تخلیق بھی کی گئیں مگر ان تخلیقات پر فارسی کا کافی

اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔

شاعری میں نثر کے مقابلے پہلے مقامی زبان کا استعمال ہونے لگا تھا، جس میں اس عہد کی دہلی کے حالات اور ماحول کو پیش کیا گیا ہے۔ جعفر زٹلی، سوداؔ، میرؔ اور دردؔ کی شاعری میں دہلی کے حالات کی عکاسی کی گئی ہے۔ جعفر زٹلی نے سکۂ شعر کہا تو سوداؔ نے شہر آشوب کہے۔ میرؔ نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ دہلی میں گزارا تھا، انہوں نے بھی جا بجا اپنی غزلوں میں دلّی کے حالات کی عکاسی کی ہے:

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ایک طرف تو دہلی کے گلی کوچے اتنے حسین تھے کہ میرؔ نے مذکورہ شعر کہا لیکن اسی کے ساتھ جو کچھ دہلی میں ہو رہا تھا یعنی دہلی کی حالت اتنی خراب ہوگئی تھی کہ یہ سید برادران کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ لوگ جب جس کو چاہتے تخت نشین کرا دیتے اور جب جس کو چاہتے تخت سے اتار دیتے تھے۔ اس ابتری کی کہانی کو بھی انہوں نے اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔ مثلاً:

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انہیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھی
دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تخت و تاج کا

دہلی کے وہ بادشاہ جن کے قدموں کی دھول کبھی لوگ اپنی پیشانی پر ملتے تھے، ان بادشاہوں کی آنکھوں میں جلتی ہوئی سلاخیں ڈال دی گئیں۔ ایسے دور میں دہلی ایک طرح سے بربادی کے دہانے پر تھی تو اودھ ترقی کے نئے ابواب رقم کر رہا تھا۔ اس ابتری کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کے حالات سے تنگ ہو کر شعرا نے پرسکون ریاست اودھ کا رخ کیا۔ لکھنؤ نے اردو ادب کو ایسے ستارے دیے، جس کی اردو ادب کو بہت ضرورت تھی۔ اس سے پہلے دہلی نے غزل اور قصیدے میں خاطر خواہ ادب پیدا کر لیا تھا۔ لکھنؤ کے ادبا نے مرثیے اور مثنوی کو وہ مقام عطا کیا کہ اس سے آگے اس کی پرواز نہ ہو سکی۔ اسی طرح ناول اور ڈرامے میں امراؤ جان ادا اور انارکلی کی بھی حیثیت مسلم ہے۔ اس کے علاوہ زبان میں نفاست، نزاکت، رکھ رکھاؤ، القاب و آداب کے وہ معیار دبستانِ لکھنؤ کے اساتذہ نے طے کیے کہ اردو صرف نکھری ہی نہیں بلکہ سنور بھی گئی۔ دہلی میں مروج زبان کے ساتھ ساتھ مضمون کی پیش کش کو ترجیح دی تو لکھنؤ میں لفظوں کے استعمال کو برتری ملی۔ اس طرح سے داخلیت اور خارجیت کے امتیاز کے ساتھ اردو زبان دونوں طرح کے خیالات و تصورات کو پیش کرنے کی اہل ہوگئی۔ یہی دونوں دبستانوں کے سماجی و سیاسی حالات کے پیش نظر ہوا۔

6.7 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

1۔ شمالی ہند میں اردو ادب کے تہذیبی و سماجی پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

2۔ دہلی کو آہ اور لکھنؤ کو واہ کا دبستان کیوں کہا گیا؟

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

1۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد دہلی کے سیاسی منظر نامے پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

2۔ لکھنؤ میں رومانی شاعری کے فروغ کے اسباب بیان کیجیے۔

6.8 فرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
لسانی	زبان سے متعلق	ڈول	بنیاد قائم کرنا، ڈھانچہ تیار کرنا
ٹھاٹھیں مارنا	(محاورہ) پانی کا اونچی اونچی موجیں مارنا	عہد وسطیٰ	درمیانی عہد
خانقاہ	درویشوں کے رہنے کی جگہ، پیر کا مقبرہ	عناوین	عنوان کی جمع
برصغیر	چھوٹا براعظم، مجازاً بھارت اور پاکستان	آماج گاہ	نشانے کی جگہ
گاہک	خریدار	مخلوط	ملا جلا، گڈمڈ
خاطر خواہ	حسب منشا، خواہش کے مطابق	پذیرائی	قبولیت، منظوری
مساکین	مسکین کی جمع، غریب	یلغار	دشمن کی فوج پر حملہ، دھاوا
تصورات	خیالات	تخصیص	خصوصیت
ملفوظات	ملفوظ کی جمع، منہ سے بولی ہوئی بات	مستحکم	مضبوط
عیش کوش	عیش وعشرت کرنے والا	جانشین	ولی عہد، وارث
داغ بیل	شروع کرنا، کسی کام کی بنیاد رکھنا	مسلک	راستہ، طریقہ
کثیر الجہت	ہمہ جہت	انصرام	انتظام کرنا، بدوبست کرنا
فوقیت	بڑائی، برتری، غلبہ	آسودہ حال	خوش حال ہونا
معاملہ بندی	بیتی ہوئی باتوں کو نظم کرنا	اقتصادی	معاشی
قدامت پرستی	بنیاد پرستی، پرانی باتوں کو پسند کرنے والا	داخلیت	اندرونی کیفیت، دلی کیفیت
خارجیت	ظاہرداری، ظاہر پرستی	مستعمل	عمل میں لایا ہوا، استعمال میں آنا
ابتری	بدحالی، خرابی	عوام الناس	عام لوگ
شہاں	شاہ کا مخفف، بادشاہ، سلطان	کحل	ادھیڑ، درمیانہ سال
ترجیح	برتری، فوقیت	سلائی	سرمہ لگانے کی گول اور پتلی سلاخ

6.9 سفارش کردہ کتابیں

1۔ اردو ادب کی تحریکیں: ابتدا تا 1975ء	ڈاکٹر انور سدید	کتابی دنیا، دہلی، 2004
2۔ اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں ور جحانوں کا حصہ	منظر اعظمی	اتر پردیش اردو اکاڈمی، لکھنؤ، 1996
3 ۔ اردو اور مشترکہ ہندستانی تہذیب	ڈاکٹر کامل قریشی	اردو اکادمی، دہلی، 2014
4 ۔ اودھ میں اردو ادب کا تہذیبی وفکری پس منظر	محمد حسن	اردو اکامی، دہلی، 2003

5۔ بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب: اپنے تہذیبی پس منظر میں	مرزا جعفر حسین	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1978
6۔ تاریخ ادب اردو (اٹھارویں صدی)	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1984
7۔ تاریخ ادب اردو: عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک (جلد اوّل)	سیدہ جعفر	لنگر ہاؤس، حیدرآباد، 2002
8۔ دلّی کا دبستانِ شاعری	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 1996
9۔ دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر (عہدِ میرؔ تک)	پروفیسر محمد حسن	اردو اکادمی، دہلی، 2009
10۔ قدیم لکھنؤ کی آخری بہار	مرزا جعفر حسین	قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، 2011
11۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2008
12۔ لکھنؤ کے ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر	ڈاکٹر سید عبدالباری	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2006

اکائی 7 جنوبی ہند میں اردو ادب کا سماجی اور تہذیبی پس منظر

اکائی کے اجزا

7.0 مقصد

7.1 تمہید

7.2 جنوبی ہند میں اردو زبان کی آمد اور اشاعت

7.3 بہمنی دور میں اردو ادب کا سماجی وتہذیبی پس منظر

7.4 عادل شاہی دور میں اردو ادب کا سماجی وتہذیبی پس منظر

7.5 قطب شاہی دور میں اردو ادب کا سماجی وتہذیبی پس منظر

7.6 خلاصہ

7.7 نمونہ امتحانی سوالات

7.8 فرہنگ

7.9 سفارش کردہ کتابیں

7.0 مقصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو جنوبی ہند میں اردو ادب کے سماجی اور تہذیبی پس منظر سے واقف کروانا ہے۔اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ جنوبی ہند میں اردو زبان کی آمد اور اشاعت کا جائزہ لے سکیں۔

☆ بہمنی دور کے اردو ادب کا سماجی وتہذیبی پس منظر بیان کر سکیں۔

☆ عادل شاہی دور کے اردو ادب کا سماجی وتہذیبی پس منظر بیان کر سکیں۔

☆ قطب شاہی دور کے اردو ادب کا سماجی وتہذیبی پس منظر بیان کر سکیں۔

7.1 تمہید

اس اکائی میں جنوبی ہند میں اردو زبان کی آمد اور اشاعت کا جائزہ لیا جائے گا۔اس کے بعد بہمنی دور، عادل شاہی دور اور قطب شاہی دور کے سماجی

وتہذیبی پس منظر پر علاحدہ علاحدہ روشنی ڈالتے ہوئے بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی عہد کے اردو ادب کے ارتقا کا علاحدہ علاحدہ جائزہ لیا جائے گا۔

7.2 جنوبی ہند میں اردو زبان کی آمد اور اشاعت

جنوبی ہند میں علاء الدین خلجی کے فتوحات سے بہت پہلے ایسے صوفیا اور علما کے نام ملتے ہیں جو جنوبی ہند کے مختلف علاقوں میں اردو زبان کی ترقی و اشاعت میں خاموشی کے ساتھ اپنا کام انجام دے رہے تھے۔ حاجی رومی، شاہ مومن، بابا سید مظہر عالم، شاہ جلال الدین گنج رواں، سید احمد کبیر حیات قلندر، بابا شرف الدین، بابا شہاب الدین وغیرہ وہ حضرات ہیں جو سرزمین جنوبی ہند پر تبلیغی و روحانی کام بھی کر رہے تھے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں علاء الدین خلجی کی فوجیں شمالی ہند سے جنوبی ہند پہنچتی ہیں۔ اس میں فوج کے علاوہ اہل ہنر، تاجر، صوفی اور فقیر بھی شامل ہیں۔ پیر مقصود، پیر جمنا، شاہ منتخب الدین زرزری بخش، پیر میٹھے، خواجہ بندہ نواز کے والد شاہ راجو قتال، شاہ برہان الدین غریب، امیر خسرو کے دوست امیر حسن سنجری شیخ فرید الدین وغیرہ اہل شمال نے جنوبی ہند کے الگ الگ علاقوں میں مقامی زبانوں کے الفاظ کو شمال کی زبان میں ملا کر ایک ایسا ہیولیٰ تیار کیا جس سے زبان کے اظہار کی تمام مشکلیں دور ہو گئیں۔

چودھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں اردو زبان بول چال کی ایک رواں زبان کی حیثیت حاصل کر چکی تھی۔ دکن کے مختلف علاقے جلال الدین خلجی کے عہد حکومت میں، شمالی ہند کی عام استعمال کی بول چال کی اردو سے واقف ہو چکے تھے۔ 1327ء میں دوسرا اہم واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے اردو جنوبی ہند میں بڑے وسیع پیمانے پر پھیلنے لگی۔ سلطان محمد تغلق کا یہ فیصلہ کہ ملک کا پایۂ تخت دہلی کی بجائے دیوگیری (دولت آباد) بنایا جائے، تاریخی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے لیکن زبان کے اعتبار سے بھی اردو کے حق میں یہ فیصلہ بہت ہی سودمند اور کارآمد ثابت ہوا۔ بادشاہ کے حکم پر کئی صوفیا، علما، شعرا، ادیب، سپاہی پیشہ اور دیگر فن کار دیوگیری پہنچے ان میں سے بہت سے یہاں بس گئے۔ ان کی علمی زبان تو فارسی تھی لیکن عام بول چال کی زبان اردو تھی۔ یہ زبان کھڑی بولی پر مبنی تھی اور اس میں فارسی اور عربی کے الفاظ کی آمیزش تھی۔ چودھویں صدی کے ربع دوم میں جب تغلق حکمران دہلی میں زوال پذیر ہو گئے تو جنوبی ہند میں ان کی گرفت کمزور ہو گئی۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ جنوبی ہند میں اردو زبان کی آمد اور اشاعت کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

7.3 بہمنی دور میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر

خاندان تغلق کے زوال کے بعد، ہندوستان کے مختلف علاقے خودمختار ہو گئے چنانچہ 1347ء میں سرزمین دکن پر علاء الدین حسن بہمنی نے اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔ بہمنی خاندان میں کوئی اٹھارہ حکمران ہوئے جنھوں نے کم و بیش دو سو سال تک حکمرانی کی اور جنوبی ہند کو ایک نئے تہذب و تمدن سے آگاہ کیا۔ جس زمانے میں بہمنی سلاطین نے جنوبی ہند میں تہذیب و تمدن کی شمع جلائی یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں کا تمدن دنیا کا اعلیٰ ترین تمدن سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح بہمنی خاندان کی جنوبی ہند حکمرانی سے مراد ایک انتہائی ترقی یافتہ قوم کی حکمرانی تھی جو جنوبی ہندوستان میں قیام پذیر تھی۔

جس خطے پر بہمنی خاندان نے حکومت کی، اس میں تین زبانیں بولنے والے لوگ آباد تھے یعنی یہ علاقہ تلنگانہ، کرناٹک اور مہاراشٹرا کے علاقے پر پھیلا ہوا تھا۔ ان علاقوں پر متعدد چھوٹے چھوٹے راجاؤں کی حکومتیں قائم تھیں، جو آپس میں برسرپیکار رہتی تھیں۔ بہمنی سلاطین نے جنوبی ہند میں بسنے والی ان چھوٹی چھوٹی قوموں کو متحد کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ ان میں قومی اتحاد اور یکجہتی کے تصور کو فروغ دیا اور علوم و فنون کی روشنی پھیلائی۔ اس طرح بہمنی حکومت کا قیام جنوبی ہند کے لیے، ایک نئے شاہی خاندان کی حکومت کا آغاز ہی نہیں تھا بلکہ ایک اعلیٰ تہذیب و تمدن اور اعلیٰ نظریہ حیات کی روشنی سے مستفید ہونے کا ایک عظیم موقع بھی ثابت ہوا۔ بہمنی سلاطین کے زمانے میں جنوبی ہند کا علاقہ نہ صرف ہندوستان بلکہ عراق، ایران، ترکستان اور افغانستان

کے عالموں اور باکمالوں کے لیے باعث کشش بن گیا۔آئے دن دور دراز ملکوں کے شاعر،علما اور فن کار قدر دانی کی توقع میں، جنوبی ہند میں وارد ہوا کرتے تھے۔بہمنی حکمرانوں نے، جن میں اکثر علم وادب اور فنون لطیفہ کے غیر معمولی قدر داں گزرے ہیں، ہر خطے کے شاعروں، عالموں اور ہنرمندوں کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور صحیح معنوں میں، جنوبی ہند میں ایک بین الاقوامی تمدن کی بنیاد ڈالی۔سلاطین دکن نے اپنی حکمرانی کے طویل عہد میں علم کی توسیع اور اس کی اشاعت کی جانب بڑی توجہ کی تھی۔بہمنی حکمرانوں میں محمد شاہ اور فیروز شاہ نے علم کی ترقی وترویج میں جو حصہ لیا وہ تابناک ہے۔یہ دونوں بادشاہ خود صاحب علم اور علم دوست تھے۔

بہمنی خاندان کا آٹھواں حکمران فیروز شاہ بہمنی نہ صرف ایک بے مثال مدبر اور کامیاب بادشاہ تھا بلکہ بے حد ذہین اور دور اندیش بھی تھا۔اس فرماں روا کے دور حکومت میں، جنوبی ہند کا علاقہ اپنے بین الاقوامی تمدن کے لیے غیر معمولی شہرت اختیار کر گیا۔فیروز شاہ بہمنی نے اپنی سلطنت میں بسنے والے تمام طبقات جو مختلف رنگ ونسل سے تعلق رکھتے تھے اور مختلف مذاہب کے ماننے والے تھے، کے مابین یکجہتی اور اتحاد پیدا کرنے کی تحریک چلائی۔اسی تحریک کے زیر اثر بعد کے زمانے میں اکبر اعظم نے دہلی میں، محمد قلی قطب شاہ نے گولکنڈہ میں اور ابراہیم عادل شاہ ثانی نے بیجاپور میں اسی بین الاقوامی تمدن کو رائج کرنے میں کامیابی حاصل کی۔بہمنی دور کی اس عظیم الشان یونیورسٹی کے کھنڈر آج بھی آثار قدیمہ کی حیثیت سے باقی ہیں اور دیکھنے والوں کے لیے اپنی عظمت اور شان وشوکت کا مرثیہ سناتے ہیں جسے مدرسہ محمود گاواں کہا جاتا ہے بیدر کا مدرسہ محمود گاواں کئی سو سال تک تشنگان علم کا مرکز رہا۔

بہمنی دور اردو ادب کا قدیم ترین عہد ہے۔اس عہد کے اہم ادیبوں اور شاعروں میں خواجہ بندہ نواز، فخر دین نظامی، مشتاق، میراں جی شمس العشاق، اشرف بیابانی، محمود اور فیروز بیدری کے نام قابل ذکر ہیں۔دکنی کے سب سے پہلے شاعر اور نثر نگار خواجہ بندہ نواز فیرز شاہ بہمنی کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔وہ اسی (80) سال کی عمر میں دہلی سے گلبرگہ تشریف لائے تھے۔خواجہ بندہ نواز دہلی کے مشہور صوفی حضرت نظام الدین اولیا کے خلیفہ اور خواجہ نصیرالدین چراغ دہلی کے سب سے اہم شاگرد اور خلیفہ تھے۔ان سے ایک تصنیف "معراج العاشقین" منسوب ہے، جسے سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے شائع کیا تھا۔لیکن یہ کتاب ان کی نہیں ہے بلکہ بعد کے دور کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی ہے۔اس کے علاوہ نظم ونثر کے چند اور چھوٹے چھوٹے رسالے جیسے شکارنامہ، تلاوت الوجود، چکی نامہ وغیرہ بھی خواجہ بندہ نواز سے منسوب ہیں لیکن کسی بھی تصنیف کے بارے میں قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ خواجہ صاحب ہی نے تحریر کی ہے۔ان سے منسوب تمام رسائل دکنی اردو میں ہیں اور ان کا موضوع تصوف ہے۔

فخر دین نظامی بیدر کا متوطن اور بہمنی دور کا ایک اہم شاعر ہے۔اس کی مثنوی" کدم راؤ پدم راؤ "اردو کی اولین تصنیف سمجھی جاتی ہے۔یہ مثنوی بہمنی خاندان کے مشہور حکمران سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد میں لکھی گئی۔اس لیے اس کی زبان بھی آج کی زبان سے الگ اور مشکل معلوم ہوتی ہے۔مثنوی کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ نظامی ایک قادرالکلام اور پرگو شاعر تھا۔زبان وبیان پر اسے بے پناہ قدرت حاصل تھی، اس نے اپنی مثنوی میں ضرب الامثال اور محاوروں کا بھی کثرت سے استعمال کیا ہے۔مثنوی" کدم راؤ پدم راؤ" کو اردو زبان کی تاریخ میں، اس لحاظ سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ یہ اردو کی پہلی ادبی تصنیف ہے۔اس سے پہلے کی جو تحریریں دستیاب ہوئی ہیں سب کی سب تصوف اور مذہب سے متعلق ہیں۔صرف اس مثنوی میں ادبیت کی چاشنی نظر آتی ہے۔

میراں جی شمس العشاق بہمنی دور کے ایک بہت بڑے صوفی اور شاعر ہیں۔خواجہ بندہ نواز کے سلسلہ صوفیا سے تعلق رکھتے ہیں۔شمس العشاق نے اپنے بزرگوں کی طرح درس وتدریس اور تصنیف کے لیے دکنی زبان کا استعمال کیا۔ان کی تصانیف میں مغز مرغوب، شہادت الحقیق، خوش نامہ اور خوش نغز مشہور اور اہم ہیں۔میراں جی شمس العشاق کی سبھی تصانیف کا موضوع تصوف ہے۔انہوں نے اپنے مریدوں، معتقدوں اور عام لوگوں کی تلقین وہدایت کے لیے بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔

بہمنی عہد کے اہم اور باکمال شعرا میں سید شاہ اشرف بیابانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ان کی تصانیف میں نوسرہار، لازم المبتدی اور واحد باری ہیں۔ اشرف بیابانی کی سب سے اہم اور قابل ذکر مثنوی نوسرہار ہے۔یہ مثنوی نو ابوب اور بیس فصلوں میں تقسیم کی گئی ہے۔اس کا موضوع شہادت حضرت امام حسین اور واقعہ کربلا کا بیان ہے۔اس مثنوی کے ہر باب کو گویا ایک انمول ہار کہا گیا ہے۔اور اسی مناسبت سے اس کا نام "نوسرہار" تجویز کیا گیا ہے۔مثنوی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ نوسرہار مجلسوں میں سنانے کے لیے لکھی گئی تھی اسی لیے اس میں سلیس اور عام فہم زبان استعمال کی گئی ہے۔

بہمنی دور کے آخری عہد میں فیروز بیدری نے ایک باکمال سخن ور کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔اس کی ایک مختصر سی مثنوی پرت نامہ کے علاوہ چند غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔لیکن گولکنڈہ کے بلند پایہ شاعروں مثلاً محمد قلی قطب شاہؔ وجہیؔ اور ابن نشاطیؔ نے اپنے کلام میں جس انداز سے فیروزؔ کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا کہ فیروزؔ بیدری اپنے وقت کا ایک استاد سخن تھا۔فیروزؔ کا ہم عصر محمودؔ تھا جس نے دکنی کے علاوہ پنجابی اور فارسی میں شاعری کی۔اسے بھی استاد مانا گیا۔

بہمنی دور کے دیگر شعرا میں قریشی بیدری، مشتاقؔ اور لطفیؔ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔قریشی نے ایک مثنوی "بھوگ بل" اپنی یادگار چھوڑی ہے۔مشتاقؔ اور لطفیؔ کی چند غزلیں اور قصیدے دستیاب ہوئے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ بہمنی دور میں اردو ادب کے ارتقا کے موضوع پر ایک نوٹ لکھیے۔

7.4 عادل شاہی دور میں اردو ادب کا سماجی و تہذیبی پس منظر

پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں جب بہمنی حکومت کو زوال ہوا تو جنوبی ہند میں پانچ نئی اور خود مختار سلطنتوں کا قیام عمل میں آیا۔بیجاپور میں عادل شاہی، گولکنڈہ میں قطب شاہی احمد نگر میں نظام شاہی، برار میں عماد شاہی اور بیدر میں برید شاہی سلطنت قائم ہوئی۔ان ریاستوں میں بیجاپور کی عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی مملکت کو، اردو ادب کے ارتقا کے علاوہ سماج، تہذیب وثقافت کی ترقی کے سلسلہ میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

عادل شاہی سلاطین نے قطب شاہی حکمرانوں کی طرح نہ صرف دکنی شعر و ادب کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی بلکہ مقامی تہذیبی رجحانات اور اقدار کی ترویج واشاعت میں بھی اہم حصہ لیا۔اس خاندان کے تمام سلاطین صاحب سیف وقلم اور میدان کارزار کے سورما ہونے کے علاوہ علوم وفنون اور شعر وسخن کے رسیا بھی تھے۔یوسف عادل شاہ سے سکندر عادل شاہ تک، عادل شاہی خاندان کے نو(9) فرمان رواؤں نے کم وبیش دوسو سال تک بیجاپور پر حکمرانی کی۔

عادل شاہی سلطنت کا بانی یوسف عادل شاہ تھا۔بہمنی سلطنت جب کمزور ہوگئی تو اس نے 1490ء میں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔یوسف عادل شاہ کا زیادہ تر وقت اگر چہ کہ سلطنت کے استحکام میں گزرا لیکن اس کے باوجود اس نے شاعروں، ادیبوں اور اہل فن کی سرپرستی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔یوسف عادل شاہ نہ صرف فنون لطیفہ کا اچھا ذوق رکھتا تھا بلکہ خود بھی فارسی زبان میں شعر کہتا تھا۔وہ طبلہ، ستار، طنبورہ اور عود خوب بجاتا تھا ساتھ ہی ساتھ اسے فن موسیقی، عروض وقافیہ میں بھی مہارت تھی۔علما، فضلا اور اہل ہنر کا بڑا قدر دان تھا۔اس نے کئی قلعے اور خوب صورت عمارتیں بنوا کر شہر بیجاپور کی زینت بڑھائی۔اس کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں فرخ محل اور آنند محل کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

یوسف عادل شاہ کی وفات کے بعد، اس کا فرزند اسمٰعیل عادل شاہ 1518ء میں بیجاپور کے تخت کا وراث بنا۔اسمٰعیل بھی اپنے والد کی طرح ادب نواز اور رعایا پرور حکمران تھا۔اس کو بھی فنون لطیفہ سے خاص لگاؤ تھا۔فارسی میں شعر کہتا تھا۔شاعری، موسیقی اور نقاشی میں بھی اس کو کمال حاصل تھا۔اسمٰعیل عادل شاہ کو فارسی اور ترکی سے غیر معمولی دلچسپی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے ایک شہر کا نام چندا پور اور ایک محل کا نام چمپا محل رکھا، جس

سے اس کی مقامی تہذیب وتمدن سے اثر پذیری کا اندازہ ہوتا ہے۔اسمٰعیل عادل شاہ کے انتقال کے بعداس کا بیٹا ابراہیم عادل شاہ مملکت بیجاپور کے تیسرے حکمران کی حیثیت سے 1534ء میں تخت نشین ہوا۔اگرچہ ابراہیم خود شاعر نہیں تھا لیکن اپنے آباد اجداد کی طرح ذوق علم وادب سے بہرہ مند تھا۔شاعروں، عالموں اور اہل فن کار کا بڑا اقدر دان تھا۔

ابراہیم عادل شاہ کے بعداس کا فرزند اور عادل شاہی دور کا چوتھا حکمران علی عادل شاہ 1557ء میں تخت نشین ہوا۔اس حکمران کے دور میں علم و فن اور شعر وسخن کو خوب ترقی ہوئی۔وہ بڑا اولوالعزم اور صاحب تدبیر بادشاہ تھا۔علی عادل شاہ شعرا اور اہل علم کی سرپرستی میں اپنے آبا واجداد سے بھی آگے تھا۔اس کے ذوق مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ وہ سفر میں بھی کتابوں کے صندوق اپنے ساتھ رکھتا تھا۔اس کے دور میں رفاہ عام کے بہت سے کام ہوئے۔اس نے کئی مسجدیں، قلعے اور محلات تعمیر کروائے۔اس کے دور میں صنعت وحرفت اور تجارت کو کافی فروغ ہوا۔شاہ پور جس کو خود بادشاہ نے بسایا تھا، بہت بڑی تجارتی منڈی بن گیا۔

علی عادل شاہ کے بعداس کا بھتیجا اور سلطنت بیجاپور کا پانچواں تاجدار ابراہیم عادل شاہ ثانی 1580ء میں بیجاپور کے تخت کا وارث بنا۔وہ بھی نہ صرف صاحب علم وفضل تھا بلکہ مصوری، نقاشی، موسیقی، شاعری اور خطاطی میں بھی قدرت رکھتا تھا۔اسی وجہ سے اس کو" جگت گرو" کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔کتاب ''نورس'' ابراہیم عادل شاہ ثانی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔اس کتاب کے مطالعہ سے اس کے شاعرانہ کمال اور فن موسیقی سے غیر معمولی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور کے باکمال دکنی شعرا میں عبدلؔ بیجاپوری اور مقیمؔی کے نام قابل ذکر ہیں۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کے انتقال کے بعد، اس کا فرزند محمد عادل شاہ 1226ء میں سریرآرائے سلطنت بنا۔اس نے اپنے والد کی قائم کردہ تمام روایات کو برقرار رکھا اور اہل علم و ادب اور اہل فن کی قدر دانی میں اپنے آباوجداد سے کسی طرح پیچھے نہیں تھا۔اس دور کے شاعروں میں رستمی، ملک خوشنود، ظہورابن ظہوری، صنعتی، حسن شوقی وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔محمد عادل شاہ کی وفات کے بعداس کا بیٹا مملکت بیجاپور کا ساتواں حکمران علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ 1656ء میں بیجاپور کے تخت پر رونق افروز ہوا، دیگر عادل شاہی سلاطین کی طرح شاہیؔ بھی ایک علم دوست اور ادب نواز بادشاہ تھا، اس کو شاعری، موسیقی اور فن تعمیر سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔وہ دکنی اردو کا ایک قادر الکلام شاعر تھا۔وہ نورس' کی طرز کے راگ اور گیت لکھنے پر بھی مہارت رکھتا تھا۔شاہیؔ کی بنائی ہوئی تاریخی عمارتوں میں حسینی محل، بادشاہ محل، جامع مسجد، حسینی مسجد، عرش محل اور علی دادمحل قابل ذکر ہیں۔اس کے دربار سے ملک الشعرا ملا نصرتی، امین الدین اعلیٰ، ہاشمی اور مرزا جیسے اردو کے سخن ور وابستہ تھے۔علی عادل شاہ ثانی کی وفات کے بعد سکندر عادل شاہ 1672ء میں مملکت کا وارث بنا۔اس حکمران کا دور اندرونی اور بیرونی خلفشار کی وجہ سے اضطراب اور بے چینی کا زمانہ تھا۔شیواجی اور اورنگ زیب کے حملوں کی وجہ سے مملکت بیجاپور کو زبردست خطرہ لاحق ہوگیا تھا اور آخرکار 1656ء میں اورنگ زیب نے بیجاپور کو فتح کر کے مغلیہ سلطنت کے ایک صوبے میں شامل کرلیا لیکن ایسے پراضطراب عہد میں بھی علم وفن، تہذیب وتمدن اور شعروسخن کا چراغ برابر جلتا رہا۔سکندر عادل شاہ کے عہد کے شاعروں میں عبداللطیف، سیوا، مومن اور معظم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

عادل شاہی دور اردو ادب کے ارتقا کے سلسلہ میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔اس عہد کے شاعروں اور ادیبوں نے دکنی اردو کو مختلف ارتقائی منزلوں سے روشناس کیا اور مختلف اصناف شعر جیسے غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی کے علاوہ نثر نگاری کی طرف بھی باقاعدہ توجہ کی۔لیکن مجموعی حیثیت سے شاعری کا پلہ نثر نگاری کے مقابلے میں بھاری ہے۔عادل شاہی دور کے کم وبیش تمام حکمران علم وادب اور شعروسخن کے سرپرست اور دلدادہ تھے۔ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو اور عادل شاہ ثانی شاہیؔ کو اس خاندان کے دیگر فرمانرواؤں کے مقابلے میں اس لیے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ دونوں نے نہ صرف عالموں، شاعروں، ادیبوں اور اہل فن کاروں کی دل کھول کر سرپرستی کی بلکہ دونوں موسیقی اور فن کے قدر دان بھی تھے۔اور ساتھ ہی ساتھ خود بھی شعر کہتے

تھے،خصوصاً علی عادل شاہ شاہیؔ کو بہ حیثیت شاعرایک اعلیٰ مقام ومرتبہ حاصل ہے۔شاہی کے علاوہ اس عہد کے دیگر اساتذہ سخن میں حسن شوقی،ملک الشعرانصرتی اور ہاشمی بیجاپوری کے نام قابل ذکر ہیں۔حسن شوقی قدیم دکنی کے دو یا تین اہم غزل گوشاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔غزلوں کے ایک دیوان کے علاوہ اس کی دومثنویاں "فتح نامہ نظام شاہ" اور "میزبانی نامہ" ہیں۔

حسن شوقیؔ ایک باکمال مثنوی نگاراوراعلیٰ پایہ غزل گوتھا۔''فتح نامہ نظام شاہ''(1564ء)دکنی اردو کی ایک قدیم ترین مثنوی ہے۔جس میں نظام شاہ کو قصے کے ہیرو کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے جنگ تالی کوٹ کی فتح کا سہرااسی کے سر باندھا ہے حالاں کہ اس جنگ میں وجیانگر کے راجارام کے خلاف چار بادشاہوں(ابراہیم قطب شاہ،علی عادل شاہ اول،حسین نظام شاہ اورعلی بریدشاہ)نے فتح حاصل کی تھی۔

"میزبانی نامہ" میں محمد عادل شاہ کی اس شادی کوموضوع بنایا گیاہے جونواب مظفرخاں کی دختر سے ہوئی تھی۔اس مثنوی میں محمد عادل شاہ کی علم پروری اوراہل علم وہنر کی قدردانی اوراس کی شجاعت وفیاضی کا بھی تذکرہ ملتا ہے حسن شوقیؔ کوغزل گوکی حیثیت سے دکنی اردو کے شاعروں میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔اس کی غزلیں قدیم اردو شاعری میں ایک نئے رنگ وآہنگ کی ترجمانی کرتی ہیں۔سادگی،روانی،موسیقیت اورنغمگی حسن شوقیؔ کی غزل کا نمایاں وصف ہے۔

نصرتیؔ عادل شاہی عہد کےعظیم المرتبت شعرامیں شمار ہوتا ہے۔نصرتیؔ نے شاعر کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کی اور ملک الشعرا کے عہدے پر بھی فائز ہوا۔نصرتیؔ کی تین مثنویاں گلشن عشق،علی نامہ اورتاریخ اسکندری کے علاوہ غزلوں،قصائداور رباعیوں پرمشتمل ایک دیوان بھی منظرعام پرآیا ہے۔

" گلشن عشق"ایک بزمیہ مثنوی ہے۔جس میں کنورمنوہراورمدمالتی کی عشقیہ داستان نظم کی گئی ہے۔جب کہ''علی نامہ'' رزمیہ شاعری کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔اس مثنوی میں سات بلند پایہ اورمعرکتہ الآرا قصیدے بھی شامل ہیں۔نصرتیؔ ایک بے مثال قصیدہ گو،بلند پایہ مثنوی نگاراور باکمال غزل گو بھی تھا۔قصیدہ نگاری کے میدان میں دبستان دکن کا کوئی شاعر اس کے مرتبے کا نہیں ہے۔اگر چہ اس کے قصائد کی تعدادزیادہ نہیں ہے لیکن بلندی تخیل،شوکت لفظی اورگھن گرج کے نقطہ نظر سے نصرتیؔ کے قصائد نہ صرف دبستان دکن بلکہ قصیدہ نگاری کی تاریخ میں بھی اہمیت رکھتے ہیں۔

بیجاپورسلطنت کا آٹھواں تاجدارسلطان علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ نہ صرف ایک عظیم الشان مملکت کا مطلق العنان حکمران تھا بلکہ قدیم دکنی زبان کا ایک صاحب دیوان شاعر اور سلطان محمد عادل شاہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔شاہیؔ نے کم وبیش تمام اصناف سخن پرطبع آزمائی کی ہے۔اس کے کلیات میں غزلوں،قصیدوں اورمثنویوں کے علاوہ گیت،دوہرے گیت اور جھولنا بھی ملتے ہیں۔جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے شاہی عادل شاہی دور کے اہم متغزلین میں شمار ہوتا ہے۔اس کے قصیدے بھی نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔شاہیؔ کے کلام میں مقامی تہذیبی روایات اور مقامی ماحول کی بھرپورترجمانی ملتی ہے۔اس نے اپنے تجربات زندگی،مشاہدات اوراحساسات کوسادگی اورروانی کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہاشمیؔ،عادل شاہی دور کے آخری دور کے شعرامیں ایک پرگواور باکمال شاعر تھا وہ نابینا تھا۔اس نے اورنگ زیب عالم گیر کے صوبہ دارنواب ذوالفقار خاں نصرت جنگ کی مدح میں قلعہ چنجی کی فتح(1698ء)کے موقع پرایک قصیدہ لکھا تھا۔ہاشمیؔ نے ریختی میں ایک مکمل دیوان اپنی یادگار چھوڑا ہے،جوشائع ہوگیاہے اس کی غیرمطبوعہ تصانیف میں مثنوی "یوسف زلیخا" (1687ء)معراج نامہ کے نام قابل ذکر ہیں۔اس کی ایک مختصرہجویہ مثنوی بھی شائع ہوئی ہے۔مثنوی "یوسف زلیخا" تقریباپانچ ہزارابیات پرمشتمل ایک ضخیم مثنوی ہے۔عادل شاہی اور قطب شاہی دور کے دیگرشعرانے بھی یوسف زلیخا کوموضوع بناکراوربھی مثنویاں لکھی ہیں لیکن اس موضوع پرسب سے بلند پایہ مثنوی ہاشمی بیجاپوری کی ہی ہے۔ہاشمی ایک بے مثال مثنوی نگار،بلند پایہ غزل گواور باکمال قصیدہ نگاربھی تھا۔

عادل شاہی دور کے شاعروں نے اگر چہ غزل،قصیدہ،مرثیہ اور رباعی کی صنف پربھی باقاعدہ توجہ دی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی،مثنوی کی صنف

ہی تمام اصناف سخن پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔اس دور کے دیگر قابل ذکر مثنویوں میں برہان الدین جانمؔ کی ارشاد نامہ،عبدلؔ کی ابراہیم نامہ،مقیمیؔ کی چندر بدن ومہیار، ملک خوشنودؔ کی جنت سنگار،رستمیؔ کی خادرنامہ، علی رحمتی کی "پنددل بند"ایاغیؔ کی نجات نامہ،صنعتیؔ کی قصہ بے نظیراور عاجزؔ کی لیلیٰ مجنوں کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

عادل شاہی دور میں شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کی طرف بھی با قاعدہ توجہ کی گئی لیکن جہاں تک عشقیہ موضوعات اور ادبیات کا تعلق ہے،نثر نگاری کے مقابلے میں شاعری کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔اس دور کی کم وبیش تمام نثری تصانیف چوں کہ صوفیائے کرام کی تخلیقات ہیں اس لیے ان پر مذہب کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔عادل شاہی دور کی نثری تصانیف میں جانمؔ کی کلمتہ الحقائق،امین الدین اعلیٰ کی کلمتہ الاسرار،معظم بیجاپوری کی شرح شکار نامہ اہمیت رکھتی ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ عادل شاہی سلطنت کا بانی کون تھا؟

2۔ مثنوی گلشن عشق کس کی تصنیف ہے؟

3۔ گول گنبد کس نے تعمیر کروایا؟

7.5 قطب شاہی دور میں اردو ادب کا سماجی وتہذیبی پس منظر

قطب شاہی مملکت کا بانی فرماں رواسلطان قلی تھا۔اس کے آباواجداد ترکستان کے رہنے والے تھے۔اس خاندان کے بعض افراد،ترکستان سے ایران اور ہندوستان منتقل ہوگئے۔سلطان قلی بہمنی مملکت کے حکمران محمد شاہ بہمنی کے عہد میں بیدر آیا اور دربار شاہی میں ملازمت اختیار کر لی سلطان قلی نے اپنی علمی اور انتظامی صلاحیتوں کی بدولت خوب ترقی کی۔1496ء میں اس کو تلنگانہ کا صوبیدار بنایا گیا۔اپنی صوبیداری کے دور میں اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے اس نے تلنگانہ کے عوام میں کافی شہرت حاصل کی۔جب بہمنی سلطنت زوال آمادہ ہوگئی تو 1518ء میں سلطان قلی نے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور سلطان قلی قطب شاہ کے نام سے قطب شاہی سلطنت کی بنیاد رکھی۔سلطان قلی کو بڑھاپے میں اس کے بیٹے جمشید قلی نے قتل کروایا اور جمشید قطب شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا۔جمشید قلی کی وفات کے بعد اس کے بیٹے سبحان قلی کو سات سال کی عمر میں تخت نشین کیا گیا لیکن سبحان قلی کی کم سنی کی وجہ سے اہل دربار کا ایک طبقہ اس کی حکومت کے خلاف ہوگیا اور سبحان قلی کی چند مہینوں کی بادشاہت کے بعد سلطان قلی کے سب سے چھوٹے بیٹے ابراہیم قطب شاہ کو1550ء میں تخت نشین کیا گیا۔ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی کے بعد گولکنڈہ کی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ابراہیم قطب شاہ کے دور میں اس ریاست کو بڑا استحکام حاصل ہوا۔اس نے نظم ونسق میں مفید اصلاحیں کیں۔ابراہیم کی زندگی کا بڑا حصہ چوں کہ ایک تلگو ریاست وجیانگر میں بسر ہوا تھا۔اس لیے اس کے مزاج میں مملکت میں بسنے والے مختلف طبقات کے تعلق سے مروت اور رواداری کے جذبات موجود تھے۔یہی وجہ ہے کہ ابراہیم قطب شاہ کے دور میں تلنگانہ میں بسنے والے مختلف فرقوں کے مابین بڑی یکجہتی وہم آہنگی پیدا ہوگئی تھی۔ابراہیم قطب شاہ کو فارسی اور اردو کے ساتھ ساتھ تلگو زبان سے بھی دلچسپی تھی تلگو شاعروں میں وہ بالعموم ''ملکی بھرام'' کے نام سے مقبول تھا۔اردو ادب کی تاریخ میں ابراہیم قطب شاہ کو اس لحاظ سے اہمیت حاصل ہے کہ اس دور میں گولکنڈہ کی سرزمین پر پہلی بار شعر وادب کی شمع روشن ہوئی۔قطب شاہی دور کے اولین شعرا فیروزؔ،محمودؔ اور ملا خیالیؔ اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

ابراہیم قلی قطب شاہ کی وفات کے بعد اس کا فرزند سلطان محمد قلی قطب شاہ 1580ء میں گولکنڈہ کے تخت پر رونق افروز ہوا۔اس کو خوش قسمتی سے ایک مستحکم اور طاقت ور سلطنت اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی اور اس کا دور حکومت دو ایک معمولی لڑائیوں کو چھوڑ کر بڑی حد تک امن وامان میں گزرا۔محمد

قلی قطب شاہ نہ صرف ایک خوش نما شہر کا بانی، رعایا پرور حکمران اور دکنی تہذیب وتمدن کا معمار تھا بلکہ قدیم اردو کا ایک خوش گو شاعر بھی تھا۔اس کے عہد میں ایران کے ایک مشہور عالم میر محمود مومن حیدر آباد آئے تھے،جنھیں بادشاہ نے اپنا مشیر مقرر کیا تھا۔مملکت کے بیشتر کاروبار کی عام نگرانی میر محمد مومن ہی کے سپرد تھی۔یہی سبب تھا کہ محمد قلی کو سیاسی اور انتظامی امور سے بڑی حد تک بے فکر اور آزاد رہ کر عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کا موقع مل گیا۔وہ ایک طرف اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے تو دوسری طرف اپنے دور کا ایک باکمال خوش نویس بھی۔محمد قلی قطب شاہ کے عہد حکومت میں تعمیر کی گئی متعدد عمارتوں میں ثلث،کوفی،نسخ،نستعلیق،طغرا وغیرہ نہج خط کے عمدہ نمونے موجود ہیں۔جس تہذیب وتمدن کو "ہند المانی کلچر" کے نام سے یاد کرتے ہیں اس کے نمایاں خدوخال سلطان محمد قلی قطب شاہ،اکبر اعظم اور ابراہیم عادل شاہ ثانی جگت گرو کے عہد ہی میں نظر آتے ہیں۔محمد قلی قطب شاہ کی انسان دوستی اور مذہبی رواداری کا یہ عالم تھا کہ غیر مسلموں اور خصوصاً ہندوؤں کی سرپرستی میں وہ اپنی مثال آپ تھا۔اس کے با اعتماد مشیروں،مقربین اور عمائدین سلطنت میں بہت سے ہندو بھی شامل تھے۔اس کے عہد حکومت میں متعدد مسجدیں،خانقاہیں،عاشور خانے،محلات شاہی اور باغات بنوائے گئے۔اس کے عہد کا ایک یادگار کارنامہ شہر حیدر آباد کی تاسیس ہے۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد،اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد قطب شاہ 1611ء میں گولکنڈہ کا بادشاہ بنا۔وہ بھی اپنے آباو جداد کی طرح علوم وفنون کا بہت شوقین تھا لیکن اس کا مزاج وکردار محمد قلی قطب شاہ کے مقابلے میں قدرے مختلف تھا۔محمد قلی قطب شاہ شعروادب اور رقص وموسیقی کا دلدادہ تھا جب کہ محمد قطب شاہ کو فنون لطیفہ سے کہیں زیادہ مذہبی علوم،فلسفہ اور تاریخ سے کافی دلچسپی تھی۔سلطان محمد قلی قطب شاہ کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں مکہ مسجد کی تاسیس اس کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔اگرچہ اس مسجد کی تعمیر پشتوں کے بعد مکمل ہوئی۔لیکن اس کا سنگ بنیاد خود محمد قطب شاہ ہی نے اپنے دست مبارک سے رکھا تھا۔سلطان محمد قطب شاہ کے بنوائے ہوئے دیگر محلات میں امان محل اپنی آرائش وزیبائش کے اعتبار سے بہت مقبول تھا۔

محمد قطب شاہ کی وفات کے بعد،عبداللہ قطب شاہ 1625ء میں سلطنت گولکنڈہ کے ساتویں حکمران کی حیثیت سے تخت نشین ہوا۔سلطان عبداللہ قطب شاہ اپنے نانا محمد قلی قطب شاہ کی طرح علم وہنر،شعروادب اور رقص وموسیقی کا قدرداں تھا۔وہ خود بھی ایک صاحب دیوان شاعر تھا اس نے سلطان محمد قلی قطب شاہ کی قائم کردہ تمام سماجی،تہذیبی اور ادبی روایات کو از سر نو جلا بخشی۔سلطان عبداللہ کو محمد قلی قطب شاہ کی طرح مذہبی اور غیر مذہبی تقاریب اور تہواروں سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ان تقاریب کے موقع پر زر کثیر خرچ کر کے جشن کا اہتمام کیا جاتا تھا۔دیگر قطب شاہی سلاطین کی طرح اس نے متعدد باغ اور شاہی محلات تعمیر کروائے تھے۔سلطان عبداللہ قطب شاہ کے انتقال کے بعد اس کا داماد اور مملکت گولکنڈہ کا آخری تاجدار سلطان ابوالحسن تانا شاہ 1672ء میں تخت نشین ہوا۔اس کے دور حکومت میں مرہٹوں اور مغلوں کی یورش کی وجہ سے گولکنڈہ میں بے اطمینانی،اضطراب اور انتشار پیدا ہو گیا تھا۔جنوبی ہند کی سیاسی تاریخ کے ایسے نازک عہد میں شاہ ابوالحسن نے حکمت عملی اور تدبر کام لیتے ہوئے ملک کے داخلی اور خارجی حالات پر قابو پانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔یہاں تک کہ 1686ء میں مغل حکمراں اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھوں قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

قطب شاہی دور کے اولین شعرا میں فیروز،محمود اور خیالی کے نام ملتے ہیں یہ تینوں شعرا ابراہیم عادل شاہ کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔فیروز دراصل بیدر کا باشندہ تھا اور بہمنی سلطنت کے آخری زمانے میں گولکنڈہ چلا آیا۔گولکنڈہ آنے سے قبل وہ بیدر کے باکمال شاعروں میں شمار ہوتا تھا۔گولکنڈہ کے علمی وادبی حلقوں میں بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔فیروز کی گولکنڈہ میں آمد وہی حیثیت رکھتی ہے جیسے کہ ولی کا سفر دہلی،جس کے بعد شمالی ہند میں اردو کا چراغ روشن ہوا۔فیروز کی مختصر سی مذہبی رنگ کی مثنوی ''پرت نامہ'' کے علاوہ چند غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔فیروز کی طرح سید محمود اور خیالی بھی قطب شاہی دور کے ابتدائی اہم شاعر تھے جنھیں دکنی کے بلند پایہ شعرا محمد قلی قطب شاہ،وجہی اور ابن نشاطی نے استاد سخن کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔محمود اور خیالی کی دو تین غزلوں کا پتہ چلتا ہے۔

قطب شاہی دور کے نامور اور باکمال شاعروں اور ادیبوں میں ملک الشعرا اسداللہ وجہی، سلطان محمد قلی قطب شاہ، ملک الشعرا غواصی اور ابن نشاطی کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

اسداللہ وجہی سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد حکومت کا ملک الشعرا اور قدیم اردو دکنی زبان کا ایک عظیم المرتبت شاعر اور بلند پایہ ادیب بھی تھا۔ وجہی کی اہم شعری تصنیف "قطب مشتری" (1609ء) ہے۔ اس مثنوی میں محمد قلی اور بنگالہ کی شہزادی مشتری کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ عشقیہ شاعری میں ڈوبی ہوئی اس طبع زاد مثنوی میں وجہی نے سلطان وقت محمد قلی قطب شاہ کے مزاج و کردار، شجاعت، فیاضی اور جذبۂ محبت کی تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ اس مثنوی کے مطالعہ سے وجہی کی قادرالکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔

وجہی کی دوسری اہم تصنیف ''سب رس'' ہے۔ دکنی ادب کی یہ معرکتہ الارا تصنیف سلطان عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر 1635ء میں لکھی گئی یہ داستان ایک فارسی تصنیف "حسن ودل" کے قصہ پر مبنی ہوتے ہوئے بھی ایک تخلیقی شاہکار کہی جاسکتی ہے۔ کیوں کہ وجہی نے پیچیدہ اور خشک فلسفیانہ مسائل کو ادبی حسن کے ساتھ دکنی اردو میں بیان کیا ہے۔ ''سب رس'' قدیم اردو کی ایک داستان ہی نہیں بلکہ اردو نثر کے دو یا تین منتخب پاروں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی داستان ہے جس میں مختلف انسانی جذبات و احساسات یا انسانی صلاحیتوں اور قوتوں مثلاً عقل، دل، خیال، غصہ، حسد وغیرہ کو کرداروں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ سب رس کا اسلوب مقفّٰی ہوتے ہوئے بھی سادہ و پرکار ہے۔ بعض مقامات پر وجہی نے انشائیوں کی صورت میں، حقائق حیات کے متعلق فلسفیانہ اور حکیمانہ نکات بیان کیے ہیں جس کی وجہ سے یہ داستان زندہ جاوید ہوگئی ہے۔ قطب مشتری اور سب رس کے علاوہ وجہی نے چند اردو غزلیں اور ایک فارسی دیوان بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ ایک اور نثری تصنیف "تاج الحقائق" بھی وجہی سے منسوب کی جاتی ہے۔

قطب شاہی سلطنت کا پانچواں حکمران، محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کا دیوان پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے جس میں غزل، قصیدہ، رباعی وغیرہ تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ جہاں تک غزلوں کی تعداد اور تنوع کا تعلق ہے، محمد قلی قطب شاہ دکنی اردو کا سب سے اہم شاعر قرار پاتا ہے۔ اس کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت سادگی بیان ہے۔ اس نے اپنے جذبات، احساسات اور تجربات زندگی کو سادگی، روانی اور حقیقت پسندی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی شاعری گویا اس کی زندگی کا آئینہ ہے جس میں اس کے واقعات حیات کی متحرک تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں درد و غم اور ہجر و فراق کی کیفیات کی ترجمانی تقریباً نہیں ملتی۔ اس لحاظ سے وہ اردو کا ایک منفرد شاعر ہے۔

محمد قلی قطب شاہ نے اپنی نجی سماجی اور سیاسی زندگی کے تجربات کو اپنے کلام میں بے کم و کاست بے نقاب کیا ہے۔ اس نے عید میلاد، شب معراج، شب برات جیسے موضوعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں اور بسنت، دیوالی اور ہولی پر بھی۔ لیکن یہ ساری تقاریب خواہ وہ مذہبی نوعیت کی ہوں یا موسمی تہواروں کی، محمد قلی قطب شاہ کے لیے عیش و عشرت کے ایک تازہ عنوان کی حیثیت رکھتی ہیں۔

وجہی اور سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دبستان گولکنڈہ کے نامور شاعروں میں ملک الشعرا غواصی کا نام قابل ذکر ہے۔ غواصی دکنی زبان کا ایک قادرالکلام اور بلند پایہ شاعر ہے۔ وہ ابراہیم قطب شاہ کے دور میں پیدا ہوا، محمد قلی کے عہد میں اس نے شاعری کا آغاز کیا اور بہت جلد ایک پرگو شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ عبداللہ قطب شاہ کے دور میں ترقی کرکے وہ قطب شاہی سلطنت کا ملک الشعرا بن گیا۔ تین مثنویوں میناست ونتی، سیف الملک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ کے علاوہ غزلوں، قصیدوں، رباعیوں اور مرثیوں پر مشتمل غواصی کا ایک دیوان بھی ہے۔ غواصی کو اپنی زندگی ہی میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی وہ اپنے آپ کو ہندوستان کا سب سے بڑا شاعر اور ایک نئی طرز کا بانی کہتا ہے۔ غواصی کی یہ شاعرانہ تعلّی بے جا نہیں ہے۔ غواصی کی تینوں مثنویوں کے قصے طبع زاد نہیں ہیں۔ لیکن اس نے اپنے تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انہیں بڑی حد تک طبع زاد مثنویوں کی حیثیت دے دی ہے۔ زبان و بیان کی سادگی، تاثر کی فراوانی، ماحول کی ترجمانی اور حقیقت نگاری غواصی کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ غواصی نے

غزل،قصیدہ اور رباعی کے میدان میں بھی اپنی فنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔خصوصاً غزل گوئی کے میدان میں قدیم اردو کا کوئی شاعر اس کی برابری کو نہیں پہنچتا۔زبان و بیان کی سادگی،سوز و گداز اور تاثر کی فراوانی غواصی کے تغزل کا نمایاں وصف ہے۔

دبستان گولکنڈہ کے دیگر شاعروں میں احمد گجراتی،عبداللہ قطب شاہ،ابن نشاطی،جنیدی،فائز اور طبعی کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

احمد گجراتی نے اپنی دو مثنویاں ''یوسف زلیخا'' اور ''لیلیٰ مجنوں'' محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں پیش کی تھیں۔عبداللہ قطب شاہ بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہے لیکن اس کی غزلیں اس کے پیش رو شعرا وجہی،محمد قلی قطب شاہ اور غواصی کے مرتبے کو نہیں پہنچتیں۔ابن نشاطی قطب شاہی سلطنت کا ایک اہم مثنوی نگار ہے۔اس کی مثنوی ''پھول بن'' دکنی ادب کی ایک شاہکار تصنیف ہے۔ یہ تصنیف وجہی اور غواصی کی مثنویوں کے بعد دبستان گولکنڈہ کی سب سے اہم اور دلچسپ مثنوی ہے'' پھول بن'' کے مطالعہ سے ابن نشاطی کے کمال فن اور قادر الکلامی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔جنیدی کی ''ماہ پیکر''، فائز کی ''رضوان شاہ وروح افزا'' اور طبعی کی ''بہرام وگل اندام'' دبستان گولکنڈہ کے عہد آخر کی منتخب اور نمائندہ مثنویاں ہیں۔اسی طرح وجہی کے علاوہ قطب شاہی دور کے دیگر نثر نگاروں میں میراں یعقوب اور عابد شاہ حسینی کے نام مشہور ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ قطب شاہی خاندان کا بانی کون تھا؟

2۔ سب رس کس کی تصنیف ہے؟

3۔ مکہ مسجد کا سنگ بنیاد کس نے رکھا؟

7.6 خلاصہ

جنوبی ہند میں علاء الدین خلجی کے فتوحات سے بہت پہلے ایسے صوفیا اور علما کے نام ملتے ہیں جو جنوبی ہند کے مختلف علاقوں میں اردو زبان کی ترقی واشاعت میں خاموشی کے ساتھ اپنا کام انجام دے رہے تھے۔جیسے شاہ مومن، شاہ جلال الدین گنج رواں، سید احمد کبیر حیات قلندر، بابا شرف الدین، بابا شہاب الدین وغیرہ۔ تیرہویں صدی عیسوی علاء الدین خلجی کی فوجیں شمالی ہند سے دکن پہنچتی ہیں۔اس میں فوج کے علاوہ اہل ہنر، تاجر، صوفی اور فقیر بھی شامل ہیں۔علاء الدین خلجی سے فتح دکن کے بعد بعض اہم صوفیوں کے نام ملتے ہیں جیسے شاہ راجو قتال، شاہ برہان الدین غریب وغیرہ صوفیائے کرام جنوبی ہند کے مختلف خطوں میں مقامی زبانوں کے الفاظ کو شمال کی زبان میں ملا کر ایک ایسا ہیولیٰ تیار کیا جس سے زبان کے اظہار کی تمام دشواریاں دور ہو گئیں۔

سلطان محمد تغلق نے 1327ء میں پایہ تخت دہلی کے بجائے دیوگیری (دولت آباد) منتقل کیا۔لیکن جب 1347ء میں علاء الدین حسن بہمن شاہ نے جنوبی ہند میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اپنی سلطنت کا پایہ تخت دولت آباد کے بجائے گلبرگہ کو منتقل کر دیا۔بہمنی خاندان نے دو سو سال تک سر زمین جنوبی ہند پر حکمرانی کی۔بہمنی سلاطین نے علوم وفنون کے رشتہ سے مہاراشٹرا، کرناٹک اور تلنگانہ کے علاقوں میں اتحاد اور یکجہتی پیدا کی۔بہمنی سلاطین علم وادب، شعر وسخن اور فنون لطیفہ کے غیر معمولی قدر دان تھے۔انہوں نے عالموں، شاعروں اور باکمالوں کی سرپرستی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

بہمنی دور کے شاعروں اور ادیبوں میں خواجہ بندہ نواز، نظامی بیدری، اشرف بیابانی، میراں جی شمس العشاق اور فیروز کے نام قابل ذکر ہیں۔میراں جی شمس العشاق، فیروز اور اشرف کی مثنویاں مذہبی اور صوفیانہ موضوعات کی ترجمانی کرتی ہیں جب کہ فخر دین نظامی کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' اردو کی پہلی ادبی تصنیف ہے۔

قدیم اردو ادب کے ارتقا کے سلسلہ میں بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔یوسف عادل شاہ (1490-1518ء) سے سکندر عادل شاہ (1672ء1686-ء) تک جملہ (9) فرمانرواؤں نے تقریباً دو سو سال تک بیجاپور کی سلطنت پر حکمرانی کی۔ عادل شاہی خاندان کے

تمام حکمران نہ صرف میدان کا زرار کے سورما اور اہل علم تھے بلکہ شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کے قدردان بھی تھے۔ جس کے نتیجہ کے طور پر بیجاپور اہل علم وہنر اور شعر وسخن کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا۔ عادل شاہی دور کے شاعروں، ادیبوں اور اہل کمال میں فارسی اور عربی کے علما سے قطع نظر قدیم اردو کے اہم شاعروں اور ادیبوں میں برہان الدین جانمؔ، حسن شوقیؔ، مقیمیؔ، شاہیؔ، نصرتیؔ، ملک خوشنودؔ، رستمیؔ، ہاشمیؔ، صنعتیؔ، امین الدین اعلیٰ، شاہ معظم وغیرہ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

دبستان بیجاپور کے نمائندہ شاعر حسن شوقیؔ، شاہیؔ، نصرتیؔ اور ہاشمیؔ ہیں جنھوں نے مختلف اصناف سخن میں اپنی شعری صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ شاہی کے علاوہ دیگر شعرا نے مثنوی نگاری میں اپنے کمال فن کا لوہا منوایا ہے۔ لیکن شاہی کی فن کاری کا اندازہ غزل گوئی اور قصیدہ نگاری سے ہوتا ہے۔ جب کہ حسن شوقی، نصرتی اور ہاشمی بلند پایہ مثنوی نگار بھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ غزل گوئی کے میدان میں بھی ان کی اہمیت مسلم ہے۔ حسن شوقیؔ کی مثنوی ''میزبانی نامہ'' اور ''علی نامہ''، ہاشمیؔ کی ''یوسف زلیخا'' عادل شاہی دور کی اہم مثنویوں میں شمار ہوتی ہیں۔ ملک الشعرا نصرتیؔ دبستان بیجاپور کا ایک قادر الکلام اور اعلیٰ مرتبہ کا شاعر ہے۔ غزل گوئی اور مثنوی نگاری کے علاوہ اس نے قصیدہ گوئی کی طرف بھی باقاعدہ توجہ کی ہے۔ اس کا شمار اردو کے نمائندہ قصیدہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

قطب شاہی سلاطین نے کم وبیش ایک سوستر سال تک گولکنڈہ پر حکمرانی کی۔ بیشتر قطب شاہی حکمراں نہ صرف علوم وفنون کے قدردان تھے' بلکہ اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ شاعروں اور ادیبوں کی ہمت افزائی اور سرپرستی بھی کرتے تھے۔ صاحب دیوان قطب شاہی سلاطین میں محمد قلی قطب شاہ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ بطور خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اس کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ قصیدے رباعیاں اور مختلف موضوعات پر نظمیں بھی ملتی ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کا دیوان دراصل اس کی زندگی اور شخصیت کا آئینہ ہے۔ سادگی، روانی، برجستگی، سلاست اور حقیقت نگاری محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ کا ملک الشعرا اسداللہ وجہیؔ اپنے زمانے کا ایک عظیم المرتبت شاعر اور صاحب طرز ادیب بھی تھا۔ اس کی طبع زاد مثنوی ''قطب مشتری'' نہ صرف قطب شاہی عہد کی ایک لاجواب تصنیف ہے بلکہ اردو مثنوی کی تاریخ میں ایک اہم مقام کی مستحق ہے۔ اس مثنوی کے مطالعے سے شاعر کے کمال فن اور قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ قطب مشتری کو وجہیؔ نے صرف بارہ دن کے عرصہ میں مکمل کیا تھا۔ وجہیؔ ایک بلند پایہ نثر نگار بھی تھا اس کی تصنیف ''سب رس'' نہ صرف دکنی اردو نثر کی شاہکار تخلیق ہے بلکہ اردو نثر کے دو یا تین منتخب نثری شہ پاروں میں شمار ہوتی ہے۔ اس داستان میں چھوٹے چھوٹے جملوں کو قافیہ ردیف سے آراستہ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ جس سے اس میں بیک وقت شاعری اور نثر دونوں کا حسن نظر آتا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ اور وجہیؔ کے بعد قطب شاہی دور کا سب سے بڑا شاعر غواصیؔ ہے۔ اس نے نہ صرف مثنوی نگاری کے میدان میں نمایاں جوہر دکھائے اور'' مینا ست ونتی'' ''سیف الملک وبدیع الجمال'' اور'' طوطی نامہ'' جیسی بلند پایہ مثنویاں تصنیف کیں بلکہ قصیدہ نگاری، غزل گوئی اور رباعی گوئی میں اہم مقام حاصل کیا۔ محمد قلی قطب شاہ کے دور میں غواصیؔ کو رسائی نصیب نہیں ہوسکی لیکن عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں شاعر کی حیثیت سے غواصیؔ کی مقبولیت سارے ہندوستان میں پھیل چکی تھی۔ اس لیے سلطان عبداللہ قطب شاہ نے غواصیؔ کو اپنے دربار کا ملک الشعرا مقرر کیا۔ عبداللہ قطب شاہ کے دور میں اسے گولکنڈہ کے سفیر کی حیثیت سے بیجاپور بھی بھیجا گیا تھا جہاں اس کے شایاں شان استقبال کیا گیا۔ عادل شاہی عہد کے شاعروں نے غواصیؔ کا ذکر بڑی عزت واحترام کے ساتھ کیا ہے۔ زبان وبیان کی سادگی، جذبات واحساسات کی موثر ترجمانی اور سوز وگداز غواصیؔ کی شاعری کے اہم اوصاف ہیں۔

غواصیؔ کے بعد اس دور کے شعرا میں ابن نشاطیؔ نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ اس کی صرف ایک ہی مثنوی "پھول بن" دستیاب ہوئی

ہے۔لیکن شاعرانہ خوبیوں کی وجہ سے یہ اردو کی لازوال تصنیفات میں شمار کیے جانے کی مستحق ہے۔ابن نشاطی کے بعد اس دور کے دیگر شاعروں میں جنیدی، فائز اور طبعی اہم ہیں۔جب کہ نثر نگاروں کے میدان میں وجہی کے بعد میراں جی خدانما، عابد شاہ حسینی اور میراں یعقوب کے نام قابل ذکر ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد قطب شاہ سلطنت گولکنڈہ کا بادشاہ بنا۔اس کو زیادہ تر مذہبی علوم اور فلسفہ و تاریخ سے دلچسپی تھی۔اس کے بعد عبداللہ قطب شاہ تخت نشین ہوا۔وہ علم و ہنر، شعر و سخن اور رقص و موسیقی کا دلدادہ تھا۔اس کے بعد سلطان ابوالحسن تانا شاہ تخت نشین ہوا۔یہ اس خاندان کا آخری حکمران تھا۔اسی کے عہد میں 1686ء میں اورنگ زیب نے گولکنڈہ کو فتح کیا۔

7.7 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

1۔ جنوبی ہند میں اردو زبان کی آمد اور اشاعت کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

2۔ بہمنی دور کے سماجی اور تہذیبی پس منظر پر ایک نوٹ لکھیے۔

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

1۔ عادل شاہی دور کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

2۔ قطب شاہی دور کے شعر و ادب پر اظہار خیال کیجیے۔

7.8 فرہنگ

الفاظ	معنی
ہیولیٰ	ڈول، ڈھانچ، خاکہ، ماہیت
آمیزش	ملاوٹ، ملونی
خودمختار	بااختیار، آزاد
قیام پذیر	مقیم
برسرپیکار	جنگ کے لیے آمادہ
شیرازہ	انتظام، تنظیم
خلیفہ	نائب
ضرب المثل	وہ جملہ جو مثال کے طور پر کہا جائے، جمع ضرب الامثال
فنون لطیفہ	وہ فنون جو انسان کے ذوق آرائش جمال کی تسکین کے لیے وجود میں آتے ہیں
توقع	امید، آس
وارد	موجود
ترویج	رواج دینا، اشاعت کرنا
تصنیف و تالیف	کتابیں لکھنا، کتابیں مرتب کرنا

تلقین وہدایت	تعلیم وتربیت، نصیحت وہدایت
اقدار	قدر کی جمع، قدریں
سیف	تلوار
استحکام	مضبوطی، پختگی
جگت گرو	استاد، عالم
خطاطی	خوش نویسی، کتابت
سریرآرا	تخت نشین
بزمیہ	بزم سے متعلق
رزمیہ	رزم سے متعلق
معرکتہ الارا	زبردست، زورآور
مطلق العنان	بے لگام، خودمختار
مسلم	تسلیم کیا گیا
ریختی	شاعری کی وہ صنف جس میں شاعر خود کو عورت تصور کرتے ہوئے عورتوں کے جذبات کی ترجمانی انہیں کی زبان میں کرتا ہے
معمار	تعمیر کار، عمارت بنانے والا
طبع زاد	اپنی ایجاد، طبیعت سے نکلا ہوا
یورش	حملہ
ضخیم	موٹا، بڑے حجم والا
شاہکار	بہترین کام، سب سے بڑا کارنامہ
بےکم وکاست	بالکل درست، ٹھیک ٹھیک

7.9 سفارش کردہ کتابیں

1۔	تاریخ ادب اردو (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی
2۔	تاریخ ادب اردو (۱۷۰۰ء تک) پہلی چار جلد	پروفیسر سیدہ جعفر و پروفیسر گیان چند
3۔	دکن میں اردو	نصیرالدین ہاشمی
4۔	اردو زبان کی تاریخ	مرتبہ ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ
5۔	قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ (اٹھارہویں صدی تک)	پروفیسر محمد حسن

اکائی 8 اردو ادب کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ

اکائی کے اجزا

8.0 مقصد

8.1 تمہید

8.2 تصوف کی تعریف وتشریح اور صوفیا کی خصوصیات

8.3 اردو ادب کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ

8.4 تیرہویں صدی کا مذہبی سرمایہ

8.4.1 خواجہ معین الدین چشتی

8.4.2 شیخ فریدالدین مسعود شکر گنج یا گنج شکر

8.4.3 شیخ حمیدالدین ناگوری

8.5 چودہویں صدی کا مذہبی سرمایہ

8.5.1 امیر خسرو

8.5.2 شیخ عین الدین گنج العلم

8.5.3 شیخ شرف الدین یحییٰ منیری

8.6 پندرہویں صدی کا مذہبی سرمایہ

8.6.1 حضرت سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز

8.6.2 میراں جی شمس العشاق

8.7 سولہویں صدی کا مذہبی سرمایہ

8.7.1 شیخ بہاء الدین باجن

8.7.2 شاہ علی محمد جیو گام دھنی

8.7.3 برہان الدین جانم

8.8 سترہویں صدی کا مذہبی سرمایہ

8.8.1 خوب محمد چشتی
8.8.2 میراں جی خدانما
8.8.3 شاہ امین الدین علی اعلیٰ
8.9 خلاصہ
8.10 نمونۂ امتحانی سوالات
8.11 فرہنگ
8.12 سفارش کردہ کتابیں

8.0 مقصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو اردو ادب کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کی خدمات سے واقف کروانا ہے۔اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

- ☆ علم تصوف پر روشنی ڈال سکیں۔
- ☆ صوفیا کی خصوصیات پر اظہار خیال کر سکیں
- ☆ صوفیا کے کام اور اردو ادب کی نشو ونما میں صوفیا کرام کی خدمات کا جائزہ لے سکیں۔
- ☆ تیرہویں صدی تا سترہویں صدی عیسوی کے چند نمائندہ صوفیائے کرام اور ان کی شعری ونثری کارناموں کا جائزہ لے سکیں۔

8.1 تمہید

پچھلی اکائیوں میں آپ نے شمالی اور جنوبی ہند میں اردو ادب کے سماجی اور تہذیبی پس منظر کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔اب اس اکائی میں اردو ادب کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کی خدمات کا جائزہ لیا جائے گا۔ابتدا میں علم تصوف کی بنیادی باتیں اور صوفیائے کرام کی خصوصیات بیان کی جائیں گی تا کہ ہم ان کی خدمات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

8.2 تصوف کی تعریف وتشریح اور صوفیا کی خصوصیات

شریعت کے احکام کو انتہائی خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ بجالانے اور اطاعت میں خدا کی محبت اور اس کے خوف کی روح بھر دینے ہی کا نام تصوف ہے۔اس کا موضوع تزکیۂ نفس وتصفیۂ قلب (صفائی)' اخلاق وتعمیر ظاہر و باطن ہے۔اس کی غایت ومقصد سعادت ابدی کا حاصل کرنا ہے۔

تصوف کی ساری بنیاد اسی پر ہے کہ آداب شریعت کی پابندی رہے' حرام اور مشتبہ چیزوں سے دست کشی کی جائے' نا جائز اوہام اور خیالات سے حواس کو آلودہ نہ کیا جائے اور غفلتوں سے بچ کر اللہ تعالیٰ کی یاد میں وقت گزارا جائے۔

تصوف کے تمام سلسلے اور تمام شاخیں حق تعالیٰ سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو جاتے ہیں۔صوفیا کے یہاں دوئی کی گنجائش نہیں ہے۔صوفیائے کرام کے نظریے دو شاخوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔(1) وحدت الوجود (2) وحدت الشہود۔

وحدت الوجود کی تعریف صوفیا نے یہ کی ہے کہ سالک تمام موجودات کو ایک وجود حق خیال کرے۔ماسوا کا شعور اس کی نظر سے ساقط ہو جاتا

ہے۔وحدت الوجود کے فلسفہ کو ''ہمہ اوست'' بھی کہا جاتا ہے۔وحدت الشہود یہ ہے کہ تمام موجودات کے آئینوں میں جلوۂ حق کا مشاہدہ کرے۔وحدت الشہود کے فلسفے کو ''ہمہ ازاوست'' بھی کہا جاتا ہے۔بظاہر دونوں دبستان خیال کے درمیان اختلاف ہے لیکن اصل میں دونوں کی تان اسی عقیدے پر ٹوٹتی ہے کہ حقیقی وجود صرف ایک ہے اور بس۔

تصوف کے مختلف سلسلے پیدا ہوئے۔چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ، نقشبندیہ، شطاریہ، مجددیہ، مداریہ، قلندریہ وغیرہ۔ہندوستان میں چشتی سلسلہ کے بانی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کو مانا جاتا ہے۔قادری سلسلہ کے بانی حضرت عبدالقادر جیلانی تھے۔سہروردی سلسلہ کی ابتداء ضیاالدین نجیب سہروردیؒ نے کی۔نقشبندی سلسلہ خواجہ بہاءالدین نقشبندی کے نام سے منسوب ہے۔شطاری سلسلہ حضرت شاہ عبداللہؒ نے شروع کیا۔

صوفی لفظ ''صوف'' سے بنا ہے جس کے معنی موٹا اون ہیں۔لباس صوف پہننے والے کو صوفی کہا گیا۔صوفی ظاہری اعمال کے ساتھ باطنی حسن واخلاق پر بھی نظر رکھتا ہے۔وہ زندگی کی اصل غرض داخلی اور روحانی اصلاح کو قرار دیتا ہے۔وہ خشیت الٰہی (اللہ کا خوف) سے لرزاں اور محبت الٰہی سے سرشار ہوتا ہے۔اس کی زندگی صاف، سادہ اور بے داغ ہوتی ہے۔اس میں دکھاوا بالکل نہیں ہوتا۔وہ سختیاں سہنے کا عادی ہوتا ہے۔اس کا مطمح نظر دنیا نہیں ہوتی۔اس میں خدا کا عشق اور خدا کے بندوں کی محبت پائی جاتی ہے۔ایک سچا صوفی معیاری مسلمان ہوتا ہے۔صوفیا دین سے غفلت برتنے والے لوگوں کو مذہب کی باطنی قدروں کی طرف راغب کرتے ہیں۔ان کے تزکیۂ قلب اور پاکیزگیِ روح کا سامان کرتے ہیں۔عیش طلبی کو خیر باد کہتے اور سادہ زندگی کی طرف خلقت خدا کو مائل کرتے ہیں۔حقیقی مسلم صوفیوں نے کبھی بھی ترک دنیا کا وعظ نہیں دیا کیوں کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔صوفی وہ ہوتا ہے جس کا قلب صفا (صفائی) سے لبریز اور کدر (گندگی) سے خالی ہو۔صوفیا اپنے اپنے طور پر ضرورت اور حالات کے لحاظ سے تربیت اخلاق اور تزکیۂ روح کے مناسب نفسیاتی طریقے مقرر کرتے رہتے۔عبادت وریاضت اور ورد وظائف کی تعلیم اسی غرض سے دیا کرتے۔انہوں نے تربیت روح کے لیے مختلف منازل اور مقامات متعین کیے جیسے عالم حیرت، عالم جذب، عالم فنا، عالم بقا، فنافی الشیخ، فنافی الرسول، فنافی اللہ، باقی باللہ۔

صوفیوں کا اصول دلوں کو فتح کرنا ہے۔یہی وجہ ہے کہ علما، امرا، حکومتوں اور بادشاہوں سے وہ کام نہیں ہوسکتا جو فقیر درویشوں سے ہوسکتا ہے۔بادشاہ کا دربار خاص ہوتا ہے لیکن صوفی، فقیر کا دربار عام ہوتا ہے۔ان کا آستانہ نہ صرف خواص کہ لیے بلکہ عوام کے لیے بھی یکساں کھلا رہتا ہے۔یہ دربار خانقاہ کے نام سے موسوم ہوا۔یہاں بڑے، چھوٹے، امیر، غریب، عالم، جاہل کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔صوفیا کی حکمرانی بلاتخصیص مذہب وملت اور خواص و عوام سب کے دلوں پر ہوتی ہے۔غم زدہ اور ٹوٹے ہوئے دلوں پر مرہم رکھنا ان کا فرض اور بے سہاروں کو سہارا دینا ان کا شیوہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کا گہرا تعلق عوام سے ہوتا ہے۔صوفی حضرات انسانوں کی تقسیم مذہب کی بنیاد پر نہیں کرتے۔ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب کو وہ ایک دوسرے کا ہم سفر سمجھتے، محبت، دل جوئی سے کام لے کر منزل مقصود کو پیش نظر رکھتے۔صوفی حضرات دنیا کے عیش وآرام کی زندگی کو اصل مقصد قرار نہیں دیتے۔خدا اور بندوں کی محبت کی تعلیم اور بندوں کے درمیان صلح وآشتی کا پیغام دینے کے لیے صوفیائے کرام دور دراز ملکوں سے سمندروں کو چیرتے ہوئے، پہاڑوں کو روندتے ہوئے، پرخار جھاڑیوں اور خطرناک جنگلوں سے الجھتے اور گزرتے ہوئے پرخطر گھاٹیوں اور دشوار گزار راستوں کو طے کرتے ہوئے دنیا کی وسیع سرزمین پر پھیل گئے۔کسی نے پہاڑوں کے غار میں پناہ لی تو کسی نے جنگلوں میں بسیرا ڈالا تو کوئی دریا کے کنارے زمین پر جھونپڑا بنا کر آباد ہوا۔انہوں نے یہ تمام سختیاں اور تکلیفیں برداشت کیں اور انسانیت کا درس، خلوص ومحبت کی تعلیم اور ایثار وقربانی کا سبق دیا۔انہوں نے محبت و بھائی چارگی کا ایسا سبق عوام کو پڑھایا اور اپنے اخلاق و محبت سے ایسا اثر ڈالا کہ عوام ان کے گرویدہ ہوگئے۔لوگ عقیدت کے ساتھ جوق در جوق ان کی خانقاہوں میں آنے لگے۔ان کا پیغام اور بے لوث محبت واخلاق لوگوں کے دلوں کو متاثر کرتے رہے۔صوفیا کی خدمات اور تعلیمات ایسی تھیں کہ سینکڑوں برس گزرنے کے باوجود لاکھوں انسان، بادشاہ، حکمران صبح و شام ان کے آستانوں پر حاضر رہتے ہیں۔یہ صوفیا اپنی زندگی میں بھی مقبول تھے۔ان کی تعلیم وتربیت کے انداز سے لوگوں کو الفت ہوتی اور وہ سعادت

حاصل کرنے کے لیے شوق سے زیارت کرتے ۔صوفیا نے عام لوگوں سے اپنا رابطہ قائم رکھا۔شمالی اور جنوبی ہندوستان میں سماجی اور لسانی رکاوٹیں تھیں، وہ دور ہوگئیں اور یہ دونوں حصے ایک دوسرے سے قریب تر ہوئے ۔مختلف مذہبوں، ذاتوں اور تہذیبوں میں آپسی میل جول بڑھا۔ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کی گئی۔نفرت اور تعصب دور ہوا۔صوفیائے کرام نے اپنے آپ کو عوام سے قریب رکھا اور ان کی خوشی اور غم میں برابر شریک رہے۔

صوفیائے کرام کی خانقاہیں مختلف مذاہب اور مختلف زبان بولنے والوں کی آماجگاہ بن گئیں۔اس طرح مختلف تہذیبوں اور زبانوں کا آپسی لین دین ہوا۔ان کی خانقاہیں بنی نوع انسان کی ہم آہنگی کا ذریعہ بنیں۔لوگ ایک دوسرے کے قریب آئے۔ذات پات اور رنگ ونسل سے ہٹ کر صوفیا نے بنی نوع انسان کے لیے عزت و وقار چاہا۔عوام سے ہمدردی اور خدمت خلق کی وجہ سے حضرات صوفیا کا سماج میں ایک اہم مقام تھا۔صوفیا عوام میں اخلاقی اور باطنی روح پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔انہوں نے سلاطین کو اللہ کی مخلوق کی بلا تفریق مذہب وملت، حاجت براری اور عدل پروری پر زیادہ سے زیادہ زور دیا۔اچھا سماج اور اچھی معاشرت صلحا وصوفیا کی کوششوں سے بنتی رہی۔لوگ پروانہ وار ان کے گرد جمع ہوتے اور وہ لوگوں کے اخلاق وسیرت کو اپنے اعلیٰ کردار کے عملی نمونوں سے سنوارنے کی کوشش کرتے۔

صوفیائے کرام ہندوستانی سماج میں یکجہتی، میل جول، اور خیر سگالی چاہتے تھے۔وہ لوگ جھگڑے، عناد، تعصب، نفرت اور حسد سے پاک صاف ایک صحت مند سماج کے قیام کی کوشش کرنا اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔تمام صوفیائے کرام کا طرزِ فکر یہی تھا کہ سب انسان بنیادی طور سے ایک ہیں۔انہوں نے تمام لوگوں کے لیے خوشگوار سماجی ماحول پیدا کیا۔صوفیا چاہتے تھے کہ عوام میں اخلاقی قدریں بڑھیں اور سماجی و اخلاقی اعتبار سے ایسا صحت مند ماحول پیدا ہو جو کہ بنی نوع انسان کی خوشی ومسرت کا سبب بنے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ علم تصوف پر ایک جامع نوٹ لکھیے۔

2۔ صوفیا کی خصوصیات بیان کیجیے۔

8.3 اردو ادب کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ

اردو زبان وادب کی تخلیق ونشو ونما صوفیائے کرام کی مرہون منت ہے۔اردو زبان کی ترویج واشاعت میں ان کی خدمات مسلمہ ہیں۔انھیں اپنی بات پہنچانا تھا۔وہ ایسی زبان میں اپنی تعلیمات پیش کرنا چاہتے تھے جسے عوام سمجھ سکیں۔انہوں نے اپنی تعلیمات کو نظم ونثر میں پیش کیا۔صوفیائے کرام کے فقرے اردو کے نقوش اولین اور ابتدائی نمونے ہیں۔یہ فقرے اردو زبان کے ارتقا میں معاون ثابت ہوئے۔صوفیائے کرام عوام سے ان کے اپنے روزمرہ میں گفتگو کرتے تھے۔وہ مقامی بولیوں کو استعمال کرتے۔ ہندوستانی مقامی زبانوں اور بولیوں کو بادشاہوں کے دربار میں اتنی سرپرستی اور حوصلہ افزائی نہیں ملی جتنی بزرگوں کی خانقاہوں سے حاصل ہوئی۔امرا اور بادشاہوں کو عوام سے میل جول کی وہ ضرورت نہیں تھی جو ان بزرگوں کو تھی اور ادنیٰ ترین سطح کے عوام سے سیدھے اور حقیقی رابطے کا ہی یہ ثمرہ تھا کہ زبان کا وہ عوامی کینڈا تیار ہو گیا جس پر آئندہ زمانے میں اردو زبان اور روزمرہ کی عمارت استوار ہوئی۔صوفی شعرا کو سادہ اور عام فہم زبان میں اپنی بات عوام تک پیش کرنا مقصود تھا۔چنانچہ ان کی شاعری میں الفاظ کو ضرورت شعری کے مطابق موڑ توڑ لیا جاتا تھا۔کہیں کسی حرف کو گرا کر پڑھنے سے وزن کا سرا مل جاتا اور کہیں سکتے کو دور کرنے کے لیے آواز کو کھینچ کر پڑھنا پڑتا ہے۔جیسے سر کو سیر اور فکر کو فکیر کہہ کر کام نکال لیتے۔قافیوں کے بھی کوئی خاص اصول کی پابندی ان کے ہاں اکثر مفقود ہے۔قافیے میں صرف آواز کا خیال رکھتے۔لفظ جیسا بولا جاتا ویسا ہی تحریر میں لے آتے جیسے شروع کو شرو اور صحیح کو سہی لکھ دیتے۔

یہ صوفیائے کرام ہی ہیں جنھوں نے اپنی محنت اور صلاحیت سے زبان کے دریا کو بیان کے راستے پر ڈالا۔اگر یہ لوگ اس دور میں اپنی

صلاحیتوں کا خون اس زبان میں شامل نہ کرتے اور اس میں زبان و بیان کے نئے نئے تجربے نہ کرتے تو اس زبان کا دریا بھی راستے ہی میں خشک ہو جاتا۔ نویں صدی ہجری تک اس زبان کی جڑیں دکن، گجرات اور مالوہ میں اتنی پیوست ہو جاتی ہیں کہ یہ نہ صرف ایک مشترک زبان کی حیثیت اختیار کر لیتی بلکہ اس میں ایسی تصانیف کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے جن کا خطاب عوام سے تھا۔ جو کام پہلے فارسی سے لیا جاتا تھا وہ اردو سے لیا جانے لگا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنی صلاحیتوں کو اردو زبان کے مزاج و خون میں شامل کر کے اسے آگے بڑھایا ہے۔ طویل نظمیں لکھنا اور وہ بھی ایسے دور میں جب خود زبان، بیان کی سطح پر گھٹنیوں چل رہی تھی، کوئی آسان کام نہ تھا۔ ان لوگوں نے زبان کو مختلف موضوعات سے آشنا کر کے اسے جلد ہی کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اردو شاعری میں ابتدا سے ہی تصوف کے خیالات و افکار داخل ہوئے۔ صوفیانہ شاعری کے موضوعات میں یہ چیزیں شامل ہیں۔ معرفت نفس، معرفت ذات، زندگی کی حقیقت، بے ثباتی عالم، عشق مجازی، عشق حقیقی، وحدت الوجود، وحدت الشہود، سلوک و معرفت کے مختلف مسائل، اسرار دل و نفس، حمد، نعت، مدح صحابہ، منقبت، حشر نشر، میزان، پل صراط، جزا و سزا، عالم نزاع، احوال قبر، علامات قیامت، سوال طالب، جواب مرشد، شریعت و طریقت کے مسائل، تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب وغیرہ۔ تصوف کے فلسفیانہ بنیادوں کو سمجھے بغیر اردو شاعری کی اصطلاحوں کو نہیں سمجھا جا سکتا اور خانقاہوں کے سماجی رابطے اور عوام پر ان کے اثر کو سمجھے بغیر ہماری شاعری کے سماجی مفہوم تک رسائی ممکن نہیں۔ تصوف نے اردو شاعری کا ذہنی پس منظر بنانے میں کافی اہم حصہ لیا۔ صوفیائے کرام نے رشد و ہدایت کے لیے تصوف کے رموز و اسرار کی وضاحت کو اردو زبان میں زیادہ موزوں اور مناسب سمجھا اور اسی پر اپنی تصنیف و تالیف کی عمارت کھڑی کی۔ وہ تمام علامتیں جو صوفیا نے معرفت کی منازل و مراحل کے اظہار کے لیے وضع کی تھیں، اردو غزل میں صوفی شعرا و غیر صوفی شعرا سبھی استعمال کرنے لگے۔ یہ لفظیات، استعارے اور علامتیں غزل کا لازمی جزو بن گئے جیسے شراب، ساقی، ساغر وغیرہ۔ صوفیا کا عوام سے براہ راست تعلق تھا اس لیے وہ اسی زبان کو ابلاغ کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ یہ زبان اس وقت عوام میں رائج تھی لیکن فارسی کی قدر و منزلت اور مرتبے تک نہیں پہنچ سکی تھی اور تصنیف و تالیف میں فارسی ہی مروج تھی۔ دکن کے صوفیا نے بار بار یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ ''ہندی زبان'' میں کوئی ''عیب'' نہیں اور اسے بھی وسیلۂ اظہار بنایا جا سکتا ہے۔

دکن کے صوفیائے کرام نے تصوف کے رموز کو عام فہم انداز میں پیش کرنے کے لیے گیت کے انداز میں سہیلے کہے تھے۔ ان میں عارفانہ مطالب کو بڑی آسانی کے ساتھ سلیس زبان میں پیش کیا گیا تھا۔ اس عہد میں عروضی اصولوں کی بھی سختی سے پابندی ممکن نہ تھی۔ اس لیے ردیف و قوافی میں حسب ضرورت تغیر و تبدل کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ اکثر ردیفوں میں ''س'' اور ''ص''، ''ط'' اور ''ت''، ''ع'' اور ''ا''، ''ک'' اور ''ق'' کو ایک ہی صوتیے Phoneme کے طور پر برتا گیا ہے۔ ضرورت شعری کے لحاظ سے ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن بنا دیا گیا ہے اور اسی طرح سادہ الفاظ کو مشدد اور مشدد کو سادہ میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ادب کے اس ابتدائی دور میں نثر اور شعر کے اعلیٰ ترین نمونوں کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ یہ ادبی زبان کا عہد طفولیت تھا اس لیے اس میں منجھی ہوئی زبان اور نکھرے ہوئے اسلوب کی مثالیں نہیں ملتیں۔ رچاؤ اور پختگی تشکیلی دورِ آغاز سے نہیں، زبان و ادب کے عہد بلوغیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اردو ہی نہیں ہر زبان میں ادبیت کا چٹخارہ اور صوری محاسن، تشکیلی دور کی نہیں، دور ترقی کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف و شاعر کے ذہن میں خیالات کا ہجوم ہے لیکن زبان یاوری نہیں کر رہی ہے اور اظہار کے راستے مسدود ہیں۔ جملوں میں الفاظ کی وہ ترتیب ہیں جو قواعد کی رو سے ہونی چاہیے۔ صوفیا کا مقصد تو اپنی بات اور اپنا پیغام عوام و خواص سب تک پہنچانا تھا۔ فارسی اور دکنی نثر کا امتزاج اس زمانے کی تصانیف کی ایک عام خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ کہیں پورا جملہ فارسی میں ہے تو کہیں دکنی کے ساتھ ابتدا یا آخر میں فارسی الفاظ سے خیال کی ترسیل میں مدد لی گئی۔

بہمنی دور میں اردو چاروں طرف پھیل کر دکن کی سب سے بڑی اور واحد مشترک زبان بن جاتی ہے اور اس عظیم سلطنت کے مختلف علاقوں میں ایک ایسا سازگار ماحول پیدا ہو جاتا ہے کہ آئندہ دور میں ادبی تخلیق کے لیے راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ سوال اور جواب کی ہیئت میں نظمیں صوفیائے کرام کے ہاں ایک عام اور مقبول ہیئت رہی ہے۔ سوال و جواب میں شریعت و طریقت کے بہت سے مسائل آ گئے ہیں۔

صوفیائے کرام نے اردو ادب کی نشو ونما میں گراں قدر خدمات انجام دیں' اس کے فروغ کی کوشش میں عملی طور پر شرکت کی۔اپنی تعلیمات کو اپنی تصانیف (نثر ونظم) میں پیش کیا' مقبول دھنوں اور طرزوں میں شاعری کی۔چکی نامے اور شکارنامے تصنیف کیے۔مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی جیسے دوہے' سہیلے (جو محفل سماع میں گائے جاتے تھے)' جکریاں (ذکری کی گجراتی شکل جسے گایا بھی جا سکتا اور سازوں پر بجایا بھی جا سکتا تھا)' غزلیات' مثنویاں' نظمیں' قصیدے' مرثیے وغیرہ۔اس طرح صوفیائے کرام نے اپنی تعلیمات اور بنیادی تصورات کو ادبی تصانیف کے ذریعے مقبولیت بخشی اور انھیں ادبی رنگ روپ دے دیا۔

صوفیائے کرام نے اس زبان کو تصوف کی تعلیم کے لیے استعمال کیا۔نثری رسالے لکھے گئے۔قوالی' موسیقی' شاعری اور درس اخلاق کی یہی زبان ٹھیری۔صوفیا نے اسے ادبی سطح پر لانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔اس دور میں جب کہ اردو ابھی نومولود زبان تھی اور اہل علم اس میں لکھنا باعث عار سمجھتے تھے' صوفیائے کرام نے اپنے مریدوں اور معتقدوں کی تعلیم' تربیت اور تلقین کے لیے اسی زبان میں شعری اور نثری تخلیقات پیش کیں۔ان تخلیقات میں معرفت وسلوک' مذہب' علم وحکمت جیسے موضوعات شامل تھے۔اپنے پیغام کے لیے انہوں نے شاعری کا سہارا لیا۔چنانچہ اردو زبان میں شاعری کے قدیم نمونوں میں تصوف کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔صوفیانہ ادب نے زبان کی نشو ونما اور ترویج میں زبردست رول ادا کیا۔صوفیا ملک کے مختلف حصوں میں جاتے اور وہیں کے ہو رہتے۔انھیں مقامی لوگوں سے بات چیت کرنی پڑتی' اپنا پیغام پیش کرنا ہوتا۔انہوں نے بول چال اور اپنی تخلیقات کے لیے عوام کی زبان یعنی اردو زبان کو استعمال کیا۔یہ مختلف زبانوں اور بولیوں کے علاقوں کے درمیان رابطے کی زبان بنتی جارہی تھی۔یہ جہاں بھی جاتی وہاں کے مقامی اثرات قبول کرتی اور اپنے الفاظ کے ذخیرے کو مقامی بولیوں سے اکتساب کر کے مالا مال کرتی جاتی۔قومی یکجہتی کو استوار کرنے میں یہ ایک بڑا قدم تھا۔صوفیائے کرام ہندی' فارسی' عربی اور ہندوستان کی دوسری مقامی بولیوں سے الفاظ لینے میں قطعاً نہیں جھجکتے تھے۔حمد ونعت میں بھی عربی کے خاص الفاظ کے ساتھ سنسکرت کے مذہبی الفاظ بے ساختہ برتے جاتے۔وہ اپنی شاعری میں ہندو دیومالا کی تلمیحات اور استعارے بھی استعمال کرتے۔صوفی ادیبوں نے زبان کو کئی اصطلاحیں اور علامتیں بھی دیں مثلاً وہ بت کدہ' بت خانہ' شراب خانہ' خرابات کہتے تو اس سے عارف کامل کا باطن مراد لیتے۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اردو زبان وادب کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام نے بنیادی کام انجام دیا اور بجا طور پر مولوی عبدالحق نے انھیں اردو کا محسن قرار دیا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ اردو ادب کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

8.4 تیرہویں صدی کا مذہبی سرمایہ

8.4.1 حضرت معین الدین چشتی سنجری اجمیری

ہندوستان میں چشتیہ سلسلے کے صوفیا نے عوام سے اپنا رشتہ زیادہ گہرا کیا۔چشتی خانقاہیں شہروں سے نکل کر دیہات اور قصبات میں پھیل گئیں۔اس طرح چشتی صوفیا کو ہر سطح کے عوام کی زبان' کلچر' بولی سے قریب آنے کا موقع ملا۔خواجہ معین الدین چشتی اور ان کے خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے منسوب کوئی ہندوی کا فقرہ نہیں ملتا۔خواجہ اجمیری کے دوسرے خلیفہ حضرت حمیدالدین ناگوری کے ملفوظات میں متعدد ہندوی الفاظ اور فقرے ملتے ہیں۔

حضرت گیسو دراز سے پہلے چشتی صوفیا نے کتابیں تو زیادہ تصنیف نہیں کیں لیکن انہوں نے مقامی زبانوں کی اہمیت اور اثر ونفوذ کو خوب سمجھ لیا تھا

اورعوام کوان ہی کے محاورے میں تصوف کے رموز وحقائق کی تعلیم دیتے تھے۔چشتی صوفیا نے اپنے خلفا کو دوردوراز علاقوں میں بھیج کر رشد و ہدایت کا فیضان عام کردیا تھا۔

حضرت خواجہ معین الدین حسن چشتی سنجری کے والد کا نام خواجہ غیاث الدین اور والدہ ماجدہ کا نام بی بی ام الورع الموسوم بی بی ماہ نور وبی بی خاص الملکہ ہے۔آپ اصفہان میں پیدا ہوے اور پرورش اصفہان کے محلّہ سنجر میں ہوئی۔آپ کے والدین پیار میں آپ کو حسن کہہ کر پکارتے تھے۔بچپن میں بھی آپ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیل کود میں شریک نہیں ہوتے تھے۔نو سال کی عمر میں آپ نے قران شریف حفظ کیا۔ بعدازاں مکتب میں آپ نے تفسیر، حدیث، فقہ کی تعلیم پائی۔ابھی آپ کی عمر 15 سال بھی نہ ہوئی تھی کہ آپ سایۂ پدری سے محروم ہوگئے۔والد کے ترکہ میں خواجہ غریب نواز کے حصہ میں ایک باغ اور ایک پن چکی آئی۔اسی کی آمدنی سے خواجہ غریب نواز اپنی گزر فرماتے تھے۔خواجہ غریب نواز کو شروع ہی سے فقیروں، صوفیوں اور درویشوں کی صحبت کا بہت شوق تھا۔آپ اولیاء اللہ کی صحبت سے بہت مسرور ہوتے تھے۔آپ ان کی بہت عزت وتعظیم کرتے۔اس زمانے میں سمرقند اور بخارا اسلامی علوم وفنون کے مرکز تھے۔آپ وہاں 1150ء تا1155ء علوم ظاہری کی تکمیل میں مشغول رہے۔ بغداد سے آپ 1156ء میں سفر حرمین شریف پر روانہ ہوئے۔پھر آپ ہارون پہنچے اور وہاں آپ نے خواجہ عثمانؒ سے بیعت کی اور ڈھائی سال ان کی خدمت میں رہے۔خواجہ غریب نواز کی پہلی شادی بی بی اَمنَہ اللہ سے ہوئی۔آپ کے بطن سے خواجہ فخر الدین، خواجہ حسام الدین اور بی بی حافظ جمال پیدا ہوئیں۔دوسری شادی بی بی عصمت اللہ سے ہوئی۔آپ کے بطن سے شیخ ابوسعید پیدا ہوئے۔

حضرت خواجہ غریب نواز ریاضت، مجاہدہ، عبادت میں وقت گزارتے۔آپ تحمل و بردباری سے کام لیتے۔غریبوں اور محتاجوں کی مدد فرماتے۔ مظلوموں کو ظالم کے پھندے سے نکالتے۔زیردستوں کو زبردستوں کے چنگل سے رہائی دلاتے۔فارسی میں آپ کی تصانیف انیس الارواح، کشف الاسرار، گنج الاسرار ہیں۔آپ پرتھوی راج کے دور حکومت میں ہندوستان تشرف لائے اور اجمیر شریف کو اپنا مسکن بنایا۔حضرت خواجہ غریب نواز نے بتایا کہ نماز دین کا رکن ہے اور رکن ستون ہوتا ہے۔آپ نے یہ بھی بتایا کہ اول راہ شریعت، دوم راہ طریقت، سوم راہ معرفت اور چہارم راہ حقیقت ہے۔

خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے اکابر خلفا میں خواجہ بختیار کاکی کی روحانی راجدھانی دہلی تھی اور حضرت حمید الدین ناگوری نے (راجستھان) میں قیام کیا۔دیگر خلفا مثلاً شیخ وجہہ الدین، خواجہ برہان الدین، شیخ صدرالدین نے مختلف مقامات پر جا کر عوامی اخلاق وسیرت کو سنوارا۔حضرت نصیرالدین نے دہلی میں رہ کر روحانیت کا چراغ روشن کیا۔جس کی روشنی اودھ، ہریانہ اور پنجاب تک پہنچی۔شیخ حسام الدین نے گجرات وسندھ میں اور خواجہ اخی سراج الدین نے بنگال بہار اور آسام میں روحانیت کا درس دیا۔حضرت نظام الدین نے اپنے دو مریدین خواجہ عزیز الدین اور شیخ زادہ کمال الدین کو دیوگیری اور مالوہ جانے کا حکم دیا۔برہان الدین غریب کو دکن اور مہاراشٹرا کے لیے منتخب کیا گیا۔

حضرت خواجہ غریب نواز موت کو عزیز رکھتے تھے۔6 رجب 627ھ مطابق 21 مئی 1229ء دوشنبہ کو آپ کا وصال ہوا۔

8.4.2 شیخ فریدالدین مسعود شکر گنج یا گنج شکر (664ھ۔569ھ مطابق 1265ء۔1173ء)

شیخ فریدالدین شکر گنج پنجاب میں ملتان کے قصبے کوٹھوال یا کتھی وال میں پیدا ہوئے۔دہلی جا کر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مرید ہوئے۔ وہاں سے آکر پنجاب کے قصبے اجودھن میں بس گئے۔بعد میں اس قصبے کا نام پاک پٹن ہوگیا۔وہیں 664 ہجری مطابق 1265ء میں انتقال کیا۔ان کے اشعار واقوال مشہور ہیں۔ان کی زبان سے اردو کا ایک جملہ ''آنکھ آئی ہے'' استعمال ہوا ہے۔ان سے منسوب دو اشعار یہ ہیں:

وقت سحر وقت مناجات ہے خیز درآں وقت کے برکات ہے
عشق کا رموز نیارا ہے جز مدد پیر کے نہ چارا ہے

8.4.3 شیخ حمیدالدین ناگوری (673ھ-590ھ مطابق 1274ء-1193ء)

شیخ حمیدالدین ناگوری، حضرت شیخ معین الدین چشتی کے مرید اور خلیفہ تھے۔آپ نے ناگور (اجمیر کے قریب) میں قیام کیا اور وہاں کی سرزمین کو اپنے روحانی جلوؤں سے معمور کیا۔آپ نے ساری زندگی تصوف کی ترویج کے لیے وقف کی۔اس سلسلہ میں آپ نے مشہور صوفی بزرگ حضرت بہاءالدین ذکریا جو سلسلۂ سہروردیہ کے بانیوں میں سے تھے اور ملتان میں قیام فرماتے تھے، خطوط کے ذریعے دہلی میں ملنے کا طے کیا اور دونوں حضرات دہلی میں ایک دوسرے سے ملے۔

شیخ حمیدالدین ناگوری نے حضرت بہاءالدین ذکریا سے مباحثہ کیا اور یہ ثابت کردیا کہ صوفی اور درویش کو دولت سے لگاؤ نہیں ہونا چاہیے۔شیخ ذکریا بہت دولت مند تھے لیکن شیخ حمیدالدین ناگوری نے دولت کو سانپ کی مانند بتایا۔حضرت دولت سے نفرت کرتے تھے۔سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور علم دوست تھے۔آپ کا قول تھا کہ شریعت اور طریقت کا تعلق ویسا ہی ہے جیسا جسم اور روح کا۔شیخ حمیدالدین ناگوری کی زندگی فقروافلاس میں گزری۔شیخ بہاءالدین باجن نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ شیخ حمیدالدین کے بیٹے فاقوں کی تاب نہ لاکر ان کے پاس گئے کہ کشائش رزق کے واسطے دعا کریں۔فاقوں کی نقاہت سے غش کھا کر گر پڑے۔شیخ حمیدالدین آنکھیں بند کیے یادِحق میں مشغول تھے۔ان کے گرنے کی آواز سن کر انھیں دیکھا۔ان کا مافی الضمیر سمجھ گئے اور کہا ''ہاں بابا کچھ کچھ'' (یعنی مستقبل میں کچھ کچھ ملتا دکھائی دیتا ہے۔)

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ حضرت معین الدین چشتی سنجری اجمیری کے سوانحی حالات اور تعلیمات پر روشنی ڈالیے۔

2۔ شیخ فریدالدین گنج شکر اور شیخ حمیدالدین ناگوری کے حالات زندگی، تعلیمات اور اردو کی نشوونما میں ان کی خدمات پر اظہار خیال کیجیے۔

8.5 چودھویں صدی کا مذہبی سرمایہ

8.5.1 امیر خسرو (725ھ-651ھ مطابق 1325ء-1252ء)

امیر خسرو، حضرت نظام الدین اولیا کے مرید تھے۔خسرو کا وطن قصبہ پٹیالی ضلع ایٹہ تھا۔یہ مقام آگرہ کمشنری میں ہے۔بعد میں خسرو کی عمر کا زیادہ حصہ دلی میں گزرا۔خسرو اس وقت کی ہندی زبان سے بخوبی واقف تھے۔ان کی فارسی تصانیف میں اردو کے کئی فقرے بلکہ جملے تک ملتے ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے فارسی نظم ونثر میں متعدد اردو الفاظ استعمال کیے۔امیر خسرو نے گیارہ بادشاہوں کا زمانے دیکھا اور سات بادشاہوں کی ملازمت میں رہے۔وہ فارسی کے باکمال شاعر تھے۔موسیقی کے ایسے استاد تھے کہ ان کی ایجادات واختراعات آج تک علم موسیقی کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔

خسرو کے فارسی کلام میں کھڑی بولی کے الفاظ اور فقرے آگئے ہیں حالاں کہ خسرو اردو اور فارسی کو ملانا مستحسن نہیں سمجھتے تھے۔خزائن الفتوح میں وہ ہندی فقرہ استعمال کرتے ہیں۔

''واز دروں ہندواں مار مار فریادی کردند''

مثنوی تغلق نامہ میں انہوں نے کئی جگہ کھڑی بولی کا استعمال کیا ہے۔مثلاً

ع سخن شاں مار مار و سر بسر مار

ع بہ راوی گفت ہے ہے تیر مارا

غرۃ الکمال کے دیباچے کا ایک شعر ملاحظہ ہو

آری آری ہمہ بیاری آری ماری ماری برہ کہ ماری آری

خسرو نے منظوم فارسی لغت خالق باری لکھی۔لیکن موجودہ نسخے کی ناقص فنی ہیئت' لسانی اغلاط اور ادبی کم مائیگی کے پیش نظر موجود ہیئت کو خسرو سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔اس کا بنیادی ڈھانچا خسرو نے نظم کیا جس میں کثرت سے الحاق' ترمیم وتحریف ہوئی ہے۔

8.5.2 شیخ عین الدین گنج العلمؒ (795ھ 706ھ)

شیخ عین الدین گنج العلمؒ حکومت علاء الدین خلجی کے زمانے میں بمقام دہلی میں پیدا ہوئے۔آغاز شباب میں تحصیل علم کے لیے گجرات کا سفر کیا۔گجرات میں قیام کے بعد وہ دولت آباد گئے۔اس وقت محمد تغلق دولت آباد کو پایۂ تخت بنا چکے تھے۔وہاں شیخ عین الدین گنج العلمؒ نے دہلی سے آئے ہوئے ایک بزرگ سید خوندمیر علاء الدین چشتی سے بیعت کی۔737ھ میں وہ عین آباد سا گر گئے اور 773ھ میں بیجاپور چلے گئے جہاں 27 جمادی الاول 795ھ (مطابق 1392ء) کو انتقال کیا۔شیخ عین الدین گنج العلمؒ نے دکنی میں چھوٹے چھوٹے 8 رسالے مسائل شرعیہ سے متعلق لکھے۔دکن میں اردو زبان کی یہ سب سے پہلی کتابیں ہیں لیکن یہ رسائل اب ناپید ہیں۔

8.5.3 شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (782ھ۔662ھ مطابق 1380ء۔)

بہار کا قصبہ منیر آپ کا وطن ہے۔شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہار سے حضرت نظام الدین اولیا سے بیعت ہونے کے ارادے سے روانہ ہوئے لیکن ان کے پہنچنے سے قبل حضرت نظام الدین اولیا کا انتقال ہو چکا تھا۔اس لیے وہ شیخ نجیب الدین فردوسی کے مرید ہو گئے۔

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری نے بہت سے منتر اور نسخے لکھے ہیں۔جن میں سے بعض کو کنج مندرہ کہا گیا ہے۔ان کے کنج مندرے' دوہے' فالنامے اور ملفوظات مشہور ہیں۔شیخ نے ایک موقع پر کہا۔دیس بھلا پر دور۔ایک اور موقع پر کہا'' باٹ بھلی پر سانہ کر''۔ فالنامے کے چند فقرے ملاحظہ ہوں۔(1) جو من کا منسا سوئی ہووے۔(2) من جن ڈولاؤ' کرم لاگی ہے بات۔(3) ناہیں ابھی ناہیں۔(4) ناہیں ہے گا اور کام کروہ۔(5) ابھی ناہیں ستاؤ جن اکتاؤ۔(6) دور مت جاؤ کام ہو ستاؤ۔(7) اب لک دن برے گئے اب سکھ ہوئے۔(8) ابھی ناہیں ہوئے گا۔(9) تورے دن کے اب سکھ سو جتا ناہیں۔

ان کے دوٗ دوہے ملاحظہ ہوں:

(1) کالا ہنسا نر ملا بسے سمندر تیر
پنکھ پسارے بک ہرے نرمل کرے سریر در در رہے نا پیر

(2) شرف حرف مائل کہیں درد کچھ نہ بسائے
گرد چھوئیں دربار کی درد دور ہو جائے

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ حضرت امیر خسروٗ شیخ عین الدین گنج العلم اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

8.6 پندرہویں صدی کا مذہبی سرمایہ

8.6.1 خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو درازؒ (825ھ۔720ھ یا 721ھ مطابق 1422ء۔1321ء)

بندہ نواز گیسو دراز کی ولادت دہلی میں ہوئی۔آپ کا اسم گرامی سید محمد اور کنیت ابوالفتح تھی۔اور القاب صدرالدین اور صادق۔نصیرالدین محمود چراغ دہلوی کی بارگاہ سے جو خواجہ بندہ نواز کے شیخ تھے'' گیسو دراز'' لقب عطا ہوا تھا۔خواجہ بندہ نواز سادات حسینی سے تھے۔ان کے جد اعلیٰ ابوالحسن جنیدی

ہرات سے دہلی چلے آئے تھے۔حضرت خواجہ بندہ نواز کے والد سید یوسف حسینی تھے جو شاہ راجو قتال کے نام سے مشہور تھے۔جب آٹھویں صدی ہجری کے آغاز میں سلطان محمد تغلق نے دیوگیری کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور اسے دولت آباد کے نام سے آباد کیا تو دہلی کے علما' عمائدین اور مشائخین کو بھی وہاں منتقل ہونے کا حکم دیا۔شاہ راجو اسی جماعت کے ہمراہ 17 محرم 719ھ کو دولت آباد تشریف لے گئے ۔اس وقت خواجہ بندہ نواز کی عمر چار سال تھی اور وہ اپنے والدین کے ساتھ دکن پہنچے تھے۔دولت آباد کے قیام کے زمانے میں سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز نے اپنے والد اور ان کی وفات کے بعد نانا سے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ابتدائی تعلیم خلد آباد میں ہوئی اور شیخ بابو نامی ایک بزرگ نے انہیں اپنے مکتب میں پڑھایا تھا اور حدیث و فقہ کے ابتدائی درس دیے تھے۔خواجہ بندہ نواز نے چھ سال کی عمر سے کبھی نماز قضا نہیں کی اور روزے کے پابند ہو گئے تھے۔سات برس کی عمر میں قران مجید حفظ کر لیا اور سولہ سال کی عمر میں علوم ظاہری کی تکمیل کر لی۔طلب صادق' ریاضت' فطری مناسبت اور نصیرالدین محمود چراغ دہلوی کی خاص توجہ کے باعث بہت جلد سلوک کی منزلیں طے کیں۔شیخ چراغ دہلوی کی اجازت سے آپ علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔چراغ دہلوی نے انھیں خلافت سے سرفراز کیا۔بندہ نواز نے بندگان خدا کی رہنمائی و ہدایت میں چوالیس برس گزار دیے اور تشنگان علم و معرفت کی پیاس بجھائی۔وہ چاشت کے بعد یا نماز ظہر ادا کرنے کے بعد تفسیر' حدیث اور سلوک کے موضوع پر درس دیا کرتے تھے۔

سید محمد حسینی بندہ نواز کی عمر جب چالیس سال سے تجاوز کر گئی تو والدہ کے اصرار پر آپ نے بی بی رضا خاتون سے نکاح کیا۔ان کے بطن سے دو صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔آپ کے فرزند سید حسین عرف سید محمد اکبر حسینی عالم بہتر اور برگزیدہ سالک تھے' دوسرے صاحبزادے سید یوسف عرف سید محمد اصغر حسینی بھی عالم و فاضل اور اپنے والد کے خلیفہ تھے۔وصیت کے مطابق والد کے انتقال کے بعد وہ سجادہ نشین ہوئے۔

سید محمد حسینی اجمیر' ناگور' احمد آباد' کاٹھیواڑ' گرناتھ پہاڑ' ٹھٹہ ' حیدرآباد' سندھ' بلوچستان' افغانستان' لاہور' پاک پٹن' ملتان' کشمیر' ہردوار اور لکھنو سے ہوتے ہوئے بالآخر دولت آباد پہنچے تھے۔اس وقت ان کی عمر نوے سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔سید محمد حسینی نے دولت آباد پہنچ کر اپنے والد شاہ راجو قتالؒ کے مزار کی زیارت کی۔جب وہ گلبرگہ تشریف لائے تو ان کی عمر نوے سال سے زیادہ تھی۔گلبرگہ کی جامع مسجد کے قریب اپنے کئی مریدوں کے ساتھ ایک خانقاہ میں فروکش ہوئے اور رشد و ہدایت تعلیم و تلقین میں مصروف رہے۔وہ ایک عالم متبحر ہی نہیں' ایک خدا رسیدہ بزرگ اور صاحب کشف و کرامات صوفی تھے۔وہ اپنے مخاطب کے مرتبے اور حیثیت کے مطابق اس کو مناسب ہدایت دیا کرتے تھے۔وہ اپنے مریدوں اور معتقدوں کو بندگان خدا کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کرتے۔سرکاری عہدیدار' بادشاہ اور امرا وغیرہ اگر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو انہیں عدل وانصاف کی ہدایت فرماتے اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر زور دیتے تھے۔بندہ نواز گیسو درازؒ سماع کو پسند کرتے۔وہ کلام اللہ کی بہت تلاوت کرتے۔انہوں نے سہیلا میں بھی طبع آزمائی کی جو محفل سماع میں گائے جاتے تھے۔بندہ نواز اس تصور کے حامل تھے کہ سماع سے گداز قلب' رقت اور سپردگی کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔ان کے چکی نامے اور غزل بھی متعارف کیے گئے ہیں۔خواجہ بندہ نواز نے اردو نثر میں کوئی رسالہ نہیں لکھا۔

8.6.2 میراں جی شمس العشاقؒ (994ھ۔902ھ یا 904ھ)

حضرت میراں جی شمس العشاقؒ کا نام امیر الدین' عرفیت میرا جی اور لقب شمس العشاق ہے۔آپ کے والد کا نام حاجی شریف دوام الدین تھا۔ میراں جی مکہ شریف میں پیدا ہوئے' بائیس سال کی عمر میں مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ گئے اور وہاں بارہ سال تین ماہ اور پانچ روز قیام کیا۔پھر ہندوستان آئے اور دکن کا رخ کیا۔حضرت شاہ کمال الدین بیابانی کے دست پر بیعت کی اور منازل سلوک طے کرنے کے بعد حضرت شاہ کمال الدین بیابانی نے آپ کو خلافت سے سرفراز کیا۔دو واسطوں سے آپ کا سلسلۂ خلافت حضرت گیسو درازؒ سے ملتا ہے۔اپنے پیرومرشد کے حکم سے بھنگار (احمد نگر) جا کر شادی کی۔آپ کے فرزند برہان الدین جانم اور پوتے امین الدین علی اعلیٰ تھے۔

میراں جی شمس العشاقؒ اپنے پیرومرشد کے کہنے کے مطابق بیجاپور چلے گئے اور تاحیات مخلوق خدا کو اپنے علم وفضل سے بہرہ ور کرتے رہے۔ آپ کا مزار بیجاپور ہی میں ہے۔میراں جی ولی کامل اور روشن ضمیر بزرگ تھے۔آپ نے ساری زندگی عبادت' ریاضت' رشدوہدایت' درس وتدریس میں گزاردی۔آپ عالم باعمل اورصوفی باصفا تھے۔

میراں جی شمس العشاقؒ سے کسی اردونثری رسالے کا انتساب ثابت نہیں ہوتا۔ان سے منسوب جتنے بھی نثری رسالے ہیں' ان میں سے ایک بھی رسالہ ایسانہیں ہے جس کے متعلق یقین کے ساتھ یہ کہا جاسکے کہ یہ میراں جی شمس العشاق ہی کی تصنیف ہے۔ان کی تصانیف میں چھ مثنویاں شامل ہیں:(1) شہادت التحقیق یا شہادت الحقیقت (2) خوش نامہ (3) خوش نغز (4) شہادت نامہ (5) مغزمرغوب (6) وصیت النور۔

مثنوی وصیت النور کو ڈاکٹر صبیحہ نسرین نے نیشنل میوزیم کراچی پاکستان میں موجود ایک ضخیم بیاض سے یکم اکتوبر 1987ء کو دریافت کیا اور 1988ء میں'' وصیت النور'' کے نام سے شائع کیا۔خوش نامہ میں ایک نوجوان اور نیک طینت لڑکی خوش یا خوشنودی کا ذکر کیا گیا ہے۔وہ عشق الٰہی سے سرشار ہے۔وہ میراں جی کی مرید تھی۔خوش نامہ کا وہ حصہ جہاں خوشی کے وقت آخراور اس کے انتقال کا حال نظم کیا گیا ہے' بہت زیادہ پراثر ہے۔یہاں میراں جی کا لب ولہجہ' جذباتی ہوگیا ہے۔اوران کا طرز ادا سوز وگداز میں ڈوبا ہوامحسوس ہوتا ہے۔میراں جی کی یہ نظم بہت سادہ ہے۔مثنوی شہادت التحقیق یا شہادت الحقیقت میں اخلاق وتصوف کے رموز وحقائق کا تذکرہ ہے۔اس مثنوی کی بحر چھوٹی لیکن رواں ہے۔

یہ سب عالم تیرا رزاق سبھوں کیرا
تجھ بن اور نہ کوئے نہ خالق دوجا ہوئے
نا دیکھت بورا لیکھو لے مغز چاک دیکھو
جے مغز میٹھا لاگے تو کیوں من اس تھے بھاگے
وہ مغز معنی لیو سب چھال جھاڑ دیو

شہادت الحقیقت مکالمے کے انداز میں لکھی گئی ہے۔اس میں سوال وجواب کے طرز میں تصوف کی عام باتیں بیان کی گئی ہیں۔

مثنوی خوش نغز میں بھی میراں جی نے متصوفانہ خیالات پیش کیے ہیں۔اس میں بھی خوشی یا خوشنودی کا کردار ابھرتا ہے۔وہ اپنے پیر طریقت میراں جی سے مختلف سوالات کرتی جاتی ہے اور میراں جی اس کا جواب دیتے جاتے ہیں۔

مثنوی'' مغزمرغوب'' میراں جی کی ایک مختصرسی نظم ہے اورصرف تئیس (23) اشعار پرمشتمل ہے

مغز مرغوب دھریا جانو اس نسخے کا نام
مرشد موکھوں سمجھے تو ہوئے کشف تمام

چہارشہادت میں میراں جی نے اپنے پیرومرشد شاہ کمال بیابانی کا ذکر کیا ہے۔مثنوی وصیت النور میں عرفان باریِ تعالیٰ' عرفان محمدی' عبادت کی اہمیت' انسانیت کی معراج' مرشد کی اہمیت جیسے موضوعات ملتے ہیں۔یہ مثنوی بھی سوال وجواب کی شکل میں ہے۔اس مثنوی میں ایک سوگیارہ اشعار ہیں۔

خوش پوچھی کی سوال ایک موج ایسا آیا
کہنا پیر پیارے ہم کوں کاہے کاج نہ پایا

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز کے سوانحی حالات پر ایک مضمون لکھیے۔

2۔ میراں جی شمس العشاق کی حیات اور شاعری پر روشنی ڈالیے۔

8.7 سولہویں صدی کا مذہبی سرمایہ

8.7.1 شیخ بہاء الدین باجن (912ھ۔790ھ)

شیخ بہاء الدین باجن کے والد حاجی معز الدین دہلی سے آکر احمد آباد میں بس گئے جہاں 790ھ میں بہاء الدین کی ولادت ہوئی۔ابھی باجن چار سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔باجن حضرت شیخ رحمت اللہ کے مرید تھے۔شیخ رحمت اللہ حضرت نظام الدین اولیا کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔باجن حج کے لیے جانے کے بعد ان کے مرشد کا انتقال ہو گیا۔شیخ رحمت اللہ ہدایت کر گئے کہ باجن کی واپسی کے بعد انھیں خرقۂ ولایت اور تبرکات دے دیے جائیں۔سیاحت کرتے کرتے باجن برہان پور پہنچے اور وہیں مقیم ہو گئے۔ان کی عمر کے آخری چالیس یا اس سے زیادہ سال برہان پور میں گزرے۔912ھ میں انتقال کیا اور برہان پور میں مدفون ہوئے۔ان کے خلیفہ شیخ علی متقی ہیں۔ان کی دو تصانیف ملتی ہیں(1) جنگ نامہ پشواز وساری: اردو کا یہ جنگ نامہ 219 شعروں کی مثنوی ہے۔(2) خزائن رحمت اللہ (فارسی): یہ کتاب فارسی نثر میں ہے لیکن باجن نے جا بجا اپنا اردو کلام بھی دیا ہے۔ نوسو صفحات کی اس کتاب میں اہل طریقت کے افعال و حالات بیان کیے گئے ہیں۔باجن نے اپنے پورے کلام کو جکری قرار دیا ہے۔سلسلہ چشتیہ میں غنا اور سماع بہت مقبول رہا ہے۔جکری کا تعلق اسی سلسلے سے ہے۔جکری (ذکری کی گجری شکل) میں بنیادی طور پر ذکر خدا' ذکر رسول' ذکر پیر و مرشد' ذکر تجربات باطنی و واردات روحانی کو عام فہم انداز میں لکھا جاتا تھا کہ اسے گایا بھی جا سکے اور سازوں پر بجایا بھی جا سکے۔جکری کی حیثیت مختصر گیت یا راگ راگنیوں کے ان بولوں کی تھی جنھیں گا بجا کر لوگوں کے اندر عالم وجد و سرور پیدا کیا جا سکے۔اس میں عشق و محبت کے جذبات بھی ہوتے تھے اور ایسے ناصحانہ مضامین بھی جن سے مریدوں اور طالبوں کی ہدایت ہو سکے۔

کھولو کھولوری یار دکھلاؤ مکھو جس مکھو دیکھیں میری نینو جی سکھو
جس مکھو دیکھیں دکھ دلندر جاوے شاہ رحمت کا درسن باجن پاوے

8.7.2 شاہ علی محمد جیو گام دھنیؒ (973ھ۔895 یا 896ھ)

آپ کی پیدائش احمد آباد میں ہوئی۔گاؤں دھنی آپ کا لقب تھا۔یعنی گاؤں کا مالک۔اسی کو قدیم تلفظ سے گام دھنی کہا گیا۔آپ کی پیدائش 895 یا 896ھ اور وفات 14 جمادی الاول 973ھ مطابق 1565ء کو ہوئی۔آپ کا مزار احمد آباد میں اندرون حصار دروازہ رائے کھڑ میں ہے۔آپ کے دیوان کا نام ''جواہر اسرار اللہ'' ہے۔شاہ علی محمد جیو گام دھنی کا کلام وحدت الوجود (ہمہ اوست) کا ترجمان ہے۔سارا کلام واردات قلبی' عرفان ذات کے مسائل اور صوفیانہ تجربات میں ڈوبا ہوا ہے۔شعر کا ترنم اور عشق کا والہانہ پن ان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

آپیں کھیلوں آپ کھلاؤں آپیں اپس لے گل لاؤں
(گلے لگاؤں)

میرا ناؤں منجے ات بھاوے میرا جی منجے پرچاوے
میری نیہ منجھی سوں مائے رہری اپنیں روپ لبھائے
(سمائے)

8.7.3 برہان الدین جانمؒ

برہان الدین جانمؒ حضرت میراں جی شمس العشاقؒ کے فرزند اکبر اور خلیفہ تھے۔میراں جی شمس العشاقؒ کے مرشد کمال الدین بیابانی نے پیشن

گوئی کی تھی کہ انھیں ایک خدا پرست لڑکا تولد ہوگا جو قطب الا قطاب زمانہ ہوگا۔ بعد ازاں میراں جی شمس العشاقؒ کے ہاں لڑکا تولد ہوا جس کا نام برہان الدین جانم رکھا گیا۔ برہان الدین جانم نے بڑے ہوکر علم ظاہری میں کمال حاصل کیا۔اس کے بعد علم باطنی کے حصول کا شوق ہوا۔انہوں نے اپنے والد میراں جی شمس العشاق کے ہاتھ پر بیعت کی ۔اپنے والد سے تعلیم وتربیت پاکر جانم ایک جید عالم اور صوفی بن گئے ۔حصول علم ودانش کے مقصد سے جانم نے ماں باپ کے گھر کو خیر باد کہا اور سفر پر روانہ ہوگئے ۔ یہ مدت سفر تین سال تھی۔ جانم کا مزار بیجاپور میں ہے۔ان کی رفیقۂ حیات بی بی میمونہ عرف چاند صاحب بی کا مزار بھی پاس میں موجود ہے۔

جانم اپنے والد کی طرح رشد و ہدایت اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔وہ اردو زبان میں تلقین کیا کرتے اور معرفت وسلوک کی تعلیمات سادہ اور سلیس زبان میں اپنے معتقدین اور مریدوں کے ذہن نشین کروانا چاہتے تھے۔ برہان الدین جانم چشتیہ سلسلے کے بزرگوں میں سے ہیں جن کی تصانیف نے خواص وعوام میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی تھی۔

جانم کثیر التصانیف صوفی تھے۔ان کی شعری ونثری تخلیقات حسب ذیل ہیں:۔

شعری تصانیف

1۔ ارشاد نامہ: یہ طویل نظم دو ہزار دوسوبیس اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں مذہبی امور سے متعلق سوالات اور جوابات ہیں۔

2۔ وصیت الہادی: اکیاسی اشعار پر مشتمل مثنوی ہے جس میں ذکر خفی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

3۔ سکھ سہیلا: یہ دکنی ادب کا پہلا سہیلا ہے۔سہیلا اس گیت کو کہتے ہیں جو خوشی کے موقع پر محفلوں میں گایا جاتا تھا۔ جانم نے اس میں بکثرت ہندی الفاظ استعمال کیے ہیں۔

4۔ منفعت الایمان: اس میں شرک سے دور رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔اور یہ ایک سوبیس اشعار پر مشتمل ہے۔

5۔ نسیم الکلام: اس مثنوی میں پینتالیس اشعار ہیں۔

6۔ محبت البقا: آٹھ سو پانچ اشعار پر مشتمل طویل نظم ہے جس میں رہبری کے لیے مرشد کامل کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز ہمہ اوست کے فلسفے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

7۔ نکتہ واحد: اس نظم کا موضوع توحید ہے۔طریقت کے اسرار ورموز بھی بتائے گئے ہیں۔

8۔ بشارت الذکر: اس مثنوی میں پانچ اذکار یعنی جلی، قلبی، روحی، سری اور خفی کی تفصیلات ہیں۔

9۔ رموز الواصلین: اس مثنوی میں نور، روح، دل، نفس، مراقبہ، ذات وصفات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

10۔ ''کفر نامہ'' اور ''مسافرت خاں میاں وبیان خلاصہ: یہ دو مثنویاں ہیں۔راجو خاں اور خاں میاں دونوں جانم کے مرید تھے۔ طالب کے سوالات اور مرشد کے جوابات مکالمے کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں۔

11۔ توحید حقیقت: اس شعری تخلیق کا موضوع توحید ہے۔

12۔ عبرت آدم: اس مختصر سی نظم میں صرف اکیس اشعار ہیں۔خدا کہتا ہے کہ میں نے زمین وآسمان اور ساری کائنات آدم کے لیے پیدا کی لیکن انسان ایسا نادان ہے کہ صفت پر فریفتہ ہے اور صانع کی طرف توجہ نہیں کرتا۔

13۔ جانم نے اپنے والد کی وفات پر ایک پر درد مرثیہ لکھا جو طویل بھی ہے۔

جانم نے ایک اور مرثیہ میں فلسفۂ شہادت کو پیش کیا ہے۔ پورا مرثیہ متصوفانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔جانم نے گیتوں اور دوہروں میں بھی طبع

آزمائی کی ہے۔

نثری تصانیف:

جانم کی نثری تصانیف حسب ذیل ہیں:

1۔ معرفت القلوب: اس میں طریقت سے معرفت تک مختلف مراحل کا ذکر کیا گیا ہے۔

2۔ کلمتہ الحقائق: یہ ضخیم تصنیف قدیم اردو کا اولین نثری کارنامہ ہے۔ مصنف کے سامنے اردو نثر کا کوئی نمونہ نہیں تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اردو اور فارسی میں کیا تناسب رکھیں۔ انہوں نے جگہ جگہ فارسی جملے لکھے ہیں' کہیں ایک جملہ اردو' دوسرا فارسی' کہیں ایک جملے کا ایک تابع جملہ اردو' دوسرا فارسی ہے۔

کلمتہ الحقائق کا موضوع مسائل تصوف ہے۔ اس میں ذات وصفات' فنا' بقا' نور جیسے موضوعات پر سوال و جواب کے پیرائے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ مرشد نے قرآنی آیات واحادیث سے اپنے بیانات کی سند پیش کی ہے اور جا بجا ان سے مدد لی ہے۔

3۔ مجموعہ الاشیا: یہ مختصر سا رسالہ مکالمے کی شکل میں ہے۔ یہ صرف تیرہ صفحات پر مشتمل ہے۔

برہان الدین جانم کے اشعار دیکھیے۔

عیب نہ راکھیں ہندی بول معنی تو چک دیکھیں کھول
جوں کہ موتی سمندر سات ڈبرے میں جے لاگے ہات
کیوں نہ لیوے اس بھی کوئے سہانا چتور جے کوئی ہوئے

برہان الدین جانم نے کہا کہ میں نے ''ہندی'' میں تصوف کے بعض مسائل سمجھانے کی کوشش کی ہے تاکہ اس سے عوام استفادہ کرسکیں۔ موتی سمندر سے ملیں یا کسی کھڈ سے' ان کی قدر و قیمت ایک ہی ہوتی ہے۔ اس لیے ہندی زبان میں اگر بصیرت افروز اور سبق آموز باتیں بیان کی جائیں تو انہیں قابل توجہ سمجھنا چاہیے۔ نیز ہندی کو ذریعۂ اظہار بنانا کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ برہان الدین جانم کی زندگی کے حالات' نثر اور شعری تصانیف پر جامع نوٹ لکھیے۔

2۔ شیخ بہاء الدین باجن اور شاہ علی جیو گام دھنی کے حالات زندگی اور شاعری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

8.8 سترہویں صدی کا مذہبی سرمایہ

8.8.1 خوب محمد چشتی (وفات 1023ھ مطابق 1614ء)

خوب محمد چشتی کا وطن احمد آباد گجرات تھا۔ ان کا مزار چوک احمد آباد میں خان دروازے اور فرحت الملک کی مسجد کے پاس ہے۔ وہ شیخ کمال محمد سیستانی کے مرید تھے۔ ان کی مثنوی خوب ترنگ 986ھ میں لکھی گئی۔ مرشد سے دن رات کچھ باتیں سن کر خوب محمد کو ترنگ آئی اس لیے مثنوی کا نام خوب ترنگ رکھا۔

وہ جیوں منجہ کو آئی ترنگ جمع کیے نے تس تس ڈھنگ
خوب ترنگ اس دیا خطاب مدح رسول اللہ باب

مثنوی خوب ترنگ کا موضوع معرفت واخلاق ہے۔ انہوں نے مسائل تصوف نظم کیے ہیں۔ بیشتر مسائل کو حکایتوں کے تمثیلی پیرائے میں اجاگر

کیا ہے۔خوب ترنگ میں اپنے سے بیشتر کے مصنفوں کی نسبت عربی فارسی الفاظ استعمال کرنے کا رجحان زیادہ ہے لیکن بعض اوقات یہ عربی فارسی الفاظ کو دکنی طریقے سے مسخ کر لیتے ہیں جیسے مصرے (مصرع) درس (درست)' دریے (دریا۔ندی)' کاگل (کاغذ) وغیرہ۔خوب محمد چشتی کی دوسری تصنیف ''بھاؤ بھید'' ہے۔یہ رسالہ صنائع بدائع کے بارے میں ہے۔ہر صنعت کی تشریح فارسی میں کی ہے لیکن اس کا مفہوم گجراتی اردو میں بھی ادا کیا ہے۔مثالیں گجراتی اردو میں ہیں۔ظاہر ہے کہ صنائع کی تفہیم کے لیے وضاحت اور تفصیل درکار تھی۔خوب محمد چشتی کی تیسری تصنیف ''چھند چھنداں'' ہے۔یہ منظوم رسالہ ہندوی و فارسی عروض سے متعلق ہے۔

8.8.2 میراں جی خدانما (1074ھ۔1004ھ مطابق 1662ء)

میراں جی خدانما' حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے سلسلۂ فیض کے شاعر وادیب ہیں۔آپ سید تھے۔اپنے کلام میں انہوں نے میراں اور سید میراں تخلص استعمال کیا ہے۔آپ کے والد کا نام شاہ قاسم محمود تھا۔حضرات میراں جی خدانما نے اپنے آپ کو رشد و ہدایت کے لیے وقف کر دیا اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کی سرکاری ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔چوں کہ آپ بندگان خدا کو حق پرستی اور معرفت خداوندی کا درس دیا کرتے' اس لیے انھیں ''خدانما'' کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔

سلسلۂ بندہ نوازؒ کے مشائخین کی طرح میراں جی خدانما بھی تصنیف و تالیف میں مشغول رہے اور اپنی نگارشات سے خلق اللہ کی دینی اور علمی خدمت انجام دی۔انہوں نے کئی اردو رسالے اور نظمیں لکھیں۔رسالہ وجودیہ (موضوع: تصوف کے مسائل)' شرح تمہیدات عین القضات اور شرح مرغوب القلوب اردو نثر میں ہیں۔میراں جی خدانما نے بشارت الانوار کے علاوہ دو مثنویاں اور غزلیں بھی کہی تھیں۔شرح تمہیدات عین القضات' قاضی عین القضات ہمدانی کی تصنیف ہے۔تصوف سے متعلق اس فارسی تصنیف کی شرح حضرت خواجہ بندہ نواز نے فارسی ہی میں لکھی تھی۔میراں جی خدانما نے اسی کو دکنی نثر میں منتقل کیا۔رسالہ وجودیہ میراں جی خدانما کی نثری یادگار ہے جس میں تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔''مرغوب القلوب'' فارسی نظم ہے جو شمس تبریز سے منسوب کی جاتی ہے۔میراں جی خدانما نے دکنی نثر میں اس کی شرح لکھی ہے جس کا نام ''شرح مرغوب القلوب'' ہے۔

میراں جی خدانما کے رسالے' اردو کی ارتقائی منزل اور اس کے تشکیلی دور کی اچھی نمائندگی کرتے ہیں۔خدانما کی نثر میں قواعد کا یہ رجحان نظر آتا ہے کہ اکثر جملوں میں فعل' فاعل اور مفعول اپنے مناسب مقام پر دکھائی دیتے ہیں لیکن عبارتوں میں ہر جگہ اس کا التزام نہیں رکھا گیا ہے۔دوسری خصوصیت یہ ہے کہ عبارتوں کے ٹکڑے ایک دوسرے سے پیوست نظر آتے ہیں اور درمیان میں خلا کا بہت کم احساس ہوتا ہے۔اس سے بھی نثر کی ترقی اور نشو ونما میں میراں جی خدانما کی تحریروں کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

8.8.3 شاہ امین الدین علی اعلیٰؒ (پیدائش 22 رمضان 1007ھ' وفات 1085ھ)

امین الدین علی اعلیٰ ؒ دکن کے مشہور صوفی برہان الدین جانم کے فرزند اور میراں جی شمس العشاقؒ کے پوتے تھے۔ان کی تعلیمات کا فیض جنوبی ہند میں سالہا سال تک جاری رہا۔اس سرچشمہ سے کئی سالکان طریقت کے ذوق عرفان وآگہی کی آبیاری ہوتی رہی ہے۔انہوں نے امین اور امین الدین تخلص اختیار کیا تھا۔ان کی والدہ کا نام بی بی میمونہ عرف چاند صاحب بی تھا۔برہان الدین جانم کا انتقال امین الدین اعلیٰ کی ولادت سے قبل ہو چکا تھا۔اس لیے وہ اپنے والد کے سایۂ عاطفت سے محروم رہے اور علم ظاہری کا اکتساب سید علی گنج گوہر' محمود خوش دہاں سے کیا۔محمود خوش دہاں نے امین اعلیٰ کی تعلیم و تربیت پر بڑی توجہ کی تھی اور انہیں چشتیہ کے علاوہ قادریہ سلسلے میں بھی بعیت عطا کی تھی۔امین الدین علی اعلیٰ کامل اور ولیِ صادق تھے۔ان کی رفیقہ حیات کا نام خونزہ رانی (خونجا رانی) اور فرزند کا نام بابا شاہ حسینی تھا۔امین الدین علی اعلیٰ کے معتقدین کی تعداد ایک لاکھ تھی۔

امین الدین علی اعلیٰ کی شعری تخلیقات ملاحظہ ہوں:

1۔ جواہرالاسرار: پانچ سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے جس میں چھوٹی چھوٹی مثنویاں ہیں۔

2۔ مثنوی رموز السالکین میں نور، روح، دل، نفس، مشاہدات و مراقبات کی کیفیات نظم کی گئی ہیں۔

3۔ رسالہ قربیہ

4۔ ناریزہ: مختصر سی مثنوی جس میں پانچ عناصر کی تشریح ہے

5۔ وجودیہ: اس نظم میں تصوف کی تشریح کی گئی ہے

6۔ محبّ نامہ: غزل کی ترتیب رکھی گئی ہے

7۔ مدح شاہ برہان الدین جانم: قصیدے کی ہیئت میں ہے۔

امین الدین علی اعلیٰ کی غزلیں بھی دستیاب ہیں۔

نثری تخلیقات

1۔ گنج مخفی: اس رسالہ میں نظام تصوف کی تشریح کی گئی ہے۔

2۔ وجودیہ: اس رسالہ میں روح، قلب، نفس، توحید، ذکر اور منزل شہادت وغیرہ کی ساری تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔

3۔ رسالہ گفتار شاہ امین

4۔ کلمتہ الاسرار: یہ امین الدین علی اعلیٰ کا سب سے طویل نثری کارنامہ ہے۔اس میں کلمہ طیبہ کی تشریح کی گئی ہے۔ کلمتہ الاسرار کی زبان امین الدین علی اعلیٰکے دوسرے نثری رسالوں کی بہ نسبت صاف، رواں اور سلیس ہے۔

5۔ عشق نامہ: اس رسالہ میں عشق الٰہی کے اسرار و رموز بیان کیے گئے ہیں اور عشق حقیقی کی برکات کا ذکر کیا گیا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ خوب محمد چشتی کی شاعری پر نوٹ لکھیے۔

2۔ میراجی خدانما کے نثری اور شعری کارناموں پر روشنی ڈالیے۔

3۔ شاہ امین الدین علی اعلیٰ کے حالات زندگی، شعری اور نثری تخلیقات پر اظہار خیال کیجیے۔

8.9 خلاصہ

تصوف کا مقصد تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب، تصفیۂ اخلاق اور تعمیر ظاہر و باطن ہے۔غفلتوں سے بچ کر اللہ تعالیٰ کی یاد میں وقت گزارا جائے تا کہ سعادت ابدی حاصل ہو سکے۔تصوف میں شریعت کی پابندی شامل ہے۔شریعت اپنے اندر طریقت کو بھی سموے ہوئے ہے۔تصوف کو طریقت و معرفت بھی کہا جاتا ہے۔یہ علم باطن ہے اور باطن کے اعمال سے تعلق رکھتا ہے۔اس کی بنیاد قلب پر ہے۔تصوف کے لیے محبت ضروری ہے۔تصوف نے عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ قرار دے کر ہر پیکر سے خلوص و محبت کی تعلیم دی۔صوفی لفظ صوف سے منسوب ہے۔لباس صوف (موٹا اون) پہننے والے کو صوفی کہا گیا۔ ہندوستان میں تصوف کے ابتدائی نظریات کا پتہ گیارہویں صدی عیسوی سے ملتا ہے۔ پہلے صوفی سیف الدین ملتان کے راستے ہندوستان آئے۔ تصوف کی ترویج میں سب سے زیادہ حصہ سلسلۂ چشتیہ کا ہے۔دیگر سلسلوں میں قادریہ، سہروردیہ، نقشبندی، شطاریہ وغیرہ ہیں۔صوفیائے کرام نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں رہائش اختیار کی اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ وہ زندگی بھر لوگوں کو خدا اور بندوں کی محبت، بندوں کے درمیان صلح و آشتی کا پیغام، انسانیت کا درس، ہم آہنگی، یکجہتی، میل جول، خیر سگالی، خلوص و محبت کی تعلیم دیتے۔ان میں اخلاقی اور باطنی روح پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کی

خانقاہوں میں بلا لحاظ مذہب وملت، رنگ ونسل، امیر غریب، چھوٹے بڑے، عالم جاہل، سب کے لیے کھلی رہتیں۔غم زدہ اورٹوٹے ہوے دلوں پر مرہم رکھنا ان کا فرض اور بے سہاروں کو سہارا دینا ان کا شیوہ تھا۔ وہ اچھی معاشرت، اچھا سماج، عوام میں اخلاقی قدروں کا فروغ، سماجی واخلاقی اعتبار سے ایسا صحت مند ماحول چاہتے تھے جو بنی نوع انسان کی خوشی ومسرت کا سبب بنے۔صوفیا خشیت الٰہی سے لرزاں اور محبت الٰہی سے سرشار ہوتے۔ان میں خدا کا عشق اور بندگان خدا کی محبت پائی جاتی۔ان کی زندگی صاف، سادہ اور بے داغ ہوتی۔ان میں دکھاوا بالکل نہیں ہوتا۔لوگ پروانہ واران کے گرد جمع ہوتے اور وہ لوگوں کے اخلاق وسیرت کو اپنے اعلیٰ کردار کے عملی نمونوں سے سنوارنے کی کوشش کرتے۔

صوفیا نے عوام سے ان کے اپنے روزمرہ میں گفتگو کی کیونکہ انھیں اپنی بات عوام تک پہنچانی تھی۔اردو شاعری کو اپنے پیغام کا وسیلہ بنایا۔نثری رسالے بھی اسی مقصد سے تصنیف کیے۔اردو زبان وادب کی تخلیق ونشو ونما صوفیا کی مرہون منت ہے۔اردو زبان کی ترویج واشاعت میں ان کی خدمات مسلمہ ہیں۔ان کے تربیتی فقرے اردو کے نقوش اولین اور ابتدائی نمونے ہیں۔یہ فقرے اردو زبان کے ارتقا میں معاون ثابت ہوئے۔وہ مقامی بولیوں کو استعمال کرتے۔عوام سے سیدھے اور حقیقی رابطے کا یہ ثمرہ تھا کہ زبان کا وہ عوامی کینڈا تیار ہوگیا جس پر آئندہ زمانے میں اردو زبان اور روزمرہ کی عمارت استوار ہوئی۔صوفیا کو سادہ اور عام فہم زبان میں اپنی بات عوام تک پہنچانا تھا۔انہوں نے اپنی محنت سے زبان کے دریا کو بیان پر ڈالا اور وعظ ونصیحت، شعری ونثری تخلیقات کے ذریعے اپنا پیغام عوام تک پہنچایا۔شعری تخلیقات میں عروضی اصولوں کی بھی سختی سے پابندی ممکن نہ تھی اس لیے ردیف وقوافی میں حسب ضرورت تغیر وتبدل کی مثالیں موجود ہیں۔یہ ادبی زبان کا عہد طفولیت تھا۔جملوں میں الفاظ کی وہ ترتیب نہیں جو قواعد کی رو سے ہونی چاہیے۔فارسی اور دکنی نثر کا امتزاج اس زمانے کی تصانیف میں نظر آتا ہے۔کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا کہ مصنف وشاعر کے ذہن میں خیالات کا ہجوم ہے لیکن زبان یاوری نہیں کر رہی ہے۔ان سب کے باوجود صوفیائے کرام مستقل مزاجی سے اس عوامی زبان میں تحریر وتقریر کے ذریعے اپنی بات پیش کرتے چلے جارہے ہیں۔صوفیا اپنا کام کیے جارہے ہیں، عوام رشد وہدایت سے فیض یاب ہورہی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ زبان کی نشو ونما ہوتی جارہی ہے۔سالہا سال کی کوششوں اور کاوشوں سے زبان منجھتی گئی، بیان میں روانی آئی اور ایک اچھا خاصہ اردو ادب کا ذخیرہ جمع ہوگیا۔اردو ادب کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام نے بنیاد کا کام کیا ہے۔

حضرت معین الدین چشتی نے اس زمانے کے اسلامی علوم وفنون کے مراکز سمرقند اور بخارا میں علوم ظاہری کی تکمیل کی اجمیر میں غریبوں محتاجوں، مظلوموں کی مدد کرتے اور شریعت وطریقت، معرفت اور حقیقت کی راہیں بھی بتائیں۔آپ کے اکابر خلفا ہندوستان کے مختلف مقامات میں بس گئے اور ساری زندگی روحانیت کا درس دیتے رہے۔1229ء میں حضرت غریب نواز کا وصال ہوا۔شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر (1265-1173ء) پاک پٹن کے قصبے میں تصوف کی شمع روشن کرتے رہے۔ان کی زبان سے نکلے ہوئے اردو کے مختلف فقرے مشہور ہیں جیسے آنکھ آئی ہے۔پونوں کا چاند بھی بالا ہوتا ہے۔

شیخ حمید الدین ناگوری (1274-1193ء) حضرت غریب نواز کے مرید اور خلیفہ تھے۔آپ نے ناگور کی سرزمین کو اپنے روحانی جلوؤں سے معمور کیا اور ساری زندگی تصوف کی ترویج میں گزار دی۔آپ دولت سے نفرت کرتے تھے اس لیے انہوں نے اپنی زندگی کو فقر وافلاس میں گزار دینا پسند فرمایا۔

حضرت امیر خسرو (1325-1252ء) حضرت نظام الدین اولیا کے مرید تھے۔آپ کا وطن قصبہ پٹیالی ضلع ایٹہ تھا۔آپ نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ دہلی میں گزارا۔ان کی فارسی تصانیف میں اردو کے کئی فقرے ملتے ہیں۔وہ موسیقی کے استاد بھی تھے۔ان کی ایجادات علم موسیقی کا بیش بہا سرمایہ ہے۔شیخ عین الدین گنج العلم (795ھ-706ھ) دہلی میں پیدا ہوئے۔773ھ میں وہ بیجاپور گئے جہاں 795ھ میں انتقال کیا۔انہوں نے دکنی میں چھوٹے چھوٹے رسالے مسائل شرعیہ سے متعلق لکھے۔شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (782ھ-662ھ) بہار کے قصبہ منیر کے متوطن تھے۔آپ شیخ نجیب الدین فردوسی کے مرید تھے۔ان کے کنج مندرے، دوہے، فالنامے اور ملفوظات مشہور ہیں۔

خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو درازؒ (1422ء۔1321ء) دہلی میں پیدا ہوئے۔اپنے والدین کے ساتھ چار سال کی عمر میں دکن پہنچے۔وہ حافظ قران تھے۔انہوں نے چھ سال کی عمر سے کبھی نماز قضا نہیں کی۔آپ کے پیر و مرشد نصیرالدین محمود چراغ دہلوی تھے جن کی خاص توجہ سے انہوں نے بہت جلد سلوک کی منزلیں طے کیں۔بندہ نواز گیسو درازؒ نے بندگان خدا کی رہنمائی و ہدایت میں چوالیس برس گزار دیے۔وہ تفسیر، حدیث اور سلوک کا درس دیا کرتے۔آپ کے والد سید یوسف حسینی تھے جو شاہ راجو قتالؒ کے نام سے مشہور ہوئے۔جب بندہ نوازؒ گلبرگہ تشریف لائے تو ان کی عمر نوے سال سے زیادہ تھی۔سرکاری عہدیدار، بادشاہ اور امرا وغیرہ ان کے پاس آتے تو انہیں عدل وانصاف اور ماتحتوں سے اچھا سلوک کرنے پر زور دیتے۔انہوں نے سہیلے، چکی نامے اور غزلیں کہیں۔اردو نثر میں کوئی رسالہ نہیں لکھا۔میراں جی شمس العشاق (994ھ 902ھ یا904ھ) مکہ معظّمہ میں پیدا ہوئے۔بارہ سال سے زائد عرصے تک مدینہ منورہ میں قیام کیا۔حضرت شاہ کمال الدین بیابانی سے بیعت کی اور انہیں کے کہنے پر بیجاپور گئے اور وہیں تا حیات مخلوق خدا کو اپنے علم وفضل سے بہرہ ور کرتے رہے۔آپ کا مزار بیجاپور میں ہے۔ان کی مثنویاں خوش نامہ، خوش نغز، شہادت التحقیق یا شہادت الحقیقت، شہادت نامہ، مغز مرغوب اور وصیت النور مشہور ہیں۔

شیخ بہاء الدین باجن (1506ء۔1388ء) شیخ رحمت اللہ کے مرید تھے۔اپنی عمر کے آخری چالیس سال یا اس سے زیادہ برہان پور میں گزارے۔آپ کی دو تصانیف جنگ نامہ پیشواز وساری اور خزائن رحمت اللہ (فارسی) ملتی ہیں۔شاہ علی محمد جیو گام دھنی (973ھ۔895ھ یا896ھ) احمد آباد میں پیدا ہوئے۔گاؤں دھنی آپ کا لقب تھا یعنی گاوں کے مالک۔اسی کو قدیم تلفظ سے گام دھنی کہا گیا۔آپ کا مزار احمد آباد میں ہے۔آپ کے دیوان کا نام ''جواہر اسرار اللہ'' ہے۔سارا کلام واردات قلبی، عرفان ذات کے مسائل اور صوفیانہ تجربات میں ڈوبا ہوا ہے۔برہان الدین جانم حضرت میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے۔جانم کا مزار بیجاپور میں ہے۔جانم کثیر التصانیف صوفی تھے۔شعری تصانیف میں ارشاد نامہ، منفعت الایمان، نسیم الکلام، حجت البقا، نکتۂ واحد، بشارت الذکر، رموز الواصلین، کفر نامہ، مسافرت خاں میاں و بیان خلاصہ، توحید حقیقت، عبرت آدم اور ایک مرثیہ شامل ہے جو انہوں نے اپنے والد کی وفات پر لکھا تھا۔نثری تصانیف میں معرفت القلوب، کلمتہ الحقائق، مجموعہ الاشیا شامل ہیں۔

خوب محمد چشتی (وفات 1614ء) کا وطن احمد آباد ہے۔وہ شیخ کمال محمد سیتانی کے مرید تھے۔ان کی مثنوی خوب ترنگ 986ھ میں لکھی گئی۔اس کا موضوع معرفت واخلاق ہے۔دوسری تصنیف ''بھاؤ بھید'' ہے جو صنائع بدائع کے بارے میں ہے۔تیسری تصنیف ''چھند چھنداں'' (منظوم رسالہ) ہندوی و فارسی عروض سے متعلق ہے۔میراں جی خدا نما (وفات 1662ء) حضرت امین الدین علی اعلیٰ کے معتقد ہوئے اور فیض حاصل کیا۔آپ نے رشد و ہدایت کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔چوں کہ آپ بندگان خدا کو حق پرستی اور معرفت خداوندی کا درس دیا کرتے، اس لیے انھیں ''خدا نما'' کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔انہوں نے کئی اردو رسالے اور نظمیں لکھیں۔اردو نثر میں رسالہ وجودیہ (موضوع مسائل تصوف)، شرح تمہیدات، عین القضات اور شرح مرغوب القلوب اور شعری تخلیقات میں بشارت الانوار کے علاوہ دو مثنویاں اور غزلیں شامل ہیں۔شاہ امین الدین علی اعلیٰ (1085ھ۔1007ھ) دکن کے مشہور صوفی برہان الدین جانم کے فرزند اور میراں جی شمس العشاق کے پوتے تھے۔ان کی تعلیمات کا فیض جنوبی ہند میں سالہا سال تک جاری رہا۔ان کی شعری تخلیقات میں جواہر الاسرار، مثنوی رموز السالکین، رسالہ قربیہ، مثنوی نار یزہ، وجودیہ، محبّ نامہ اور مدح شاہ برہان الدین جانم شامل ہیں۔نثری تخلیقات میں گنج مخفی، وجودیہ، رسالہ گفتار شاہ امین، کلمتہ الاسرار اور عشق نامہ شامل ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ علم تصوف کیا ہے؟ صوفیائے کرام کی خصوصیات بیان کیجیے۔

2۔ تیرہویں صدی عیسوی سے سترہویں صدی عیسوی کے چند صوفیائے کرام کے حالات زندگی، تعلیمات اور شعری ونثری کارناموں پر روشنی ڈالیے۔

8.10 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

1۔ تصوف کی تعریف، تشریح اور صوفیا کی خصوصیات بیان کیجیے۔

2۔ اردو ادب کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

1۔ حضرت معین الدین چشتی سنجری اجمیری کے حالات زندگی پر روشنی ڈالیے۔

2۔ حضرت سید محمد حسینی بندہ نواز گیسودراز کے سوانحی حالات اور معمولات پر اظہار خیال کیجیے۔

3۔ میراں جی شمس العشاق کی سوانح اور ادبی کارناموں کو اجاگر کیجیے۔

4۔ برہان الدین جانم کی صوفیانہ خدمات کا جائزہ لیجیے۔

5۔ میراں جی خدانما پر نوٹ لکھیے۔

6۔ شاہ امین الدین علی اعلیٰ کے سوانحی حالات اور تصانیف پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

8.11 فرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
غایت	مقصد	دوئی	دو
سالک	راہ سلوک (تصوف میں قدم رکھنے والا)	مظہر	اظہار
صوف	موٹا اون	خشیت الٰہی	اللہ کا خوف
صفا	صفائی	کدر	گندگی
شیوہ	طریقہ	درگزر	معاف کرنا
تزکیۂ نفس	دماغ کی صفائی	تصفیۂ قلب	قلب کی صفائی
محاسبہ	حساب کتاب	ہمسفر	ساتھی
بلاتخصیص	بغیر کسی امتیاز وتفریق	باطن	اندرون
بالا	اونچا	بسیرا	ٹھکانہ، رہنے کی جگہ
پروانہ وار	جوق در جوق	گرد	اطراف
ثمرہ	پھل، نتیجہ	مفقود	نہ پایا جانا

آشنا کرنا	بتانا	امتزاج	دو چیزوں کا ملنا
ادبی تخلیق	ادبی فن پارہ، کتاب	مسرور	خوش
تحمل	برداشت	یادحق	یاداللہ
قول	کہاوت، کہاہوا	نقاہت	کمزوری
تاب نہ لانا	برداشت نہ کرنا	مستحسن	عمدہ، اچھا
ناقص	جس میں نقص ہو، کمی	منسوب	جن کے نام کی گئی شئے
طلب	چاہت	تلفظ	ادائیگی
مزار	قبر	ضخیم	زیادہ طویل
نثری کارنامہ	نثری کتاب	نشوونما	ترقی
تشکیلی دور	بننے کا زمانہ	التزام	لازم
قبل	پہلے	صادق	سچا
کثیرالتصانیف	وہ ادیب جن کی کئی کتابیں ہوں	تغیر	تبدیلی
اکتساب	حاصل کرنا	یاوری	ساتھ

8.12 سفارش کردہ کتابیں

1۔ اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ — مولوی عبدالحق

2۔ تاریخ ادب اردو (پانچ جلدیں) — پروفیسر سیدہ جعفر و پروفیسر گیان چند جین (1700ء تک)

3۔ تاریخ ادب اردو (حصہ اول و دوم) — ڈاکٹر جمیل جالبی

4۔ اٹھارہویں صدی کی دکنی شاعری کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ — ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس
(پی ایچ ڈی مقالہ مخزونہ اندرا گاندھی میموریل لائبریری یونیورسٹی آف حیدرآباد 1995ء۔ غیر مطبوعہ)

5۔ وصیت النور — ڈاکٹر صبیحہ نسرین

مضامین

1۔ صوفیائے کرام اور ہندوستانی سماج — محمد الیاس قدوسی

2۔ تصوف۔ ایک اجمالی تعارف — عبدالرؤف خاں، (جامعہ۔ فروری 1984ء)

3۔ اردو زبان، ہندوستانی کلچر اور صوفیائے کرام — پروفیسر نثار احمد فاروقی
(مشمولہ اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی 1987ء اردو کادمی دہلی)

چوتھا باب: دکنی ادب کا آغاز وارتقا

اکائی 9 بہمنی دور میں اردو ادب

اکائی کے اجزا

9.0 مقصد

9.1 تمہید

9.2 بہمنی دور میں اردو ادب

9.2.1 حضرت خواجہ بندہ نوازؒ

9.2.2 فخر دین نظامی

9.2.3 میراں جی شمس العشاق

9.2.4 سید شاہ اشرف بیابانی

9.2.5 قطب الدین قادری فیروز

9.2.6 سید عبداللہ حسینی

9.2.7 مشتاق

9.2.8 لطفی

9.3 خلاصہ

9.4 نمونۂ امتحانی سوالات

9.5 فرہنگ

9.6 سفارش کردہ کتابیں

9.0 مقصد

اس اکائی کے پڑھنے کے بعد طلبہ سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ

☆ بہمنی دور کے اہم شاعروں اور مصنفین کے بارے میں اپنی معلومات کا اظہار کرسکیں۔

☆ بہمنی دور کے شاعروں کا مختصر تعارف پیش کرسکیں۔

☆ بہمنی دور میں اردو زبان وادب کے فروغ میں صوفیائے کرام کی خدمات سے متعلق معلومات پر گفتگو کرسکیں۔

9.1 تمہید

اس اکائی میں بہمنی دور میں اردو ادب کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس عہد کے اہم شاعروں کے کلام کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے اور ساتھ ہی بہمنی دور میں صوفیائے کرام کے درس وارشادات اور تصنیف وتالیف کے حوالے سے اردو زبان وادب کے فروغ کے سلسلے میں ان کی گراں قدر خدمات سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

9.2 بہمنی دور میں اردو ادب

دکن میں اردو زبان کی نشوونما کے سلسلے میں کچھ سیاسی واقعات اور لسانی اختلاط نے نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔ علاء الدین خلجی نے 1310ء تک دکن کو فتح کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا۔ 1327ء میں محمد شاہ تغلق نے اپنی سلطنت کے پائے تخت کو دولت آباد منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ محمد شاہ تغلق کا یہ فیصلہ سیاسی لحاظ سے جو بھی حیثیت رکھتا ہو، اردو زبان کی نشوونما کے لیے کارآمد ثابت ہوا۔ اس کے حکم پر جب دہلی سے آبادی کا بہت بڑا حصہ دولت آباد منتقل ہوا وہ اپنے ساتھ اردو زبان لے کر آیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد جب بادشاہ نے دہلی واپس جانے کا ارادہ کیا تو سبھی لوگ واپس نہیں گئے، جو یہاں بس گئے وہ اردو زبان بولتے رہے۔ آہستہ آہستہ اس پر مقامی زبانوں کا بھی اثر ہونے لگا۔ اس تمام عرصے میں اردو زبان کا خمیر پورے طور پر تیار ہو چکا تھا اور اس میں اتنی توانائی اور سکت پیدا ہوگئی تھی کہ اسے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا جاسکے۔ محمد تغلق کے آخری دورِ حکومت میں ''امیران صدہ'' نے متحد ہوکر بغاوت کردی۔ 1347ء میں دکن میں تغلق کی بادشاہت ختم ہوگئی اور علاء الدین حسن بہمنی نے اپنی خودمختاری کا اعلان کرتے ہوئے بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

بہمنی دور کے ادب کو ہم اردو ادب کی بنیاد قرار دے سکتے ہیں۔ دکنی ادب میں شعر وادب کی تخلیق کا آغاز اسی عہد میں ہوا۔ بہمنی دور چودھویں صدی کے تقریباً نصف سے شروع ہوتا ہے اور سولہویں صدی کے اولین پچیس سال پر محیط ہے۔ بہمنی دور میں دکنی زبان ادبی زبان کے طور پر ابھرنے لگی۔ ایک جانب شاہی سرپرستی نے زبان وادب کے فروغ میں نہایت اہم رول ادا کیا اور دوسری جانب صوفیائے کرام نے اس زبان کو اسلام کی اشاعت اور رشد وہدایت کی زبان کے طور پر منتخب کیا جس سے اس کی جڑیں مستحکم ہوئیں۔ دکنی زبان کے ابتدائی نمونوں میں صوفیائے کرام کے ملفوظات اور رسائل اردو نثر ونظم کی ہیئت میں موجود ہیں۔ اس دور کے اہم شعرا اور مصنفین میں حضرت خواجہ بندہ نوازؒ، فخر الدین نظامی، میراں جی شمس العشاق، اشرف بیابانی، قطب الدین قادری، فیروز، سید عبداللہ حسینی، مشتاق اور لطفی وغیرہ شامل ہیں۔

9.2.1 حضرت خواجہ بندہ نوازؒ

حضرت سید محمد حسینی بندہ نواز گیسودرازؒ فیروز شاہ بہمنی کے دور میں دہلی سے گلبرگہ تشریف لائے۔ اس وقت آپ کی عمر اسّی (80) برس تھی۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ حضرت نظام الدین اولیا کے خلیفہ حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ دلی میں آپ کے معتقدین بڑی تعداد میں تھے۔ آپ نے اسلام کی تبلیغ واشاعت کی خاطر دکن کا رخ کیا۔ جب 1400ء میں آپ بہمنی سلطنت کے صدر مقام گلبرگہ تشریف لائے تو خود بادشاہِ وقت فیروز شاہ بہمنی نے آپ کا استقبال کیا اور قدردانی کا پورا پورا حق ادا کیا۔ آپ ہمہ وقت عبادت اور درس وتدریس میں مصروف رہتے۔ قلیل مدت میں آپ کے معتقدین کا دائرہ نہایت وسیع ہوگیا۔ آپ کے ارشادات سے فیض حاصل کرنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ چونکہ عوام کی زبان دکنی تھی

اس لیے ان کی سہولت کی خاطر آپ درس دکنی میں دیا کرتے تھے۔ محققین نے آپ کی تصانیف کی تعداد 37 بتائی ہے۔ جن میں معراج العاشقین، ہدایت نامہ، تلاوت الوجود، شکارنامہ، چکی نامہ وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن جدید تحقیق کی روشنی میں ڈاکٹر حفیظ قتیل نے معراج العاشقین کو بیجاپور کے ایک بزرگ حضرت مخدوم شاہ حسینیؒ کی تصنیف قرار دیا ہے۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ نے مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کو بھی اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لیے چکی نامہ لکھا۔ دکن میں اردو زبان وادب کے ارتقا میں آپ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔

9.2.2 فخر دین نظامی

فخر دین نظامی بہمنی دور کے نہایت اہم شاعر ہیں۔ یہ سلطان احمد شاہ بہمنی کے دور میں بیدر میں سکونت پذیر تھے۔ فخر دین بادشاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ ''کدم راؤ پدم راؤ'' ان ہی کی لکھی ہوئی مثنوی ہے جسے اردو کی پہلی مثنوی کہا جاتا ہے۔ مثنوی کی داخلی شہادت اور اشعار کے مفہوم سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مثنوی احمد شاہ کے دور حکومت میں لکھی گئی تھی۔

مثنوی کا دستیاب شدہ نسخہ ناقص الاول، ناقص الاوسط و ناقص الآخر ہے۔ یعنی اس تصنیف کے ابتدائی، درمیانی اور آخر کے کچھ صفحات غائب ہیں، اس لیے مثنوی کے نام کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ اس مثنوی کے دو اہم کرداروں ''کدم راؤ'' اور ''پدم راؤ'' کے نام پر اس کا نام رکھا گیا ہے۔

مثنوی کی عام ہیئت کے مطابق ''کدم راؤ پدم راؤ'' کا قصہ بھی حمد، نعت اور مدح سلطان کے بعد شروع ہوتا ہے۔ قصہ کچھ اس طرح ہے کہ کدم راؤ راجا ہے اور پدم راؤ اس کا وزیر جو ایک ناگ ہے اور کدم راؤ کی عنایت سے اس کے سر پر پدم بھی موجود ہے۔ ایک دن کدم راؤ کسی واقعے سے غم اور غصے سے افسردہ وملول اپنے محل میں آتا ہے کسی سے بات نہیں کرتا، خاموشی سے لیٹ جاتا ہے۔ راجا کو اس طرح اداس اور غمگین دیکھ کر رانی اس کے پاس پہنچ کر اس کی اداسی کی وجہ دریافت کرتی ہے۔ رانی کے بہت اصرار کرنے پر راجا کہتا ہے کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ عورت اگر پری یا اپسرا بھی ہو تو اس کی وفاداری اور پاک بازی پر بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے اسی بات کا غم کھائے جا رہا ہے۔ رانی کدم راؤ کو بہت سمجھاتی ہے کہ ہر عورت ایک جیسی نہیں ہوتی ہے، اسی طرح جیسے پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔ کوئی ایک گر بُرا کام کرے تو اسے صرف اور صرف اس کی ذات اور شخصیت کی خامی یا کمزوری سمجھنا چاہیے۔ اسے سب سے جوڑ کر دیکھنا غلط ہے۔ وہ مزید کہتی ہے کہ میں تو ہمیشہ تمہاری وفادار داسی رہوں گی۔ لیکن رانی کی باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ پدم راؤ بھی اسے سمجھانے کی بہت کوشش کرتا ہے۔ کدم راؤ کہتا ہے کہ میں اس دنیا سے بددل ہو گیا ہوں۔ جوگیوں اور سنیاسیوں کی صحبت میں رہنا چاہتا ہوں۔ راجا کے حکم پر باکمال جوگی اکھر ناتھ کو تلاش کر کے دربار میں پیش کیا جاتا ہے۔ اکھر ناتھ نے اپنے کمالات دکھائے اور لوہے کو سونا کر دکھایا۔ راجا اکھر ناتھ جوگی کو انعام واکرام سے نوازتا ہے اور اس سے یہ فن سکھانے کی فرمائش کرتا ہے۔ کدم راؤ اس سے اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ اب اسے جوگی کے بغیر چین نہیں آتا۔ اکھر ناتھ کدم راؤ کو دھنور بید اور امر بید سکھاتا ہے۔ ایک دن منتر کو آزمانے کے لیے راجہ کدم راو اپنی روح ایک مردہ طوطی کے جسم میں داخل کرتا ہے۔ اکھر ناتھ کے دل میں لالچ پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنی روح کدم راؤ کے جسم میں منتقل کر دیتا ہے کدم راؤ طوطی بن کر بھٹکنے لگتا ہے اور اکھر ناتھ راجا بن کر راج کرنے لگتا ہے۔ ایک دن وہ وزیر سے ''فرمائشِ نامعقول'' کرتا ہے۔ پدم راؤ اس فرمائش کو پورا کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اکھر ناتھ غصے میں پدم راؤ پر بہت لعن طعن کرتا ہے۔ اُدھر اصل راجا کدم راؤ طوطی بن کر اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا ہے۔ ایک دن اُڑتے اُڑتے اُسے اپنا محل نظر آتا ہے اور وہ محل میں پدم راؤ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس کے قدموں میں سر رکھ کر اپنے کدم راؤ ہونے کا یقین دلاتا ہے۔ پہلے پدم راؤ کو یقین نہیں آتا لیکن جب کدم راؤ اس سے راز کی وہ تمام باتیں بتاتا ہے جو ان دونوں کے درمیان ہوئی تھیں تو پدم راؤ کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہی اصل کدم راؤ ہے۔ ایک رات جب اکھر ناتھ گہری نیند میں سو رہا ہوتا ہے تو پدم راؤ چپکے سے اس کے انگوٹھے کو ڈس لیتا ہے جس سے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ کدم راؤ منتر پڑھ کر پھر سے اپنی اصل روپ میں واپس آجاتا ہے۔ پہلے کی طرح حکومت سنبھال لیتا ہے اور ہنسی خوشی زندگی گزارتا ہے۔ اس طرح کہانی کا خوشگوار اختتام ہوتا ہے۔

اس کہانی کے ذریعے فخر دین نظامی نے یہ پیغام دیا ہے کہ ذات پات، اونچ نیچ کی سوچ غلط ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اعلیٰ ذات والوں میں ہی تمام خوبیاں ہوں اور ادنیٰ ذات والے بدخصلت ہوں۔ اکھر ناتھ کا تعلق تو اعلیٰ ذات سے تھا لیکن اس نے اپنی مکاری اور سازش سے راجا کا سارا راج پاٹ چھین لیا۔ اسی طرح طبقۂ نسواں سے بدگمان ہونا بھی غلط ہے۔ فرد کی کمزوریوں یا نااہلیوں کو اس کے پورے طبقے سے جوڑنا اور پورے طبقے کا نمائندہ قرار دینا زیادتی ہے۔ ان تصورات کی تردید وہ اکھر ناتھ کے کردار کے ذریعے کرتے ہیں۔ اس طرح فخر دین نظامی اس مثنوی کے ذریعے اخلاقیات کی ایک ہمہ گیر تعلیم دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس مثنوی سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ذات پات اور اونچ نیچ کا تصور سماج کے لیے صحت مند تصور نہیں ہے۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ قصے کے لحاظ سے ہندوی روایت سے اخذ کی گئی ہے۔ اسی مناسبت سے نظامی نے اس میں سنسکرت و پراکرت الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ محاورے اور ضرب الامثال کثرت سے استعمال ہوئے ہیں جس سے زبان میں دلکشی پیدا ہوئی ہے۔ قصے کے بیان میں روانی ہے۔ مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' اردو ادب کی اولین روایت کی نمائندہ ہے۔

9.2.3 میراں جی شمس العشاق

میراں جی شمس العشاق، شاہ کمال الدین بیابانی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ جوانی میں حج بیت اللہ کے لیے مکہ مکرمہ گئے اور بارہ سال تک مدینہ منورہ میں قیام کیا، اس کے بعد بیجاپور آئے۔ آپ کے والد کا نام حاجی دوام الدین ہے۔ شمس العشاق، حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے سلسلہ صوفیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ شمس العشاق بہمنی دور کے بہت بڑے صوفی شاعر تھے۔ اپنے بزرگوں کی طرح انھوں نے بھی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے لیے دکنی زبان کا انتخاب کیا۔ آپ کی تصانیف اس طرح سے ہیں؛ شہادت التحقیق، مغز مرغوب، خوش نامہ، خوش نغز اور شرح مرغوب القلوب وغیرہ۔

میراں جی کی شاعری کا موضوع تصوف ہے اور وہ شاعری کو عوام کی تلقین اور اپنے مریدوں کی ہدایت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی تین مثنویاں خوش نامہ، خوش نغز اور شہادت التحقیق اہمیت کی حامل ہیں۔

خوش نامہ: خوش نامہ کا موضوع تصوف ہے۔ یہ میراں جی کی سب سے مشہور تخلیق ہے۔ خوش نامہ کا مرکزی کردار خوش ایک نیک سیرت لڑکی ہے، جو چغتائی خاندان کا چشم و چراغ تھی۔ وہ بھولی بھالی، محبت کرنے والی، سب سے نرالی، سب کی پیاری، ہنس مکھ اور سب کی آنکھ کا تارا تھی۔ نیک بھی ایسی کہ دن رات اللہ سے لگاؤ رکھتی۔ نہایت ذہین اور سمجھ دار تھی۔ محض سترہ سال ایک ماہ نو دن کی عمر میں اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ میراں جی اسے اللہ کی مرضی سمجھتے ہیں لیکن وہ خوش کی موت سے اخلاقی نتائج اور روحانی مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔

خوش نغز: خوش نغز میں بھی خوش نامہ والی دوشیزہ کا ذکر ہے۔ اس مثنوی میں بہتّر اشعار اور نو باب ہیں۔ ہر باب کے اشعار کی تعداد مختلف ہے۔ یہ مثنوی سوال و جواب کی ہیئت میں لکھی گئی ہے، جس میں میراں جی نے تصوف کے مختلف مسائل مثلاً عرفانِ روح، عرفانِ عالم، عرفانِ مراقبہ، عرفانِ ذوقِ نور، بحثِ عقل و عشق، بیانِ کرامات اور موحّد و ملحد وغیرہ کے متعلق خوش کے ہر ایک سوال کا جواب ایک نئے باب میں دیتے ہیں۔

شہادت التحقیق: شہادت التحقیق کا ایک نام شہادت الحقیقت بھی ہے۔ اس میں 1563 اشعار ہیں۔ یہ میراں جی کی سب سے طویل نظم ہے۔ یہ مثنوی چھوٹی بحر میں لکھی گئی ہے۔ اس کے اسلوب میں روانی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ شہادت التحقیق میں شریعت و طریقت کے مسائل کو قرآن و حدیث کی روشنی میں اس خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ وہ بڑی سرعت کے ساتھ ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔

9.2.4 سید شاہ اشرف بیابانی

اشرف بیابانی کا شمار بہمنی دور کے نامور اور باکمال شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کی پیدائش 1459ء میں فقر آباد میں ہوئی اور وفات 1528ء میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سید شاہ ضیاء الدین بیابانی ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور حقائق و معارف کی طرف متوجہ ہوئے۔

1489ء میں ان کے والد نے انھیں خلافت عطا کی۔اشرف بیابانی کی تین تصانیف ہیں اور تینوں مثنوی کی ہیئت میں ہیں۔ان کے نام لازم المبتدی، واحد باری اور نوسر ہار ہیں۔ان میں نوسر ہار سب سے زیادہ مشہور تصنیف ہے۔

لازم المبتدی: یہ مثنوی 198 اشعار پر مشتمل ہے۔اس مثنوی کو 36 مختلف عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔یہ نظم مختلف مذہبی مسائل کو موضوع بنا کر لکھی گئی ہے جن کا تعلق روزمرہ کے معمولات زندگی سے ہے۔اس میں عام انسان کو شرعی احکامات سے روشناس کرایا گیا ہے تاکہ عام آدمی فرائضِ مذہبی کو صحیح طریقے سے انجام دے سکے۔اس میں غسل، وضو، نماز، سجدۂ سہو، روزہ، فطرہ وقربانی اور بیانِ غسل وکفنِ میّت وغیرہ کو عام بول چال کی زبان میں سمجھایا گیا ہے۔

واحد باری: واحد باری امیر خسرو کی خالق باری کے طرز پر لکھی گئی مثنوی ہے۔اس میں اردو کے فارسی وعربی مترادفات لکھنے کے ساتھ ساتھ موسیقی، عروض، ردیف وقافیہ اور مختلف اصنافِ سخن سے متعلق باتیں بیان کی گئی ہیں۔

نوسر ہار: نوسر ہار مثنوی کی ہیئت میں لکھا گیا مرثیہ ہے۔یہ ایک طویل مثنوی ہے جس کے اشعار کی تعداد اٹھارہ سو ہے۔یہ مثنوی نو (9) ابواب پر مشتمل ہے۔ہر ایک باب ایک انمول ہار کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے اس کا نام نوسر ہار رکھا گیا ہے۔اُس زمانے کے دستور کے مطابق ابواب کے عنوان فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔اس مثنوی کا موضوع واقعۂ کربلا ہے۔اس میں واقعۂ کربلا کی برگزیدہ ہستیوں کے لباس، رسم ورواج، ان کے مزاج وکردار کو ہندوستانی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔انیسؔ اور دبیرؔ کے مرثیوں میں جو ہندوستانی تہذیب وثقافت کا رنگ دکھائی دیتا ہے اس کا آغاز اشرف بیابانی کی نوسر ہار سے ہوتا ہے۔نوسر ہار میں اشرف بیابانی نے واقعۂ کربلا اور شہادتِ امام حسین کو مروجہ واقعے سے قدرے مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔نوسر ہار کا اندازِ بیان اور لہجے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مثنوی مجلسوں میں سنائے جانے کے لیے لکھی گئی تھی۔اس کی زبان بول چال کی زبان سے زیادہ قریب ہے۔اس میں روزمرہ ومحاورے نے بیان کو زوداثر بنا دیا ہے۔انھوں نے مثنوی میں جنگ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ رزم کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے اور شہادت کے بیان میں غم کے جذبات کی شدت محسوس ہوتی ہے۔

9.2.5 قطب الدین قادری فیروز

بہمنی دور کے آخری زمانے میں فیروز کو ایک باکمال سخنور کے طور پر شہرت حاصل ہوئی۔اس کی ایک مختصر سی مثنوی ''پرت نامہ'' اور کچھ غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔''پرت نامہ'' فیروز نے اپنے پیر ومرشد حضرت شیخ محمد ابراہیم مخدوم جی کی مدح میں لکھی ہے۔اس مثنوی کی تصنیف کے وقت مخدوم جی بقید حیات تھے۔بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد فیروز گولکنڈہ چلا آیا، جہاں اسے استادِ سخن کی حیثیت حاصل ہوگئی۔گولکنڈہ کے شعرا، وجہی، محمد قلی اور ابن نشاطی نے اپنے کلام میں فیروز کا ذکر نہایت عزت واحترام سے کیا ہے۔

9.2.6 سید عبداللہ حسینی

بہمنی دور کے ایک مصنف سید عبداللہ حسینی ہیں۔آپ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے پوتے ہیں۔اپنے دادا کی طرح ارشاد وہدایت ان کا مشغلہ تھا۔احمد شاہ ثانی بہمنی کے دور میں موجود تھے۔سید عبداللہ حسینی اپنے دادا کی طرح عوام میں مقبول تھے۔انھوں نے اپنے مریدوں کی ہدایت کے لیے حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی تصنیف ''نشاط العشق'' کا قدیم اردو یعنی دکنی زبان میں ترجمہ کیا۔

9.2.7 مشتاق

مشتاق بہمنی دور کا باکمال شاعر اور استادِ سخن تھا۔یہ سلطان محمد شاہ بہمنی کے دور میں موجود تھا۔مشتاق نے سید برہان الدین شاہ خلیل اللہ کی مدح میں دکنی زبان میں قصیدہ لکھا تھا جو دکنی کا پہلا قصیدہ ہے۔ان کی غزلیات بھی دستیاب ہوئی ہیں، جن کے مطالعہ سے ان کے شاعرانہ کمالات کا اندازہ ہوتا ہے۔

9.2.8 لطفی

لطفی مشتاق کا ہم عصر شاعر ہے۔ اس نے حضرت شاہ محمد کی مدح لکھی ہے۔ انھوں نے قصیدہ اور غزل دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ لطفی نے ایک قصیدہ، خواجہ کرمانی کے مشہور قصیدے کی زمین میں لکھا ہے۔

بہمنی دور کے شعرا میں آذری کا بھی ذکر ملتا ہے جو ایران سے سلطان احمد شاہ بہمنی کے دور میں دکن آیا تھا۔ کچھ برس یہاں رہا۔ بادشاہ نے اسے انعام واکرام سے نوازا۔ واپس ایران جا کر اس نے دکنی زبان میں ''بہمن نامہ'' لکھی، لیکن یہ تصنیف دستیاب نہ ہوسکی۔ تاریخ فرشتہ میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

بہمنی دور میں اردو زبان بول چال کی زبان سے آگے بڑھ کر علم و ادب کی زبان بن چکی تھی۔ اس میں مذہبی تصانیف لکھی گئیں۔ ابتدائی تصانیف سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعرا کا زیادہ تر رجحان تصوف کی طرف رہا۔ علاوہ ازیں ادبی تخلیقات میں غزلیں، قصیدے، مثنویاں اور مرثیے لکھے گئے۔ اس دور کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' ہے جو اردو کی پہلی تصنیف ہے۔ بہمنی دور میں سلاطین نے صوفیائے کرام کی قدردانی کی، شعرا و ادبا کی سرپرستی کی۔ ان کی علم دوستی کی وجہ سے اردو زبان و ادب ترقی کے منازل طے کرتے رہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ اردو کی پہلی مثنوی کونسی ہے؟

2۔ مثنوی نوسرہار کا موضوع کیا ہے؟

3۔ خوش نامہ اور خوش نغز کس کی تصانیف ہیں؟

4۔ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کس بادشاہ کے زمانے میں گلبرگہ تشریف لائے؟

5۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں راجا کو دھوکہ دینے والے جوگی کا نام کیا ہے؟

9.3 خلاصہ

آپ نے اس اکائی میں پڑھا کہ اردو زبان و ادب کے ارتقا کی تاریخ میں بہمنی دور نہایت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اسی دور میں ہمیں اردو ادب کے ابتدائی نمونے ملتے ہیں۔ جیسے فخر دین نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ جس میں ہندو اساطیر سے ماخوذ قصے کو دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس دور کی ایک اور اہم تصنیف اشرف بیابانی کی مثنوی نوسرہار ہے۔ یہ مثنوی واقعہ کربلا کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اُس دور کے صوفیائے کرام نے بھی اردو زبان کی نشوونما و فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے رشد و ہدایت کے لیے دکنی اردو کو منتخب کیا اور عوام کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کے لیے تصنیف و تالیف کا کام بھی قدیم اردو زبان میں کرنے لگے جس سے زبان کی بھی ترویج و اشاعت ہوتی رہی۔ بہمنی دور کے صوفیائے کرام میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ، میراں جی شمس العشاقؒ، سید شاہ اشرف بیابانیؒ، قطب الدین قادری فیروز، صدرالدینؒ، سید عبداللہ حسینیؒ شامل ہیں۔ الغرض بہمنی دور میں صوفیائے کرام نے درس و ارشادات اور تصنیف و تالیف کے ذریعے اردو زبان و ادب کے فروغ میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ اس دور کے دیگر شعراء میں مشتاق، لطفی اور آذری وغیرہ کے بھی نام ملتے ہیں۔ گویا اس دور میں ادب کی بنیاد رکھی گئی جس سے آنے والے دور کے ادبی ماحول کے لیے راہ ہموار ہوئی۔

9.4 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

1۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا خلاصہ بیان کیجیے۔

2۔ بہمنی دور میں اردو زبان وادب کے ارتقا کا جائزہ لیجیے۔

3۔ اردو زبان کے فروغ میں صوفیائے کرام کی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

1۔ اشرف بیابانی کی مثنوی نوسرہار پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

2۔ میراں جی شمس العشاق کی تصانیف پر اظہار خیال کیجیے۔

3۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے کرداروں میں سب سے فعال کردار کونسا ہے؟

9.5 فرہنگ

الفاظ	معنی
لسانی	زبان سے متعلق
اختلاط	میل جول
خمیر	سرشت، فطرت، مزاج
معتقد	اعتقاد رکھنے والا
وسیع	چوڑا، کشادہ
ناقص الاول	جس کتاب کے ابتدائی اوراق موجود نہ ہوں
ناقص الاوسط	جس کتاب کے درمیانی اوراق موجود نہ ہوں
ناقص الآخر	جس کتاب کے آخر کے اوراق موجود نہ ہوں
مزید	اضافہ، زیادتی
ملول	اداس، رنجیدہ
لعن طعن	لعنت ملامت، برا بھلا
خصلت	عادت، مزاج
برگزیدہ	منتخب، چنا ہوا
اصحاب	صاحب کی جمع، ہم نشیں، دوست
سکونت	مستقل قیام
شدت	زور، کثرت، سختی
مدح	تعریف
زود	جلد، فوراً
معارف	علم وفضل، علوم وفنون
سرعت	جلدی، تیزی

اسطور	اساطیر کی جمع، قصے کہانیاں
عالم	بہت پڑھا لکھا، مولوی
فاضل	عالم، دانا
تلقین	نصیحت، ہدایت

9.6 سفارش کردہ کتابیں

1۔	مقدمہ تاریخ زبان اردو	پروفیسر مسعود حسین خاں
2۔	تاریخ اردو ادب (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی
3۔	دکن میں اردو	ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی
4۔	تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک (جلد اول)	پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر گیان چند جین
5۔	دکنی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محی الدین قادری زور
6۔	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	پروفیسر احتشام حسین
7۔	تاریخ ادب اردو	نور الحسن نقوی
8۔	تاریخ ادب اردو کرناٹک	پروفیسر سیدہ جعفر

اکائی 10 عادل شاہی دور میں اردو ادب

اکائی کے اجزا

10.0 مقصد

10.1 تمہید

10.2 عادل شاہی عہد کا سماجی، تاریخی اور تہذیبی پس منظر

10.3 عادل شاہی دور میں شعر و ادب کا ارتقا

10.3.1 شاہ برہان الدین جانم

10.3.2 ابراہیم عادل شاہ ثانی

10.3.3 حسن شوقی

10.3.4 علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ

10.3.5 نصرتی

10.3.6 ہاشمی بیجاپوری

10.4 خلاصہ

10.5 نمونۂ امتحانی سوالات

10.6 فرہنگ

10.7 سفارش کردہ کتابیں

10.0 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبا کو عادل شاہی دور کے شعر و ادب سے واقف کروانا ہے۔ اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ

☆ عادل شاہی عہد کے سماجی، تاریخی اور تہذیبی پس منظر پر روشنی ڈالیں۔

☆ عادل شاہی عہد کے شعر و ادب کا جائزہ لیں۔

10.1 تمہید

دکنی شعر و ادب کے ارتقا میں عادل شاہی دور بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ عادل شاہی عہد کے تقریباً تمام سلاطین شعر و ادب کے دلدادہ

تھے۔ انہوں نے علما' فضلا' شعرا اور دیگر اہل ہنر کی قدر دانی اور سر پرستی کی۔اس اکائی میں ہم عادل شاہی سلطنت کے قیام اور اس کی سماجی' تاریخی اور تہذیبی پس منظر پر روشنی ڈالیں گے۔

10.2 عادل شاہی عہد کا سماجی' تاریخی اور تہذیبی پس منظر

15 ویں صدی عیسوی کے اواخر میں بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں جو پانچ نئی اور خودمختار سلطنتیں قائم ہوئیں ان میں بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کو تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔عادل شاہی سلطنت کا بانی یوسف عادل شاہ تھا۔جو سلطنت بہمنیہ کے مشہور وزیر محمود گاواں کا تربیت یافتہ تھا۔اس نے 1490ء میں اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔تقریباً دوسو سال تک نو بادشاہ یکے بعد دیگرے حکومت کرتے رہے۔اپنی خود مختاری کے بعد یوسف عادل شاہ جہاں اپنی سلطنت کو وسیع اور مستحکم کرنے میں مصروف رہا وہیں ثقافتی اور تہذیبی اعتبار سے بھی اپنی ریاست کی بنیادیں مستحکم کرنے کی کوشش کی۔یوسف عادل شاہ نہ صرف فنون لطیفہ کا اچھا مذاق رکھتا تھا بلکہ خود بھی فارسی زبان میں شعر کہتا تھا۔فارسی اور ترکی پر اسے عبور حاصل تھا۔اس کے دور حکومت میں کئی قلعے اور خوبصورت عمارتیں تعمیر ہوئیں۔1510ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا اسمٰعیل عادل شاہ تخت نشین ہوا۔اس نے تقریباً پچیس سال تک حکمرانی کی۔یہ بھی اپنے والد کی طرح علم دوست' عالموں کا قدر دان اور شعر وسخن کا دلدادہ تھا۔خود بھی شاعر تھا اور وفائی تخلص کرتا تھا۔اس نے چندا پور کے نام سے ایک شہر اور چمپا محل کے نام سے ایک عالی شان محل تعمیر کروایا۔اسمٰعیل عادل شاہ کی وفات کے بعد اس کا فرزند ابراہیم عادل شاہ اول بیجاپور کے تیسرے بادشاہ کی حیثیت سے 1534 میں تخت نشین ہوا۔اگر چہ ابراہیم خود شاعر نہیں تھا لیکن اپنے آباو اجداد کی طرح ذوق علم و ادب سے بہرہ مند تھا۔اس کے عہد کا ایک اہم کارنامہ فارسی کے بجائے دکنی کو دفتری زبان قرار دینا ہے۔اس کے دور میں بیجاپور علم وادب' موسیقی اور صناعی کا مرکز بن گیا تھا۔ابراہیم عادل شاہ کے بعد اس کا بیٹا علی عادل شاہ اول 1558ء میں تخت نشین ہوا۔اس کے عہد میں علم وادب کی بڑی سرپرستی ہوئی۔اس نے خاندانی روایات کی پاسداری کی اور فنون لطیفہ بالخصوص موسیقی کی قدر دانی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔علی عادل شاہ اول کے عہد حکومت میں بیجاپور میں عراق' عرب' ایران اور دوسرے مقامات سے شعرا اور علما یہاں رہ بس گئے۔خود بادشاہ کو مطالعے کا بڑا شوق تھا۔اس کے محل میں ایک عمدہ کتب خانہ موجود تھا۔علی عادل شاہ اول نہ صرف علم وفن کا شائق تھا بلکہ اس کو تعمیرات سے بھی دل چسپی تھی۔دارالسلطنت بیجاپور میں کئی باغ بنائے' نہریں نکالیں اور ایک عالی شان مسجد بنائی۔اس کے عہد میں شاہ برہان الدین جانم نے کئی رسالے نظم اور نثر میں قلم بند کیے جن میں تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔علی عادل شاہ کے بعد اس کا بھتیجا ابراہیم عادل شاہ ثانی 1580ء میں اس کا جانشین ہوا۔اس کا شمار جلیل القدر حکمرانوں میں ہوتا ہے۔وہ مغل شہنشاہ اکبر اور گولکنڈہ کے پانچویں حکمران محمد قلی قطب شاہ کا ہم عصر تھا۔وہ نہ صرف علما اور شعرا کا سرپرست تھا بلکہ خود بھی ایک بلند پایہ شاعر تھا۔اس کو ہندوستانی موسیقی میں کمال حاصل تھا۔موسیقی میں اپنی مہارت اور کمال کی وجہ سے جگت گرو کہلاتا تھا۔اس نے کتاب ''نورس'' اپنی یادگار چھوڑی ہے۔اس کے عہد میں جب گجرات اور احمد نگر کی سلطنتوں کو زوال ہوا تو اس نے وہاں کے علما اور اصحاب کمال کو بیجاپور آنے کی دعوت دی۔ملا ظہوری (مصنف سہ نثر ظہوری)،حکیم ابو القاسم فرشتہ (مصنف تاریخ فرشتہ) اور ملا رفیع الدین شیرازی (مصنف تذکرۃ الملوک) اس کے دربار سے وابستہ تھے۔اس کو تعمیرات کا بھی شوق تھا۔ایک نیا شہر آباد کر کے اس کو نورس پور سے موسوم کیا۔قلعہ نورس کے نام سے تعمیر کیا۔شاہی مہر پر لفظ نورس کندہ تھا۔درباری شاعر عبدالقادر کو نورسی کا لقب دیا۔اس کے عہد کے اردو شعرا میں عبدلؔ' مقیمیؔ' صنعتیؔ وغیرہ مشہور ہیں۔ابراہیم عادل شاہ نے 1627ء میں وفات پائی۔اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمد عادل شاہ بیجاپور کا حکمران ہوا۔یہ نہایت فیاض اور رحم دل بادشاہ تھا۔خود شاعر نہ تھا لیکن علم وادب کا قدر دان اور شعرا کا سرپرست تھا۔محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطان گولکنڈہ کے فرماں روا محمد قطب شاہ کی بیٹی تھی۔ملکہ خدیجہ سلطان اور محمد عادل شاہ کی اردو نوازی کی وجہ سے اردو ادب کو فروغ حاصل ہوا۔تعلیم کی ترقی ہوئی۔تمام شہر میں مدارس کھولے گئے۔طلبہ کو وظائف دیے گئے اور صاحب علم کو فکر معاش سے بے پرواہ کیا گیا۔1656ء میں محمد

عادل شاہ کا انتقال ہوا۔

محمد عادل شاہ کے بعد اس کے بیٹے علی عادل شاہ ثانی نے انیس سال کی عمر میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔اس کو زندگی بھر سرکش امراء کی بغاوتوں' مرہٹوں اور مغلوں کی یورشوں کا سامنا کرنا پڑا اس کے باوجود دکنی زبان وادب کو فروغ حاصل ہوتا رہا۔وہ خود بھی ایک بلند پایہ شاعر تھا اور شاہیؔ تخلص کرتا تھا۔چوں کہ اس کی مادری زبان دکنی تھی اس لیے اسے دکنی سے خاص لگاؤ تھا۔علی عادل شاہ اپنے عہد کا بلند پایہ سخن ور تھا اس لیے ''استاد عالم'' کے لقب سے مشہور ہوگیا تھا۔اس کی تعمیر کی ہوئی عمارتوں میں حسینی محل' علی محل' عرش محل اور حسینی مسجد وغیرہ اہم ہیں۔اس نے صرف پینتس سال کی عمر میں 1672ء میں انتقال کیا۔اس کے انتقال کے بعد اس کا کم سن بیٹا سکندر عادل شاہ تخت نشین ہوا۔ یہ بیجا پور کا آخری حکمران تھا۔اس کے عہد میں امرا کی ناچاقیاں حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں سکندر نے مرہٹوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا تھا۔شیواجی نے بعض عادل شاہی قلعوں پر قبضہ کرلیا تو سکندر نے بہلول خاں کو اس کے مقابلہ کے لیے روانہ کیا تھا اور شیواجی کا لشکر حملے کی تاب نہ لاکر منتشر ہوگیا تھا۔آخر کار 1686ء میں اورنگ زیب نے بیجا پور کو فتح کرلیا اور سکندر عادل شاہ کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔اس طرح دوسو سالہ عادل شاہی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

عادل شاہی حکمرانوں کو رعایا کی فلاح و بہبود کا بڑا خیال تھا انہوں نے اپنی سلطنت میں بے شمار سرائیں' خانقاہیں' پل اور کنویں بنوائے۔غربا اور مساکین کے لیے لنگر خانے قائم کیے۔مشائخ اور علماء کو وظائف اور انعامات دیے جاتے تھے۔عام لوگوں کو تیار غذا دی جاتی۔عیدین' شب برات اور سالگرہ کے موقع پر شہر آراستہ کیا جاتا اور جشن منائے جاتے۔غرض کہ عادل شاہی عہد میں ملک اکثر پر امن اور رعایا اتنی خوش حال تھی کہ اس دور میں موسیقی' مصوری' نقاشی' خطاطی' تعمیرات' صنعت وحرفت' شعر وادب اور دیگر علوم وفنون کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔

10.3 عادل شاہی دور میں شعر وادب کا ارتقا

عادل شاہی دور دکنی شعر وادب کے ارتقا کے سلسلے میں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔اس دور کے شاعروں اور ادیبوں نے دکنی اردو کو مختلف ارتقائی منزلوں سے روشناس کیا۔اور مختلف اصناف شاعری جیسے غزل' مثنوی' قصیدہ' رباعی اور مرثیہ کے علاوہ نثر نگاری کی طرف بھی باقاعدہ توجہ کی۔لیکن شاعری کا پلہ نثر نگاری کے مقابلہ میں بھاری ہے۔عادل شاہی عہد کے کم وبیش تمام سلاطین علم وادب اور شعر وسخن کے قدر دان اور سرپرست تھے۔ابراہیم عادل شاہ ثانی ''جگت گرو'' اور علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ کو دیگر سلاطین کے مقابلہ میں اس لیے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ دونوں نے نہ صرف شاعروں' ادیبوں اور عالموں کی دل کھول کر سرپرستی کی بلکہ دونوں موسیقی اور فن کے دلدادہ تھے اور ساتھ ہی خود بھی شعر کہتے تھے۔اس دور کے شعرا وادبا میں شاہ برہان الدین جانمؒ' ابراہیم عادل شاہ ثانی' حسن شوقی' نصرتی' شاہی' حضرت امین الدین اعلیٰ اور ہاشمی بیجا پوری کے نام قابل ذکر ہیں۔

10.3.1 شاہ برہان الدین جانم

برہان الدین جانم حضرت شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے۔علوم ظاہری اور باطنی کا اکتساب اپنے والد سے کیا تھا۔اپنے دور کے بڑے عارف اور صوفی تھے۔انہوں نے دکنی زبان میں تصوف اور سلوک کے موضوع پر کئی رسالے تحریر کیے۔آپ معرفت وسلوک کی تعلیمات سادہ اور سلیس زبان میں اپنے مریدوں اور معتقدین کو دینا چاہتے تھے۔جانم چشتیہ سلسلے کے ان بزرگوں میں سے ہیں جن کی تصانیف نے عوام وخواص میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی تھی۔آپ کثیر التصانیف بزرگ ہیں۔انہوں نے نظم ونثر کی کئی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں ان میں ارشاد نامہ' وصیت الہادی' بشارت الذکر' سکھ سہیلا' منفعت الایمان' حجت البقا اور کلمۃ الحقائق قابل ذکر ہیں۔

ارشاد نامہ: اس کا سنہ تصنیف 990ھ ہے یہ برہان الدین جانم کی سب سے طویل نظم ہے۔اس میں تقریباً ڈھائی ہزار اشعار ہیں۔نظم کا آغاز حمد ونعت سے ہوتا ہے۔پھر اپنے پیر اور والد میراں جی شمس العشاق کی تعریف بیان کی گئی ہے۔اس کے بعد وجہ تالیف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔وجہ تالیف کے

بعد کتاب کے موضوعات کا ذکر کیا گیا ہے۔اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جو سوال و جواب کی شکل میں ہے۔سوال طالب یعنی مرید کی طرف سے اور جواب مرشد کی جانب سے۔

وصیت الہادی: یہ ایک عارفانہ نظم ہے جس میں مسائل سلوک کا ذکر کیا گیا ہے۔نظم کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا ہے اس کے بعد شریعت پر عمل کرنے اور شرک سے اجتناب کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

بشارت الذکر: یہ ایک مختصر سی نظم ہے۔اس میں حمد و نعت کے بعد پانچ ابواب ہیں۔ہر باب کے تحت ذکر جلی، قلبی، روحی، سری اور خفی پانچ اذکار کا ایک ایک کر کے ذکر کیا گیا ہے۔

سکھ سہیلا: یہ نظم دراصل ایک صوفیانہ گیت ہے جس میں 28 بند ہیں۔ہر بند میں تین مصرعوں کے بعد چوتھے مصرعے کی تکرار کی گئی ہے۔

منفعت الایمان: یہ ایک عارفانہ نظم ہے جو 120 اشعار پر مشتمل ہے۔نظم کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا ہے۔اس نظم میں خدا کی توحید اور اس کی عظمت کا بیان ہے۔

حجت البقا: جانم کی یہ ایک طویل نظم ہے۔اس میں ایک ایسے طالب علم یا مرید کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جسے اپنے علم پر غرور تھا۔اسے معلوم ہوا کہ کسی جگہ ایک مرشد کامل رہتے ہیں تو وہ انہیں دیکھنے اور ان سے گفتگو کرنے کی غرض سے ان کے ہاں پہنچا۔اس نے مرشد سے مختلف مسائل پر سوالات کیے۔مرشد نے ان کے تسلی بخش جوابات دیے۔اس نظم میں دونوں کی بحث اور سوال و جواب پیش کیے گئے ہیں۔آخر میں طالب قائل ہو جاتا ہے اور مرشد سے بیعت کر لیتا ہے۔

کلمۃ الحقائق: دکنی کا یہ ایک اہم رسالہ ہے۔ایک طویل مدت تک اسے اردو کا سب سے پہلا نثری رسالہ سمجھا جاتا رہا لیکن بعد میں تحقیق سے پتہ چلا کے اردو کا پہلا نثری رسالہ ''خیر البیان'' ہے۔جو صوبہ سرحد (پاکستان) کے ایک بڑرگ پیر روشان بایزید انصاری کی تصنیف ہے۔برہان الدین جانم کا رسالہ کلمۃ الحقائق ایک ضخیم رسالہ ہے۔اس کا موضوع تصوف اور عرفان ہے۔اس میں تصوف اور عرفان کے مسائل سوال و جواب کی شکل میں بیان کیے گئے ہیں۔

10.3.2 ابراہیم عادل شاہ ثانی

ابراہیم عادل شاہ ثانی، طہماسپ شاہ کا بیٹا اور علی عادل شاہ کا بھتیجا تھا۔علی عادل شاہ کے کوئی اولاد نہ تھی اس لیے اس کے انتقال کے بعد ابراہیم تخت نشین ہوا۔یہ عادل شاہی خاندان کا چھٹا حکمران تھا جس نے 1580ء سے 1627ء تک حکومت کی۔یہ گولکنڈہ کے پانچویں حکمران محمد قلی قطب شاہ کا ہم عصر تھا۔اسے فنون لطیفہ اور تعمیرات سے بڑی دل چسپی تھی۔اس نے علم موسیقی کی بھی سرپرستی کی۔اس کے دور میں اہل کمال کو حکومت کی جانب سے مالی امداد دی جاتی تھی۔اس کے دربار میں علما و فضلا کی بڑی توقیر ہوتی تھی۔اس کے عہد میں بیجاپور علم و ہنر کا مرکز بن گیا تھا۔اس کے علم و فضل کی وجہ سے لوگ اسے ''جگت گرو'' کہتے تھے۔اس نے بیجاپور کے مغرب میں ایک نیا شہر بسایا جس کا نام ''نورس پور'' تھا۔ابراہیم خود ایک اچھا شاعر تھا فارسی اور دکنی میں شاعری کرتا تھا۔دکنی میں گیتوں کا ایک مجموعہ ''کتاب نورس'' ملتا ہے۔اس میں مخصوص راگ راگنیوں کے مطابق گیت لکھے گئے ہیں۔ہر گیت سے پہلے راگ کا نام دیا گیا ہے۔''کتاب نورس'' کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی زبان اس عہد کے مروجہ دکنی سے مختلف ہے۔اس میں سنسکرت اور برج بھاشا وغیرہ کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔

10.3.3 حسن شوقی

شیخ حسن نام اور تخلص شوقی تھا۔حسن شوقی کا شمار قدیم دکنی کے باکمال غزل گوشعرا میں ہوتا ہے۔غزلوں کے دیوان کے علاوہ دومثنویاں ''فتح نامہ نظام شاہ'' اور ''میزبانی نامہ'' ملتی ہیں۔حسن شوقی جنگ تالی کوٹ کی فتح کے موقع پر نظام شاہی دربار سے وابستہ تھا اس سلطنت کے خاتمہ کے بعد وہ محمد عادل شاہ کے دور میں بیجاپور چلا آیا۔''میزبانی نامہ'' میں اس نے محمد عادل شاہ کی شادی کوموضوع بنایا ہے۔

حسن شوقی ایک مثنوی نگاراور بلند پایہ غزل گوتھا۔''فتح نامہ نظام شاہ'' دکنی اردو کی ایک قدیم مثنوی ہے جو چھ سوبیس اشعار پر مشتمل ہے۔یہ اردو کی پہلی رزمیہ مثنوی ہے۔اس میں نظام شاہ کو قصے کے ہیرو کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے جنگ تالی کوٹ کی فتح کا سہرا اسی کے سر باندھا ہے۔اس مثنوی میں حسین نظام شاہ کے دربار، جنگی مناظر اور میدان کارزار کے ایسے مرقعے پیش کیے ہیں کہ واقعات آنکھوں کے سامنے متحرک نظر آتے ہیں۔

''میزبانی نامہ'' میں محمد عادل شاہ کی اس شادی کوموضوع بنایا ہے جونواب مظفر خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی۔اس مثنوی میں حسن شوقی نے جہاں محمد عادل شاہ کی دوسری خوبیاں بیان کی ہیں وہیں اس کی سخن فہمی اور سخن پروری کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔''میزبانی نامہ'' میں حسن شوقی نے محمد عادل شاہ کے عہد کی بیجاپوری ثقافت کی اچھی مرقع کشی کی ہے۔اس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں شادی بیاہ کی رسومات کس اہتمام اور توجہ کے ساتھ انجام دی جاتی تھیں۔محلات کی سجاوٹ، فرش کی صفائی، حوض، فوارے، عطریات، روشنی کے اہتمام، لباس و زیورات اور سامان عیش وعشرت کی بڑی متحرک تصویریں اس مثنوی میں پیش کی گئی ہیں۔شادی کی رسومات، شہرگشت، کی تیاری اور پھراس کی دھوم دھام، سواریوں کی آن بان، سپاہیوں کا دبدبا، جلوس کی رونق، بادشاہ اور مقربوں کے زرق برق لباس، آتشبازی کے پرنور نظارے، موسیقی کی دلفریبی، رقاصہ کی ہوش ربا ادائیں، کنیزوں کی خوش پوشاکی، زروجواہر کی ریل پیل اور عادل شاہی محلات کے پورے ماحول کی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ عکاسی کی گئی ہے۔آخر میں دلہا کے لیے دعا پر میزبانی نامہ کوختم کیا گیا ہے۔اپنے موضوع کے ساتھ حسن شوقی نے اس خوبی کے ساتھ انصاف کیا ہے کہ ان کا فن اس مثنوی میں اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔شادی کی تقریب پر لکھی ہوئی اس مثنوی کی پوری فضا پر ایک طربیہ اثر چھایا ہوا ہے۔شاعر کا پرجوش لب ولہجہ، مناسب وموزوں لفظیات، محاکات اور بدلتی ہوئی تصویروں نے میزبانی نامہ کوایک بھرپور شادی نامہ بنادیا ہے۔ایک گزرے ہوئے زمانہ کی سماجی اور ثقافتی زندگی کی آئینہ داری نے اس مثنوی کواہم بنادیا ہے۔

حسن شوقی ایک باکمال مثنوی نگار کے علاوہ بلند پایہ غزل گوبھی تھا۔بہ حیثیت ایک غزل گو دکنی اردو کے شاعروں میں اسے سب سے زیادہ اہمیت وافضلیت حاصل ہے۔

10.3.4 علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ

مملکت بیجاپور کا آٹھواں فرماں روا سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہیؔ نہ صرف ایک عظیم الشان سلطنت کا حکمران تھا بلکہ قدیم دکنی زبان کا ایک صاحب دیوان شاعر اور سلطان محمد عادل شاہ کا اکلوتا بیٹا بھی تھا۔اس کی ماں ایک معمولی عورت تھی۔لیکن محمد عادل شاہ کی ملکہ خدیجہ سلطان شہر بانو نے جو محمد قطب شاہ کی دختر اور عبداللہ قطب شاہ کی بہن تھی اس کی پرورش اور تربیت اپنی اولاد کی طرح کی۔یہی وجہ ہے کہ شاہی کو بچپن ہی سے علم وادب اور شعروسخن کا ذوق تھا۔اس نے کم وبیش تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔اس کے کلیات میں غزلوں کے علاوہ، قصیدوں اور مثنویوں کے علاوہ گیت، دوہرے اور جھولنا ملتے ہیں۔جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے شاہیؔ دبستان بیجاپور کے اہم متغزلین میں شمار ہوتا ہے۔علی عادل شاہ ثانی شاہی نے محمد قلی قطب شاہ کی طرح ایک سے زائد تخلص استعمال کیے ہیں۔گیت کی رنگین اور شگفتہ صنف میں اس نے موضوع اور فضا کی مناسبت سے مدنؔ روپ تخلص سے بھی کام لیا ہے۔مراثی اور غزل میں کہیں علی عادل شاہ اور مظفر علی شاہ تخلص بھی ملتا ہے۔شاہی کے کلام میں قصائد کے علاوہ مراثی، فردیات، نظمیں، رباعی، گیت اور مثنویاں سب ہی اصناف سخن موجود ہیں۔شاہیؔ کے کلام میں مقامی تہذیبی روایات اور مقامی ماحول کی بھرپور ترجمانی ملتی ہے۔اس نے اپنے تجربات زندگی،

مشاہدات اور احساسات کو سادگی اور روانی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

10.3.5 نصرتی

شیخ نصرت نصرتی سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہی کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔نصرتی کا خاندانی پیشہ سپہ گری تھا۔نصرتی علی عادل شاہ شاہی کے بچپن کا ساتھی تھا اس لیے بادشاہ کے مزاج میں بھی دخیل تھا۔اس کے کلام کی اندرونی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ نصرتی کا خاندان دکن آ کر آباد ہو گیا تھا شائد اسی لیے مقامی لوگ اس کے خاندان کو باہر کا خاندان کہتے اور اس سے حسد کرتے تھے۔بالآخر اسے شہید کر دیا۔

نصرتی کی تین مثنویاں گلشن عشق، علی نامہ اور تاریخ اسکندری کے علاوہ غزلوں، قصائد اور رباعیوں پر مشتمل ایک دیوان ملتا ہے۔مثنوی گلشن عشق نصرتی کی اولین تصنیف ہے۔اس کا سنہ تصنیف 1068ھ ہے۔اس میں نصرتی نے کنور منوہر اور مدمالتی کی عشقیہ داستان نظم کی ہے۔مثنوی کو مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے جیسے حمد، نعت، منقبت، مدح گیسو دراز، مدح بادشاہ وغیرہ۔ان تفصیلات کے بعد اصل کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ہر باب کے شروع میں نصرتی نے ایک شعر لکھا ہے۔عنوانات کے سارے اشعار ایک ہی بحر اور قافیے میں ہیں اگر ان اشعار کو یکجا کر لیا جائے تو مثنوی کے قصے کا خلاصہ سامنے آتا ہے۔

نصرتی کی دوسری تصنیف ''علی نامہ'' ہے۔یہ ایک رزمیہ مثنوی ہے جو 1076ھ میں لکھی گئی اس میں ان جنگی مہمات کا ذکر ہے جو سلطان علی عادل شاہ ثانی کو شیواجی مرہٹہ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے اور مغلوں کے حملوں کی مدافعت میں پیش آئی تھیں۔اس مثنوی میں تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔اس میں بعض ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جنھیں بیان کرنے سے تاریخ بھی قاصر ہے۔اس طرح یہ مثنوی مورخوں کے لیے ایک اہم تاریخی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔اس مثنوی میں نصرتی کے چھ بلند پایہ قصیدے بھی شامل ہیں۔

نصرتی کی تیسری مثنوی ''تاریخ اسکندری'' بھی ایک رزمیہ مثنوی ہے۔اس کا سنہ تصنیف 1083ھ ہے۔اس مثنوی میں نصرتی نے عادل شاہی سپہ سالار بہلول خاں اور شیواجی کے درمیان لڑی گئی جنگ کو موضوع بنایا ہے جس میں شیواجی کو شکست اور بہلول خاں کو فتح نصیب ہوئی تھی۔مثنوی اور قصیدے کے علاوہ نصرتی غزل اور رباعی میں بھی اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔

10.3.6 ہاشمی بیجاپوری

سید میراں میاں خاں ہاشمی علی عادل شاہ ثانی کا درباری شاعر تھا وہ مہدوی مذہب کا پیرو تھا اور سید شاہ ہاشمی کا مرید تھا۔مورخوں کا بیان ہے کہ وہ پیدائشی نابینا تھا۔بیجاپور کے زوال کے بعد اس نے ارکاٹ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ہاشمی ایک قادرالکلام اور پرگو شاعر تھا۔اس نے غزل، ریختی، قصیدہ اور مرثیے میں طبع آزمائی کی تھی۔ہاشمی کی تصانیف میں دیوان غزلیات کے علاوہ مثنوی ''یوسف زلیخا''، مثنوی عشقیہ، معراج نامہ، مخمس در نعت و مدح مہدی جونپوری، قصائد اور ہجویہ مثنوی شامل ہیں۔

مثنوی ''یوسف زلیخا'' ہاشمی کی سب سے ضخیم مثنوی ہے۔اس کا سنہ تصنیف 1099ھ ہے۔یہ مثنوی ہاشمی نے اپنے مرشد کی فرمائش پر قلم بند کی ہے۔ہاشمی نے اس میں یوسف زلیخا کے روایتی قصے کو نظم کیا ہے۔مثنوی مختلف فصلوں میں تقسیم کی گئی ہے۔فصلوں کے عنوانات اشعار میں ہیں جنھیں یکجا کرنے سے مربوط نظم بن جاتی ہے۔اس مثنوی کا بنیادی وصف اس کی سادگی اور سلاست ہے۔مثنوی یوسف زلیخا کو بیجاپور کی مثنویوں میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں اپنے عہد کے سماجی مظاہر کی بڑی اچھی ترجمانی کی گئی ہے۔اس زمانے کے مختلف قسم کے پکوان، مشروبات، رہن سہن کے طریقے، لباس، زیورات اور آداب محفل کو ہاشمی نے اپنی اس مثنوی میں محفوظ کر دیا ہے۔

''مثنوی عشقیہ'' ہاشمی کی دوسری اہم مثنوی ہے۔اس میں کشمیر کی شہزادی اور ایک معمولی نوجوان کے عشق کی المیہ داستان اور ایک بقال زادے

سے شیخ سعدی کی محبت کے قصے کو باہم مربوط کر کے پیش کیا ہے۔

''معراج نامہ'' میں ہاشمی نے معراج کے واقعات کو موضوع بنایا ہے۔ یہ ایک عوامی انداز کی مثنوی ہے جو محفلوں میں پڑھ کر سنانے کی غرض سے لکھی گئی ہے۔

ہاشمی کا دیوان ڈاکٹر حفیظ قتیل نے مرتب کر کے 1961ئمیں شائع کیا ہے۔ ہاشمی کے دیوان میں ریختی کے انداز کی غزلوں کے علاوہ مسلسل ریختیاں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ اسے ریختی کا پہلا صاحب دیوان شاعر کہا جا سکتا ہے۔ اس نے عورتوں کے جذبات کو عورتوں کی زبان میں اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ اس کے اشعار میں دکنی عورتوں کی آواز اور ان کا لب ولہجہ صاف سنائی دیتا ہے۔

ہاشمی نے دو قصیدے بھی لکھے تھے جو ذوالفقار خاں صوبے دار ارکاٹ کی مدح میں ہیں۔ ایک مختصر مثنوی ''ابیات ہندی تصنیف ہاشمی'' کے عنوان سے ہے۔ یہ ایک ہجو یہ مثنوی ہے جس میں شاہ داول کی مذمت کی گئی ہے اور عورتوں کو نصیحت کی باتیں بتائی گئی ہیں۔

عادل شاہی دور کے شاعروں نے اگر چہ قصیدہ، غزل، رباعی اور مرثیہ کی صنف پر بھی توجہ دی ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی مثنوی کی صنف ہی تمام اصناف سخن پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ عادل شاہی دور میں شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کی طرف بھی توجہ کی گئی لیکن نثر نگاری کے مقابلے میں شاعری کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔ چوں کہ اس دور کی کم وبیش تمام نثری تصانیف صوفیائے کرام کی نگارشات ہیں اس لیے ان پر مذہب کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ نثری تصانیف میں برہان الدین جانم کا نثری رسالہ کلمۃ الحقائق اسی دور میں لکھا گیا۔ نثر کی روایت کو آگے بڑھانے میں جانم کے خلیفہ شیخ محمود خوش دہاں اور امین الدین اعلیٰ کے نثری رسائل نے بھی اہم خدمت انجام دی۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ کلمۃ الحقاق کے مصنف کون ہیں؟

2۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی مشہور تصنیف کون سی ہے؟

3۔ حسن شوقی کی مثنویوں کے نام بتایئے۔

4۔ نصرتی کی تصانیف کے نام بتایئے۔

5۔ مثنوی یوسف زلیخا کے مصنف کون ہیں؟

10.4 خلاصہ

عادل شاہی دور دکن کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ 895ھ سے 1098ھ تک اس خاندان کے نو حکمرانوں نے مملکت بیجاپور پر نہایت شان وشوکت کے ساتھ حکومت کی۔ عادل شاہی حکمران علم وادب اور فنون لطیفہ کے شائق تھے۔ انہوں نے علما، فضلا، شعرا، ادبا اور اہل ہنر کی قدر دانی اور سرپرستی کی۔ عادل شاہی حکومت میں دکنی زبان اور شعر وادب کو بے مثال ترقی حاصل ہوئی۔ حسن شوقی، شاہی، نصرتی اور ہاشمی اس دور کے نمائندہ شعرا ہیں جنھوں نے مختلف اصناف سخن میں اپنی شعری صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ شاہی کے علاوہ دیگر شعرا نے مثنوی نگاری میں اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن شاہی نے غزل گوئی اور قصیدہ نگاری میں اپنا لوہا منوایا ہے۔ حسن شوقی کی مثنوی میزبانی نامہ، فتح نامہ نظام شاہ، نصرتی کی گلشن عشق اور علی نامہ، ہاشمی کی یوسف زلیخا نہ صرف دبستان بیجاپور کی شاہ کار مثنویوں میں شمار ہوتی ہیں بلکہ اردو مثنوی کی تاریخ میں بھی اہم مقام کی مستحق ہیں۔

10.5 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

1۔ عادل شاہی دور کے سماجی اور تہذیبی پس منظر کے بارے میں لکھیے۔

2۔ عادل شاہی عہد کے شعر وادب کا جائزہ لیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

1۔ برہان الدین جانم کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

2۔ کسی دو شاعروں پر مختصر نوٹ لکھیے۔

1۔حسن شوقی 2۔شاہی 3۔نصرتی 4۔ہاشمی

10.6 فرہنگ

الفاظ	معنی
خودمختار	آزاد، بااختیار
ثقافت	تہذیب، کلچر
مستحکم	مضبوط
بہرہ مند	فائدہ اٹھانے والا
صناعی	ہنرمندی، کاریگری
دقیقہ اٹھا نہ رکھنا	کسر نہ چھوڑنا
فرماں روا	حاکم، بادشاہ
ناچاقیاں	ان بن، بگاڑ
باکمال	کمال رکھنے والا
رزمیہ	جنگی داستان یا نظم
مورخ	تاریخ لکھنے والا
ریختی	وہ شاعری جو عورتوں کی زبان میں کی جائے

10.7 سفارش کردہ کتابیں

1۔ تاریخ ادب اردو (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی
2۔ دکن میں اردو	نصیرالدین ہاشمی
3۔ دکنی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محی الدین قادری زور
4۔ تاریخ ادب اردو 1700ء تک (جلد دوم، سوم)	پروفیسر سیدہ جعفر و پروفیسر گیان چند جین
5۔ دکنی کی تین مثنویاں	پروفیسر محمد علی اثر

اکائی 11 قطب شاہی دور میں اردو ادب

اکائی کے اجزا

11.0 مقصد

11.1 تمہید

11.2 قطب شاہی دور کا سماجی اور تمدنی پس منظر

11.3 قطب شاہی دور میں شعر و ادب کا ارتقا

11.3.1 محمد قلی قطب شاہ

11.3.2 اسد اللہ وجہی

11.3.3 ملک الشعرا غواصی

11.3.4 ابن نشاطی

11.4 خلاصہ

11.5 نمونۂ امتحانی سوالات

11.6 فرہنگ

11.7 سفارش کردہ کتابیں

11.0 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبا کو قطب شاہی دور میں اردو ادب سے متعلق معلومات فراہم کرنا ہے۔ اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ

☆ قطب شاہی دور کے سماجی اور تمدنی پس منظر کا جائزہ لیں۔

☆ اس دور کے اہم شعرا اور نثر نگاروں کی خدمات پر روشنی ڈالیں۔

11.1 تمہید

اردو ادب کی تاریخ میں قطب شاہی دور کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اس سلطنت کے تمام حکمران علم و ادب کے دل دادہ اور شاعروں اور فن

کاروں کے قدر دان تھے۔اور بیشتر سلاطین جیسے جمشید قلی، محمد قلی، محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ خود بھی شعر کہتے تھے۔سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد کو دکنی ادب کی تاریخ کا عہد زریں کہا جا سکتا ہے۔محمد قلی قطب شاہ ایک پرگو اور قادرالکلام شاعر تھا۔اس کے دور کے اہم شعرا میں وجہی، غواصی اور ابن نشاطی کے نام اہم ہیں۔

11.2 قطب شاہی دور کا سماجی اور تمدنی پس منظر

بہمنی سلطنت کے خاتمے کے بعد دکن میں جو پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں ان میں سلطنت گولکنڈہ کو اس کے محل وقوع، خوش گوار آب و ہوا، سیاسی استحکام، معدنی دولت، تہذیب و شائستگی، فنون لطیفہ کے فروغ اور علم و ہنر کی سرپرستی کی وجہ سے ممتاز مقام حاصل ہے۔قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان محمد قلی کے آباو اجداد ترکستان کے رہنے والے تھے۔اس خاندان کے بعض افراد ترکستان سے ایران اور پھر ہندوستان منتقل ہو گئے تھے۔سلطان محمد قلی بہمنی خاندان کے فرماں روا محمد شاہ بہمنی کے زمانے میں بیدر آیا اور دربار شاہی میں ملازمت اختیار کر لی۔سلطان قلی نے اپنی علمی اور انتظامی صلاحیتوں کی بدولت بڑی ترقی کی۔1496ء میں اس کو تلنگانہ کا گورنر بنایا گیا۔اپنی گورنری کے زمانے میں اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے اس نے تلنگانہ کے عوام میں کافی مقبولیت حاصل کی۔جب بہمنی سلطنت کو زوال ہوا تو اس نے 1518ء میں اپنی خودمختاری کا اعلان کیا اور سلطان قلی قطب شاہ کے نام سے قطب شاہی سلطنت کی بنیاد رکھی۔سلطان قلی کو بڑھاپے میں اس کے بیٹے جمشید قلی نے قتل کروایا اور جمشید قطب شاہ کے نام سے (1543ء-1550ء) تخت نشین ہوا۔جمشید کی موت پر سلطان قلی کا چھوٹا بیٹا ابراہیم قطب شاہ (1550ء) تخت نشین ہوا۔ابراہیم کے عہد میں گولکنڈہ کو بڑا استحکام حاصل ہوا۔اس نے نظم و نسق میں مفید اصلاحیں کیں۔اس کے دور میں دکنی کلچر کا خمیر اٹھا اور ایک گنگا جمنی تہذیب کی بنیاد پڑی۔ابراہیم نے ہندوستان اور ایران کی تہذیبوں کے امتزاج سے ایک ایسے نئے کلچر کی تعمیر و تشکیل کی جو مقامی عناصر اور عجمی تصورات کا خوب صورت امتزاج تھا۔ابراہیم کی زندگی کا ایک بڑا حصہ چوں کہ ایک تلگو ریاست وجیانگر میں بسر ہوا تھا اس لیے اس کے مزاج میں مملکت میں بسنے والے مختلف طبقات کے تعلق سے مروت اور رواداری کے جذبات موجود تھے۔یہی وجہ ہے کہ ابراہیم قلی قطب کے عہد میں تلنگانہ میں بسنے والے مختلف طبقات کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔

ابراہیم قلی کو فارسی اور اردو کے ساتھ ساتھ تلگو زبان سے بھی دل چسپی تھی۔تلگو شاعروں میں وہ بالعموم ''ملک برام'' کے نام سے مشہور تھا۔اس نے اپنے عہد حکومت میں علم و ہنر اور شعر و ادب کی ترقی اور فروغ سے دل چسپی لی اور گولکنڈے میں ایک ایسا ماحول پیدا کیا جو بعد میں بھی علم و ادب کی ترقی کے لیے سازگار ثابت ہوا۔ابراہیم کے عہد میں بادشاہ کی علم دوستی کا چرچا سن کر احمد نگر، گجرات اور بیدر سے بہت سے شعرا اور اہل علم و حرفہ نے گولکنڈہ کا رخ کیا اور یہیں کے ہو رہے تھے۔قطب شاہی دور کے اولین شعرا فیروز، محمود اور ملا خیالی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

ابراہیم کے انتقال کے بعد محمد قلی قطب شاہ 1580ء میں تخت نشین ہوا۔اس کا دور حکومت گولکنڈے کا عہد زریں ہے۔وہ خود ایک صاحب دیوان اور بلند پایہ شاعر تھا۔اس نے غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی اور ریختی وغیرہ میں طبع آزمائی کر کے اپنی شاعرانہ عظمت کا لوہا منوایا تھا۔محمد قلی کو فن تعمیر، شاعری، موسیقی، نقاشی، خطاطی اور مصوری سے غیر معمولی شغف تھا۔اس نے جب شہر حیدرآباد بسایا تو تعمیر کاری، تزئین و آرائش اور دولت و ثروت کے اعتبار سے اسے ایک بے مثل شہر بنایا۔شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کی قدر افزائی اور سرپرستی کرنے میں اس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی جس کی وجہ سے اس وقت کے مشہور علما، شعرا اور ادیب اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔گجرات کے مشہور شاعر شیخ احمد گجراتی اسی کے دور میں گولکنڈہ آئے تھے۔اسداللہ وجہی اسی کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔

محمد قلی کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد قطب شاہ 1611ء میں گولکنڈے کے تخت پر متمکن ہوا۔وہ بڑا علم دوست حکمران تھا محمد قلی کے دیوان پر اس کا منظوم دیباچہ اس کے کلام کا واحد نمونہ ہے۔محمد قطب شاہ ایک خدا پرست اور دین دار بادشاہ تھا اس لیے اس کے دور میں مذہبی امور

کی طرف زیادہ توجہ کی گئی۔اسی نے حیدرآباد کی تاریخی مسجد'' مکہ مسجد'' کی بنیاد رکھی۔اسے کتابیں جمع کرنے اوران پر اپنی رائے تحریر کرنے یا دستخط ثبت کرنے کا شوق تھا۔اس نے اپنے چچا محمد قلی قطب شاہ کے کلیات کو مرتب کر کے اس پر ایک منظوم مقدمہ بھی تحریر کیا تھا۔

سلطان محمد قطب شاہ کے انتقال کے بعد اس کا فرزند عبداللہ قطب شاہ 1626ء میں گولکنڈہ کا حکمران بنا۔اس کا عہد حکومت (1626ء تا1672ء)سب سے طویل تھا۔اس کے عہد میں گولکنڈے کی تہذیبی سرگرمیوں کا دوبارہ احیا ہوا جو شعرا اور فن کار سلطان محمد قطب شاہ کے دور میں گوشہ نشین ہو گئے تھے وہ پھر منظر عام پر آ گئے۔عبداللہ قطب شاہ کے مزاج اور کردار میں اپنے نانا محمد قلی قطب شاہ سے بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی تھی۔غواصی نے لکھا ہے کہ عبداللہ قطب شاہ کے تخت نشین ہونے سے ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا محمد قلی دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کی وفات کے بعد اس کا داماد ابوالحسن تانا شاہ 1672ء میں گولکنڈہ کا آخری تاجدار بنا۔تانا شاہ کا دور اگر چہ گولکنڈہ کے زوال کا دور ہے لیکن شعر وادب کی ترقی کے سلسلہ میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔بادشاہ خود بھی شعر کہتا تھا اور اپنے دور کے شاعروں اور ادیبوں کا سرپرست تھا۔فائز، طبعی اور عابد شاہ حسینی اسی دور کے شاعر وادیب ہیں۔بالآخر سقوط گولکنڈہ نے اردو ادب کے ایک زریں دور اور ایک دبستان کا خاتمہ کر دیا۔

11.3 قطب شاہی دور میں شعر وادب کا ارتقا

قطب شاہی دور کے اولین شاعروں میں فیروز، محمود اور خیالی کے نام ملتے ہیں۔یہ تینوں شعرا ابراہیم قطب شاہ کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ قطب الدین فیروز دراصل بیدر کا باشندہ تھا اور بعد میں گولکنڈہ چلا آیا تھا۔فیروز کے تفصیلی حالات نہیں ملتے۔مگر اس کی شاعری کی عظمت اور استادی کا اعتراف گولکنڈے کے شعرا وجہی اور ابن نشاطی نے کیا ہے۔اس کی تصانیف میں ایک مختصر مثنوی ''پرت نامہ'' کے علاوہ چند غزلوں کا پتہ چلتا ہے۔فیروز کی گولکنڈہ میں آمد وہی حیثیت رکھتی ہے جیسے کہ بعد کے زمانہ میں ولی کی دہلی میں۔

فیروز کی طرح سید محمود اور ملا خیالی بھی قطب شاہی دور کے اولین شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔وجہی، محمد قلی اور ابن نشاطی نے انھیں عظیم المرتبت شاعر اور استاد سخن کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔محمود کے کلام کا ایک مخطوطہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔اس کے علاوہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''تاریخ ادب اردو'' (جلد اول) میں محمود کی چند غزلیں اور بعض غزلوں کے منتخب اشعار شائع کیے ہیں۔ملا خیالی کی صرف ایک ہی غزل دستیاب ہوئی ہے۔

11.3.1 محمد قلی قطب شاہ

گولکنڈے کا پانچواں حکمران محمد قلی قطب شاہ 1580ء میں تخت نشین ہوا۔اس نے شہر حیدرآباد بسایا اور اس شہر میں بسنے والے مختلف طبقوں کے درمیان خلوص اور بھائی چارگی کے جذبات کی ترویج کی۔محمد قلی قطب شاہ کو ایک مستحکم اور طاقتور حکومت اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی۔اس کا دور حکومت مجموعی طور پر امن وامان میں گزرا۔اس کے دور میں ایران کے مشہور عالم اور مدبر میر مومن حیدرآباد میں تھے جنھیں اس نے اپنا مشیر مقرر کیا تھا سلطنت کے بیشتر کاروبار کی نگرانی میر مومن ہی کے سپرد تھی۔یہی وجہ ہے کہ محمد قلی کو سیاسی اور انتظامی الجھنوں سے آزاد رہ کر بڑی حد تک عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کا موقع مل گیا۔

محمد قلی قطب شاہ دکنی اردو کا ایک قادر الکلام شاعر تھا۔موجودہ معلومات کی روشنی میں محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔اس کا دیوان پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے جس کو اس کے بھتیجے اور داماد سلطان محمد قطب شاہ نے مرتب کر کے اس پر ایک منظوم مقدمہ بھی تحریر کیا تھا۔اس کے دیوان میں غزلیں، قصیدے، مثنویاں، مرثیے، نظمیں، رباعیاں تقریباً سبھی اصناف سخن موجود ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کا شاعر ہے۔محمد قلی کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت سادگی، بیان ہے۔اس نے اپنے جذبات، احساسات اور تجربات زندگی کو سادگی، روانی اور حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کیا

ہے۔محمد قلی کی شاعری گویا اس کی زندگی کا آئینہ ہے جس میں اس کے واقعاتِ حیات کی متحرک تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔وہ ایک کثیرالمحبوب شاعر تھا۔مورخوں کا بیان ہے کہ بیسیوں ملکوں کی حسینائیں اس کے محل میں جمع تھیں۔محمد قلی نے انہیں مختلف نام بھی دیے تھے اور ان میں سے بعض محبوب حسیناؤں کا ذکر تفصیل سے اپنے کلام میں بھی کیا ہے۔محمد قلی کے کلام میں درد وغم اور ہجر وفراق کی کیفیات کی ترجمانی نہیں ملتی۔اس اعتبار سے وہ اردو کا ایک منفرد شاعر ہے جس کے کلام میں ہر جگہ آسودگی اور وصال کی کیفیات کی تصویریں ملتی ہیں۔

محمد قلی کی شاعری اپنے عہد کے تہذیبی عناصر کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے۔اس نے اپنے دور کے لباس، زیورات، طرز معاشرت اور ثقافت سے متعلق جو معلومات اپنے اشعار میں پیش کی ہیں وہ ہماری تہذیب کے بیش بہا خزانے ہیں جنھیں اشعار کی صورت میں محمد قلی نے ہمیشہ کے لیے تاریخ و ثقافت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔اس نے اپنی شاعری میں اپنے محلوں کا ذکر بھی کیا ہے اپنے ہاتھی گھوڑے پر بھی نظمیں کہی ہیں۔شادی بیاہ کے رسوم ورواج، عیدوں، تہواروں، موسموں کھیلوں وغیرہ کی تفصیلات کو بھی اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔یہ ساری تقاریب خواہ مذہبی نوعیت کی ہوں یا موسمی تہواروں کی، محمد قلی کے لیے عیش وعشرت کے ایک تازہ عنوان کی حیثیت رکھتی تھیں اور وہ خدا کا شکر کرتا ہے کہ نبیؐ اور علیؑ کے صدقے سے دن رات عیش کرنے کے مواقع حاصل ہیں۔

محمد قلی کا کلام اس کی حب الوطنی اور قوم پرستی کا بھی مظہر ہے۔اس نے دکن کے ذرے ذرے سے محبت کی۔اس سرزمین کے موسموں، پہاڑوں اور دریاؤں اور یہاں کے شب وروز سے اسے والہانہ وابستگی تھی۔ہندوستانی معاشرت، ہندوستانی طرز زندگی، یہاں کے رسم ورواج اور ثقافتی میلانات محمد قلی کے طرز فکر میں اتنے رچ بس گئے تھے کہ جگہ جگہ یہ عناصر اپنا پرتو دکھاتے ہیں۔

11.3.2 اسداللہ وجہی

اسداللہ وجہی قطب شاہی دور کا ایک عظیم المرتبت شاعر اور باکمال نثر نگار ہی نہیں بلکہ اپنے عہد کا ایک بلند پایہ عالم اور فلسفی بھی تھا۔اس کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا پتہ نہیں چلتا۔غالباً وہ گولکنڈہ کے چوتھے حکمران ابراہیم قطب شاہ کے عہد (1550ء۔1580ء) میں پیدا ہوا اور پھر اس نے مزید تین قطب شاہی سلاطین محمد قلی قطب شاہ (1580ء۔1611ء)، محمد قطب شاہ (1611ء۔1626ء) اور عبداللہ قطب شاہ (1626ء۔1674ء) کا زمانہ بھی دیکھا۔وجہی نے مثنوی قطب مشتری، تاج الحقائق، سب رس اور فارسی دیوان کے علاوہ چند غزلیں اور مرثیے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ اسے بے حد عزیز رکھتا تھا اس نے وجہی کو اپنے دربار کا ''ملک الشعرا'' مقرر کیا تھا۔اس دور میں وجہی کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔وہ بادشاہ وقت کا دست راست بن گیا تھا۔اسی دور میں اس نے اپنی شاہ کار مثنوی ''قطب مشتری'' (1018ھ م1609ء) لکھی۔یہ وجہی کی طبع زاد مثنوی ہے۔اس مثنوی کو وجہی نے صرف بارہ دن میں مکمل کیا۔اس کا موضوع قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کی داستان عشق ہے۔مثنوی کا آغاز حمد، مناجات اور نعت ومنقبت سے ہوتا ہے۔اس کے بعد مدح بادشاہ ہے پھر وجہی نے ''در شرح گوید'' کے تحت شاعری سے متعلق اپنے نظریات پیش کیے ہیں جس سے اس کے تنقیدی تصورات کی عکاسی ہوتی ہے۔اس مثنوی کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے کم وبیش تمام کرداروں کے نام محمد قلی قطب شاہ کے خاندانی نام ''قطب'' کی مناسبت سے ستاروں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔جیسے مشتری، عطارد، زہرہ، مریخ وغیرہ۔وجہی کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔اس مثنوی میں وجہی نے انسانی جذبات کی تصویر کشی، کردار نگاری اور منظر نگاری کے دل کش مرقع پیش کیے ہیں۔قطب مشتری میں مثنوی کے درمیان وجہی نے رباعیاں اور غزلیں بھی کہی ہیں اور یہ رباعیاں اور غزلیں متن کے جزو کی حیثیت رکھتی ہیں۔

وجہی صرف ایک باکمال شاعر ہی نہیں بلکہ اپنے دور کا ایک بلند پایہ نثر نگار بھی تھا۔وجہی کی نثری تصنیف ''سب رس'' ہے۔اس کتاب کو وجہی نے عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر 1045ھ م1635ء میں لکھا تھا۔اس کتاب کی وجہ سے وجہی کو شہرت اور عظمت حاصل ہوئی۔''سب رس'' کو نہ صرف دکنی

زبان میں بلکہ سارے اردو ادب میں پہلا ادبی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔حالاں کہ ''سب رس'' سے پہلے دکنی زبان میں نثری رسالے ملتے ہیں لیکن ان کی حیثیت ادبی نہیں بلکہ مذہبی ہے۔''سب رس'' وہ پہلی نثری کتاب ہے جو عشقیہ قصے پر مبنی ہے اور ادبی معیارات پر پوری اترتی ہے۔''سب رس'' کا قصہ محمد یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کی فارسی نثری تصنیف ''قصہ حسن و دل'' سے ماخوذ ہے۔وجہی نے اپنی بے پناہ علمی اور تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کتاب کو ایک تخلیقی تصنیف کا درجہ دے دیا ہے۔اس کا اسلوب مقفیٰ ہوتے ہوئے بھی سادہ و پرکار ہے۔قصے کے دل چسپ عناصر، اس کی ادبی اور تخلیقی نثر، وجہی کا زور بیان اور اس کی انشا پردازی کے سبب یہ کتاب اردو نثر کے لازوال نمونوں میں شمار ہوتی ہے۔

''سب رس'' ایک تمثیلی قصہ ہے جس میں انسانی جذبات و احساسات اور انسانی صلاحیتوں اور قوتوں جیسے عشق، عقل، حسن، غمزہ، عشوہ، ناز، ناموس، ہمت، دل، نظر، خیال، وہم، صبر، وفا وغیرہ کو کرداروں کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔یہ قصہ دو سطحوں پر آگے بڑھتا ہے۔ایک سطح ظاہری کہانی کا انداز لیے ہوئے ہے اور دوسری سطح علم باطنی سے متعلق ہے۔

''سب رس'' کا قصہ ظاہری سطح پر آب حیات کی تلاش اور حسن و عشق کا بیان ہے۔مغرب میں سیستان نام کے ایک شہر میں بادشاہ عقل کی حکومت تھی۔اس بادشاہ کا ایک بیٹا تھا جس کا نام دل تھا جو لیاقت، ہنرمندی، بہادری، عقل مندی اور حسن و جمال میں بے مثال تھا۔بادشاہ عقل نے اپنے شہزادہ دل کو شہرتن کی حکومت عطا کی تھی۔شہزادہ دل کو آب حیات کی تلاش تھی۔اس کا دوست نظر اپنے دوست کی خاطر آب حیات کی تلاش میں نکلتا ہے۔بالآخر اسے پتہ چلتا ہے کہ آب حیات شہزادی حسن کے شہر دیدار کے باغ رخسار کے چشمۂ دہن میں ہے۔نظر کسی نہ کسی طرح شہزادی حسن تک پہنچ جاتا ہے اور وہاں معلوم ہوتا ہے کہ شہزادی حسن ایک ہیرے پر کندہ تصویر پر فدا ہے۔اتفاق سے وہ تصویر شہزادہ دل کی ہوتی ہے۔جب شہزادی حسن کو نظر سے شہزادہ دل کے بارے میں معلوم ہوتا ہے تو وہ نظر سے درخواست کرتی ہے کہ کسی بھی طرح وہ شہزادہ دل کو شہر دیدار لے آئے۔

یہاں سے قصہ آب حیات کی تلاش کے بجائے حسن و عشق کے بیان تک محدود ہو جاتا ہے۔نظر مملکت تن پہنچ کر شہزادہ کو نہ صرف آب حیات کی خوش خبری سناتا ہے بلکہ شہزادی حسن کی تعریف کچھ اس طرح کرتا ہے کہ دل شہزادی حسن کو دیکھے بغیر ہی اس پر عاشق ہو جاتا ہے اور شہزادی حسن سے ملنے شہر دیدار چلنے تیار ہو جاتا ہے۔جب بادشاہ عشق کو اطلاع ملتی ہے تو وہ شہزادہ دل کو گرفتار کرنے کے لیے لشکر بھیجتا ہے۔شہزادہ دل گرفتار ہو کر شہزادی حسن کے پاس لایا جاتا ہے اور بادشاہ عشق کے حکم سے قید کر دیا جاتا ہے۔شہزادہ دل اور شہزادی حسن دونوں کی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔رقیب کی بیٹی غیر کی سازش کی وجہ سے حسن اور دل میں غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اور رقیب شہزادہ کو اپنے قید خانے ہجراں میں قید کر دیتا ہے۔لیکن جب حسن کو حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ شہزادہ دل بے قصور ہے تب وہ بہت پچھتاتی ہے۔ادھر عقل کے وزیر قامت کے ذریعے شہنشاہ عشق اور بادشاہ عقل میں صلح ہو جاتی ہے۔حسن کی درخواست پر بادشاہ عشق اپنی فوج بھیج کر شہزادہ دل کو رقیب کی قید سے نجات دلاتا ہے اور حسن اور دل کی شادی ہو جاتی ہے۔

ظاہری طور پر تو یہ حسن و عشق کا بیان ہے لیکن داخلی سطح پر وجہی نے تصوف کے اسرار و رموز کو قصے کے طور پر بیان کیا ہے۔یعنی قصے کے ذریعے حسن حقیقی تک پہنچنے اور اس کا دیدار حاصل کرنے کے دوران پیش آنے والے واقعات اور کیفیات کو مجاز کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔وجہی نے قصے کے بیان کے ساتھ ساتھ پند و نصیحت کے جوہر بھی دکھائے ہیں۔

11.3.3 ملک الشعرا غواصی

غواصی قطب شاہی عہد کا ایک عظیم المرتبت اور قادر الکلام شاعر تھا۔غواصی کا نام شیخ بہا الدین، لقب غواصی، کنیت ابو محمد اور تخلص غواصی تھا۔اس کی تاریخ پیدائش اور حالات زندگی بڑی حد تک پردۂ تاریکی میں ہیں۔اس کے کلام کی اندرونی شہادتوں سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ ابراہیم قطب شاہ کے دور میں پیدا ہوا۔محمد قلی قطب شاہ کے دور میں اس نے شاعری کا آغاز کیا۔اس نے محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کا زمانہ بھی دیکھا۔سلطان

عبداللہ قطب شاہ کا دور غواصی کی شاعری کا زریں دور ہے۔

غواصی کی ابتدائی زندگی مفلوک الحالی میں گزری۔ ملک الشعرا کا اعزاز ملنے سے قبل وہ ایک معمولی ملازم تھا۔اور پہرے داری کی خدمت پر مامور تھا۔یہ ملازمت غواصی جیسے حساس شاعر کے لیے تکلیف دہ تھی۔اس لیے اس سے چھٹکارہ پانے کے لیے اس نے ایک قصیدے میں بادشاہ سے درخواست کی کہ اسے ایک گاؤں بخشا جائے اور پہرے کی خدمت سے معاف فرمایا جائے۔عبداللہ قطب شاہ جو نہ صرف شاعروں' ادیبوں اور اہل کمال کا قدر دان تھا اس نے نہ صرف غواصی کی خاطر خواہ سر پرستی کی بلکہ اپنے دربار کا ملک الشعرا بنایا اور قطب شاہی سفیر کی حیثیت سے اس کو بیجا پور روانہ کیا اور ''فصاحت آثار'' کے خطاب سے بھی سرفراز کیا۔

غواصی کی تین مثنویوں مینا ستونتی' سیف الملوک اور بدیع الجمال اور طوطی نامہ کے علاوہ غزلوں' قصیدوں' رباعیوں اور مرثیوں پر مشتمل دیوان منظر عام پر آچکا ہے۔ جہاں تک غزل گوئی کا تعلق ہے غواصی دبستان دکن کا سب سے بڑا شاعر ہے۔اظہار بیان کی سادگی غواصی کی غزل کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔

مثنوی نگاری میں غواصی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔''میناست ونتی'' غواصی کی پہلی مثنوی ہے جس کا قصہ حمیدی کے فارسی ''عصمت نامہ'' پر مبنی ہے۔اس مثنوی کا مرکزی تصور عورت کی عظمت وعفت اور اخلاقی اقدار سے متعلق ہے۔اس میں بالا کنور نامی ایک راجہ کی حسین بیٹی ''چندا'' کے ایک شادی شدہ چرواہے ''لورک'' پر فریفتہ ہونے اور اس کے ساتھ فرار ہونے کی داستان بیان کی گئی ہے۔لورک کی بیوی کا نام ''مینا'' ہے جو ایک ہندوستانی باعصمت' شوہر پرست اور وفا شعار عورت ہے۔بالا کنور اپنی بیٹی کا بدلہ لینے کی غرض سے ''مینا'' کو اپنے محل کی زینت بنانا چاہتا ہے۔اس کام کے لیے ایک چالاک دلالہ مقرر کی جاتی ہے جو مینا کو برائی کا راستہ اپنانے کے لیے اکساتی ہے لیکن مینا دلالہ کے جال میں گرفتار نہیں ہوتی۔غواصی نے اس مثنوی میں اپنے عہد کی نسوانی زبان' عورتوں کے طرز تکلم' روزمرہ' محاوروں' ضرب الامثال اور عورتوں کے انداز فکر کی اچھی عکاسی کی ہے۔

مثنوی ''سیف الملوک اور بدیع الجمال'' کا قصہ داستان الف لیلہ کے فارسی نثری ترجمے پر مبنی ہے۔اس میں مصر کے شہزادے سیف الملوک اور جنوں کی شہزادی بدیع الجمال کے عشق کی داستان نظم کی گئی ہے۔یہ مثنوی صرف غواصی کی ہی نہیں بلکہ دکنی اردو کی شاہ کار مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے۔اس مثنوی میں غواصی نے جذبات نگاری' سراپا نگاری' رزم نگاری اور منظر نگاری کے خوب صورت نمونے پیش کیے ہیں۔یہ مثنوی عہد سلطان محمد قطب شاہ کے آخری زمانے 1035ھ م1626ء کی تصنیف ہے جسے غواصی نے صرف ایک ماہ کے عرصے میں مکمل کیا تھا۔

مثنوی طوطی نامہ 1049ء کی تصنیف ہے جس کا قصہ سنسکرت کی مشہور تصنیف ''شکا سب تتی'' (طوطے کی کہی ہوئی 70 کہانیاں) کے فارسی ترجمے پر مبنی ہے۔شکا سب تتی کو مولانا ضیاء الدین نخشبی نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔انہوں نے ستر کہانیوں میں سے 52 کہانیوں کا انتخاب کیا۔غواصی کے طوطی نامہ کا ماخذ نخشبی کا طوطی نامہ ہی ہے۔غواصی نے بھی اختصار سے کام لیتے ہوئے باون کہانیوں سے صرف 45 کہانیوں کو اپنی مثنوی کے لیے منتخب کیا۔''طوطی نامہ'' کا قصہ اگر چہ کہ غواصی کا طبع زاد نہیں ہے لیکن قصہ کی جزئیات' انسانی نفسیات کی مرقع کشی اور مناظر فطرت کے بیان میں غواصی نے اپنے شاعرانہ کمال کا اس طرح مظاہرہ کیا ہے کہ یہ تصنیف غواصی کی طبع زاد مثنوی کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

11.3. 4 ابن نشاطی

قطب شاہی عہد کے اہم شاعروں میں ایک نام ابن نشاطی کا بھی ہے جس کی مثنوی ''پھول بن'' دکنی اردو کی منتخب مثنویوں میں شمار ہوتی ہے۔ ابن نشاطی کا پورا نام شیخ محمد مظہر الدین ابن نشاطی تھا۔اس کے مفصل حالات زندگی کا پتہ نہیں چلتا۔ پھول بن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے اچھی تعلیم وتربیت حاصل کی تھی۔مثنوی میں بعض ایسے اشارے موجود ہیں جن کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کو فن بلاغت اور علم معانی و بدیع سے خاص شغف

تھااور فارسی پر عبور رکھتا تھا۔ وہ بنیادی طور پر ایک انشا پرداز تھا لیکن اس کی انشا پردازی کا کوئی نمونہ منظر عام پر نہیں آیا۔ مثنوی ''پھول بن'' سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دور میں 1066ھ میں صرف تین ماہ میں لکھی گئی۔ اس مثنوی کی زبان سلیس و سادہ ہے۔ مثنوی کے مطالعہ سے شاعر کی قادرالکلامی اور کمال فن کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ مثنوی فارسی تصنیف ''بساتین الانس'' کے قصے پر مبنی ہے لیکن ابن نشاطی نے اصل قصے میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں اور اسے کئی ابواب میں تقسیم کر کے ہر باب کا آغاز ایک ایسے شعر سے کیا ہے جس میں اس باب کا خلاصہ آجاتا ہے۔ اگر تمام ابواب کے عنوانی اشعار کو یکجا کر دیں تو پوری مثنوی کا لب لباب سامنے آجاتا ہے۔ ''پھول بن'' میں جملہ 1744 اشعار ہیں۔ ابن نشاطی کہتا ہے کہ اس نے ''پھول بن'' میں انتالیس صنائع' چھیاسٹھ موقعوں پر استعمال کیے ہیں اور اپنی قادرالکلامی اور استادانہ صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ مثنوی میں ابن نشاطی نے جذبات نگاری' کردار نگاری اور منظر نگاری کا کمال دکھایا ہے۔

''پھول بن'' اپنی روانی و بے ساختگی' زبان و بیان کی صفائی' طرز ادا کی دل کشی اور فنی رچاؤ کے اعتبار سے دکنی ادب کا ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔ ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں'' میں گوپی چند نارنگ نے ابن نشاطی کی ''پھول بن'' کے ادبی محاسن کو بہت سراہا ہے اور ابن نشاطی کو ایک ''شعلہ بیان شاعر'' اور ''الفاظ کا ساحر'' قرار دیا ہے۔ گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں کہ ''پھول بن'' میں مکالموں کی برجستگی' زور طبیعت' شاعرانہ لطافت' انداز بیان کی خوبیاں اور زبان و بیان کا لوچ دل پر گہرا اثر کرتا ہے۔''

قطب شاہی عہد کے دیگر شاعروں میں احمد گجراتی' عبداللہ قطب شاہ' فائز' طبعی اور جنیدی کے نام بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ احمد گجراتی نے اپنی دو مثنویاں یوسف زلیخا اور لیلیٰ مجنوں محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں پیش کی تھیں۔ عبداللہ قطب شاہ بنیادی طور پر ایک غزل گو شاعر تھا۔ اسی طرح فائز کی رضوان شاہ و روح افزا' طبعی کی بہرام و گل اندام اور جنیدی کی ماہ پیکر قطب شاہی دور آخر کی منتخب اور نمائندہ مثنویاں ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ قطب شاہی سلطنت کا بانی کون تھا؟

2۔ وجہی نے کون کون سے بادشاہوں کا زمانہ دیکھا؟

3۔ سب رس پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

4۔ مینا ستونتی کے چند کرداروں کے نام لکھیے۔

5۔ طوطی نامہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

6۔ مثنوی پھول بن کے بارے میں لکھیے۔

11.4 خلاصہ

قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان قلی تھا جس نے 1518 میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا تھا۔ اس کے بعد مزید سات سلاطین نے سرزمین گولکنڈہ پر 169 سال تک حکومت کی۔ قطب شاہی سلاطین نہ صرف علم دوست اور شعرا اور ادبا کے سرپرست و قدردان تھے بلکہ ان میں سے بیشتر خود بھی شعر کہتے تھے خصوصاً محمد قلی قطب شاہ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ دکنی اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ محمد قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ محمد قلی کے علاوہ اس دور کے دوسرے عظیم شعرا میں اسداللہ وجہی' غواصی اور ابن نشاطی کے نام اہمیت رکھتے ہیں جنہوں نے قطب مشتری' مینا ستونتی' سیف الملوک اور بدیع الجمال' طوطی نامہ اور پھول بن جیسی لازوال مثنویاں لکھیں۔ وجہی اس دور کا ایک باکمال شاعر ہی نہیں تھا بلکہ اعلیٰ درجہ کا نثر نگار بھی تھا۔ اس کی تصنیف ''سب رس'' اردو نثر کی تاریخ میں ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔

بہ حیثیت مجموعی قطب شاہی دور کو مثنویوں کے دور کہا جا سکتا ہے۔ مثنوی کے بعد اس دور میں غزل کی صنف کو فروغ ہوا ساتھ ساتھ مرثیہ' قصیدہ اور رباعی پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔

11.5 نمونہ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

1۔ قطب شاہی دور کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

2۔ غواصی کے ادبی کارنامے بیان کیجیے۔

3۔ وجہی کے حالات زندگی اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

1۔ قطب شاہی دور کے سیاسی اور سماجی پس منظر کا جائزہ لیجیے۔

2۔ محمد قلی قطب شاہ کی حیات اور ادبی خدمات بیان کیجیے۔

3۔ ابن نشاطی کے بارے آپ کیا جانتے ہیں لکھیے۔

4۔ کسی دو پر نوٹ لکھیے۔

1۔ سب رس 2۔ سیف الملوک و بدیع الجمال 3۔ مینا ستونتی 4۔ پھول بن

11.6 فرہنگ

الفاظ	معنی
مستحکم	مضبوط
خودمختاری	بااختیار ہونا' آزادی
حرفہ	پیشہ' ہنر' کاری گری
عہدزریں	سنہرا دور
رقیب	دشمن
ہجراں	جدائی
مجاز	حقیقت کے برعکس
طبع زاد	اپنی ایجاد
اسرار و رموز	پوشیدہ راز
مفلوک الحالی	تباہ حالی' خستہ حالی
جزئیات	جزو کی جمع' حصے' چھوٹے چھوٹے امور
مرقع کشی	تصویر کشی

لب لباب	خلاصہ، نچوڑ
ادبی محاسن	ادبی خوبیاں

11.7 سفارش کردہ کتابیں

1۔	تاریخ ادب اردو (جلد اول)	ڈاکٹر جمیل جالبی
2۔	دکنی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محی الدین قادری ذور
3۔	تاریخ ادب اردو 1700ء تک (جلد سوم، چہارم)	پروفیسر سیدہ جعفر و پروفیسر گیان چند جین
4۔	دکنی نثر کا انتخاب	پروفیسر سیدہ جعفر
5۔	دبستان گولکنڈہ، ادب اور کلچر	پروفیسر محمد علی اثر
6۔	اردو کی اہم مثنویاں	ڈاکٹر احمد علی شکیل

اکائی 12 ولی اور سراج کا عہد

اکائی کے اجزا

12.0 مقصد

12.1 تمہید

12.2 ولی اوران کے اورنگ آبادی معاصرین

12.3 ولی کے دیگر دکنی معاصرین

12.4 ولی کے گجراتی معاصرین

12.5 خلاصہ

12.6 نمونۂ امتحانی سوالات

12.7 فرہنگ

12.8 سفارش کردہ کتابیں

12.0 مقصد

اس اکائی کو مکمل کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

- ☆ ولی اور سراج کے عہد کا تعین کر سکیں۔
- ☆ ولی کے حالات زندگی، ولی کے بارے میں محققین کے باہمی اختلاف اور ولی کے کارناموں پر روشنی ڈال سکیں۔
- ☆ ولی وسراج کے اورنگ آبادی معاصرین اوران کی تصانیف پر اظہار خیال کر سکیں۔
- ☆ ولی وسراج کے دیگر دکنی معاصرین اوران کی شعری خدمات کی تحسین کر سکیں۔
- ☆ ولی وسراج کے گجراتی معاصرین اوران کی ادبی خدمات پر بحث کر سکیں۔

12.1 تمہید

گزشتہ اکائیوں میں ہم نے بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی دور میں دکنی شعروادب کے فروغ کا مطالعہ کیا۔ اس اکائی میں ہم ان سلطنتوں کے زوال کے بعد دکنی شاعری کی صورت حال کا جائزہ لیں گے۔

اورنگ زیب نے 1685ء میں بیجاپور اور 1686ء میں گولکنڈہ فتح کر کے مغلیہ سلطنت میں شامل کرلیا۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کے شاہی درباروں میں دکنی شعرا کی بڑی قدر ومنزلت تھی۔ انھیں ان کی تصنیفات پر معقول انعام واکرام سے مالا مال بھی کیا جاتا تھا۔ فرمانرواؤں کے علاوہ سلطنت کے مختلف امرا بھی ادیبوں، شاعروں اور دوسرے ارباب علم وفن کی سرپرستی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن ان سلطنتوں کے زوال کی وجہ سے اس قسم کی قدردانی بھی کم ہوگئی۔

اورنگ زیب نے 1062ھ (1651ء) میں جب کہ وہ دکن کے صوبے دار تھے اورنگ آباد کو اپنا مستقر بنایا تھا جس کی وجہ سے اس شہر کی رونق بڑھنے لگی۔ مغلیہ سلطنت کا مستقر ہونے کی وجہ سے یہ شہر شمالی ہند کے علما وفضلا کا مرکز بن گیا۔ شمالی ہند کے علاوہ بیجاپور اور گولکنڈے کے شعرا بھی رفتہ رفتہ اورنگ آباد کا رخ کرنے لگے۔ اس طرح وہاں شعروشاعری کا چرچا بڑھنے لگا۔ اورنگ زیب کی وفات (1706ء) کے وقت تقریباً پورا دکن مغلیہ سلطنت میں شامل تھا۔ دکن کے مختلف حصوں میں مغل شہنشاہ کے مقرر کیے ہوئے صوبیدار صوبے کا نظم ونسق چلاتے تھے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد خانہ جنگی شروع ہوئی تو دکن بھی اس سے متاثر ہوا۔ اورنگ زیب کے جانشینوں کی نااہلی اور عیش پرستی کی وجہ سے ملک کا نظم ونسق بگڑ گیا اور سلطنت کے مختلف صوبے آزاد اور خودمختار ہونے لگے۔ اس انتشار اور بدنظمی کے پیش نظر نواب میر قمرالدین خاں نظام الملک آصف جاہ نے 1136ھ/ 1723ء میں دکن میں آصفیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔

بیجاپور اور گولکنڈے کی سلطنتوں کے خاتمے سے لے کر دکن میں آصف جاہی سلطنت کے قیام کا درمیانی عہد دکنی ادب کا مغل دور کہلاتا ہے۔ اس دور کا سب سے بڑا شاعر ولی اورنگ آبادی ہے۔

آصف جاہ اول سے لے کر آصف جاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں کے ابتدائی دور تک اورنگ آباد مملکت آصفیہ کا پایہ تخت رہا۔ نواب میر نظام علی خاں نے 1768ء میں اپنا پایہ تخت اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل کیا۔ یہ دور دکنی زبان وادب کا آصف جاہی دور ہے۔ اس دور کے سب سے بڑے اور نمایاں اُردو شاعر سراج اورنگ آبادی ہیں۔ دکن کا مغل دور اور ابتدائی آصف جاہی دور ایک طرح سے ولی اور سراج کا دور ہے۔ اس دور میں دکن اور گجرات میں متعدد شعرا بالترتیب دکنی اُردو اور گجری اُردو میں دادِ سخن دے رہے تھے۔ آئندہ اوراق میں ہم ان میں سے چند اہم شاعروں کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔

12.2 ولی اور ان کے اورنگ آبادی معاصرین

ولی اورنگ آبادی : ولی اورنگ آبادی کو اردو شاعری میں صنف غزل کے معمار ومجتہد کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن ان کے حالات زندگی کی تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا۔ تذکرہ شعرائے دکن کے مصنف عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری نے ولی کا سال ولادت 1079ھ متعین کیا تھا جسے عام طور پر قبول کرلیا گیا۔

ولی کے نام میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ بعض لوگ ان کا نام ''ولی اللہ'' بتاتے ہیں تو بعض شمس ولی اللہ۔ لیکن اب تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ ان کا نام ولی محمد تھا۔ نام کی طرح ولی کے وطن کے بارے میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر زور ولی کو اورنگ آباد کا باشندہ مانتے ہیں جبکہ ڈاکٹر سید ظہیرالدین مدنی اور قاضی اختر جوناگڈھی ولی کو گجراتی الاصل قرار دیتے ہیں۔ اس اختلافی بحث میں درج ذیل نکات قابل غور ہیں۔

گجراتی شعرا مثلاً امین گجراتی (مصنف مثنوی یوسف زلیخا) اور افضل (مصنف مثنوی شمس وقمر) وغیرہ اپنی زبان کو صاف طور پر ''گوجری'' کہتے ہیں جبکہ ولی نے اپنی زبان کو دکنی کہا ہے۔

دکھنی زباں میں شعر سب لوگاں کہے ہیں اے ولی
لیکن نہیں بولا کوئی یک شعر خوشتر ایں نمط

ولی کے ہاں دکنی زبان کے مخصوص ''چ'' تاکیدی اور ''نکو'' کا استعمال ملتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ گجراتی نہیں تھے۔

پیتارانئیں ترے کہنے کا جب حیران کرنا کی
جو من میں نہیچ ملنے کا تو پھر تکرار کرنا کی
عالم کوں تیغِ ناز سوں بے جاں نکو کرو
غمزے سوں اپنے غارت ایماں نکو کرو

اپنی زباں کو دکنی کہنے کے علاوہ ولی نے خود اپنے آپ کو بھی دکن کا باشندہ ظاہر کیا ہے اس کے بعد بھی انھیں گجراتی کہنا تحقیقی اندھیر ہے۔

ولؔی ایران و توراں میں ہے مشہور
اگر چہ شاعر ملک دکن ہے
یہ مکھ کی شمع سوں روشن ہے ہفت اقلیم کی محفل
ولی پر وانگی کرتا تری ملک دکھن بھیتر

ولؔی کی کلیات میں ایک قطعہ'' درفراق گجرات'' اور شہر سورت کی تعریف میں ایک مثنوی پائی جاتی ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ گجرات کے باشندے تھے۔ غالب نے بھی کلکتے کی تعریف میں ایک قطعہ لکھا ہے لیکن اس سے وہ بنگالی نہیں ہو جاتے۔

تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ ولی نے بیس برس کی عمر میں حصول علم کی خاطر خاندان اور وطن کو خیر باد کہا اور احمد آباد پہنچے۔ یہاں وہ شاہ وجیہ الدین علوی کے قائم کردہ مدرسے میں داخل ہوئے۔ ولی نے شیخ علی رضا سرہندی سے نقشبندی سلسلے میں بیعت کی تھی چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں۔

بعد شاہ بخف ولی اللہ　　　　پیر کامل علی رضا پایا

ولی کو سفر و سیاحت کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے برہان پور، سورت، احمد آباد، سرہند، کابل اور کشمیر تک کا سفر کیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ حج بیت اللہ اور روضۃ النبیؐ کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے تھے۔

ولی کا سال وفات بھی متنازعہ ہے۔ دیوان ولی کے ایک قلمی نسخے میں درج قطعہ تاریخ کی بنیاد پر مولوی عبدالحق نے ولی کا سال وفات 1119ھ میں متعین کیا [مجلّہ الموسی، یادگار ولؔی ص 63] لیکن ڈاکٹر جمیل کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ولؔی نے 1133ھ کے بعد اور 1138ھ سے قبل وفات پائی۔ [جالبی تاریخ ادب اردو، جلد اول 538-535]

ولی ایک خوش فکر شیریں گفتار اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی کلیات میں غزلیات کے علاوہ مخمسات، رباعیات، مستزاد، ترجیع بند، مرثیہ، قصائد، مثنویات اور قطعہ شامل ہے۔ ولؔی بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے۔ انھوں نے دکنی غزل کی روایات کی پابندی کرتے ہوئے غزل کی روایت میں توسیع کی۔ ولؔی کی غزل واردات قلب، تجربات اور مشاہدات کی ترجمان ہے۔ طبعاً وہ جمال پرست واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے حسن کی مختلف کیفیتوں اور مختلف اداؤں کو دیکھا اور محسوس کیا اور اپنی غزل میں ان کی عکاسی کی۔ حسن ان کے لیے سرچشمہ انبساط بھی ہے اور تخلیقی عمل کا محرک بھی۔ ن کی غزل محبوب کے حسن و جمال، ناز و انداز اور دلربائی کا آئینہ اور ان کا فن حسن کے بیان کا وسیلہ ہے۔ ان کی حسن پرستی نے ان کی غزل کو محبوب کے زلف و کاکل، لب و عارض، قد و قامت اور اس کی رفتار و گفتار کا مرقع بنا دیا ہے۔

ترا مکھ حسن کا دریا و مو جاں چین پیشانی
اُپر ابرو کی کشتی کے یوتل جیوں ناخدا دستا
پڑیا ہے لعل میں پر تو سجن تجھ مکھ کی لالی کا
بیاں ہے مہ سوں روشن تر تری صاحب کمالی کا
دیکھ تیرے سو یو کھبا لے بال
رشک سوں جل گئے ہیں کالے بال

ولؔی کی شاعری کا دوسرا امتیازی پہلو ان کا ہندوستانی تخیل ہے۔جس نے ان کے شعری افکار میں ایک عجیب مٹھاس اور دلکشی پیدا کی ہے۔ان کی غزل کی فضا میں ہندوستانی دھرتی کی مہک اور مقامی تہذیب وتمدن کی رنگینی بسی ہوئی ہے۔ان کی غزلیات میں ہندوستانی موسموں' پرندوں' جانوروں' دریاؤں' پہاڑوں' پھولوں' پھلوں' ملبوسات اور زیورات وغیرہ کے بکثرت حوالے پائے جاتے ہیں۔ان کی تشبیہات' تلمیحات' استعاروں اور علامتوں میں بھی دیسی عناصر سے استفادے کا عمل نظر آتا ہے۔

کوچۂ یار عین کا سی ہے　　جوگی دل وہاں کا باسی ہے
اے صنم تجھ جبیں اُپر یہ خال　　ہندوئے ہر دوار باسی ہے
زلف تیری ہے موج جمنا کی　　تل نِرک اس کے جیوں سناسی ہے
جو دھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تجھ سے اوصنم
ترکش میں تجھ نین کے ہیں ارجن کے بان آج

ولؔی نے دکنی شاعری کے جن صحت مند رجحانات کو اپنی شاعری میں برقرار رکھا ان میں محبوب کا واضح تصور بھی ہے ان کا محبوب کوئی فرضی یا خیالی مخلوق نہیں بلکہ وہ مادی وجود رکھتا ہے اور پوری نسوانیت کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔انھوں نے اپنی غزلوں میں محبوب کا ذکر صیغہ تانیث میں کیا ہے۔

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں تو آگ بجھا تی جا
تجھ چال کی قیمت سوں دل نئیں ہے مرا واقف
اے مان بھری چنچل ٹک بھا وَ بتاتی جا
اس رات اندھاری میں مت بھول پڑوں تجھ سوں
ٹک پاؤں کے جھا نجھر کی جھنکا ر سناتی جا
تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولؔی دائم
مشتاق درس کا ہے ٹک دَرَس دکھاتی جا

ولؔی کے کلام میں تصوف' ترک دنیا اور فقر وتوکل کی باتیں بھی ملتی ہیں لیکن یہ ان کے اصل موضوعات نہیں ہیں۔محض تبدیلی ذائقہ کی خاطر وہ تصوف وطریقت کی بات کرتے ہیں۔ان کا اصل رنگ حسن پرستی' آزاد مشربی' نیاز مندی اور آشنا پرستی ہے۔اس رنگ میں ان کی غزلیں شعریت' نغمگی' رنگینی اور کیف میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ولؔی ایک عہد ساز شاعر تھے۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے دکنی ادب کی تین سو سالہ روایت کو

جس کے سوتے خشک ہورہے تھے‘ایک طرف تو شمالی ہند کی معیاری بولی ریختہ سے ہم کنار کیا اور دوسری طرف اپنی جدت طبع کا مظاہرہ کرتے ہوئے فارسی غزل کے موضوعات ومضامین اور فارسی زبان کے ذخیرۂ الفاظ سے بے دریغ استفادہ کیا۔اس طرح انہوں نے اُردو غزل میں اس قدر نئے امکانات پیدا کیے کہ ولؔی کے بعد بھی تقریباً دوسو سال تک اردو غزل ولؔی کے بنائے راستے پر چلتی رہی۔اسی لیے ولؔی کو بابائے ریختہ اور اردو غزل کا مجتہد اور امام کہا جاتا ہے۔

ولؔی کی عظمت واہمیت اور اردو شاعری پر ان کے اثرات کو سمجھنے کے لیے ان کے سفرِ دہلی کا ذکر ضروری ہے۔کیونکہ ان کی شخصیت دکن اور شمال کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتی ہے۔ولؔی نے 1112ھ (1700ء) میں دہلی کا سفر کیا۔اس وقت شمالی ہند کے شعرا صرف فارسی میں دادِ سخن دیتے تھے۔اردو کو وہ بازاری زبان سمجھتے تھے۔ولؔی نے دہلی میں اُردو غزل کی شمع روشن کی۔ان کے اثر سے شمالی ہند کے شعرا نے اردو میں غزل گوئی کا سلسلہ شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اردو غزل سارے شمالی ہند میں مقبول ہوگئی۔

سراج اورنگ آبادی : ان کا اصل نام سید سراج الدین اور تخلص سراج تھا۔ان کے والد کا نام سید درویش تھا۔سراج 1128ھ کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔[بحوالہ پروفیسر سید عبدالقادر سروری‘ کلیات سراج‘ مقدمہ ص 39-40] بارہ سال کی عمر تک سراج کی تعلیم وتربیت ان کے بزرگوں کی نگرانی میں ہوئی۔بارہ سال کی عمر میں ان کی طبیعت پر دیوانگی کا عالم طاری ہوا۔وہ سات برس تک جذب اور بے خودی کی حالت میں رہے۔سات سال کے بعد ان کو افاقہ ہوا۔صحتیابی کے بعد سراج نے شاہ عبدالرحمٰن چشتی (م 1161ھ) سے بیعت کی۔

جس زمانے میں سراج پر جذب وبے خودی کی کیفیت طاری تھی اس زمانے میں وہ فارسی میں نہایت دردانگیز اشعار کہتے تھے۔چونکہ اس وقت ان کی عمر نہایت کم اور اشعار نہایت اعلیٰ پائے کے تھے اس لیے لوگ انھیں سن کر حیرت میں پڑ جاتے اور ان کے کلام کو فیضِ الہام تصور کرتے۔لیکن افسوس کہ کسی نے سراج کے اس زمانے کے کلام کو محفوظ نہیں کیا۔شاہ عبدالرحمٰن چشتی سے بیعت کرنے کے بعد سراج اپنے عزیز دوست اور برادر طریقت شاہ عبدالرسول چشتی کی فرمائش پر اردو میں شعر کہنے لگے۔شاہ عبدالرسول ان کے کلام کے شائق تھے۔انھوں نے ان کی غزلیات اور متفرق اشعار کو جمع کر کے دیوان کی شکل دی۔دیوان کی تکمیل کے بعد سراج نے اپنے مرشد شاہ عبدالرحمٰن چشتی کے حکم پر غزل گوئی ترک کی لیکن مثنویات لکھتے رہے۔شاعری میں وہ کسی کے شاگرد نہیں تھے۔

ولؔی کے بعد سراج دکن میں مغلیہ دور کے سب سے اہم شاعر ہیں۔عمر کے آخری حصے میں سراج کی شخصیت نہایت مقدس اور بزرگ ہوگئی تھی۔علما ومشائخ ان کا احترام کرتے تھے۔اورنگ آباد میں سراج کو استادی کا مرتبہ حاصل تھا۔ان کی شاعری اور بزرگی کی شہرت دکن سے نکل کر گجرات اور دہلی تک پھیل چکی تھی۔1117ھ میں جب سراج کی عمر پچاس سال تھی‘ان کا انتقال ہوا۔سراج کی تصانیف میں فارسی کلام،کلیات اردو‘منتخب دیوانہا اور مثنوی بوستان خیال شامل ہیں۔

سراج نہایت پرگو شاعر تھے۔انھوں نے پانچ چھے سال کی قلیل مدت میں اپنا دیوان مکمل کرلیا۔اس وقت ان کی عمر صرف چوبیس سال تھی۔انھوں نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ان کی ضخیم کلیات میں غزلیات کے علاوہ مثنویاں‘ قصائد‘ ترجیع بند‘ مستزاد‘ مخمسات‘ رباعیات وغیرہ شامل ہیں۔

سراج عشق کے شاعر ہیں۔عشق ان کے فن اور تخلیق کا سرچشمۂ فکر کا مرکزی نقطہ اور زندگی کا دائرہ ہے۔وہ سرتاپا رہینِ عشق تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ ہستی‘عشق ومحبت کے سوا کچھ اور نہیں۔جس دل میں عشق کی روشنی جاگتی ہے اس پر کائنات کے اسرار منکشف ہوتے ہیں۔سراج کی عشقیہ شاعری کا تجزیہ کرتے ہوے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

’’سراج کے عشقیہ جذبات میں ایک گرمی‘ جلانے اور تڑپانے والی کیفیت بہت نمایاں ہے۔اور یہ کیفیت جب سرشاری و بے خودی سے

پیدا ہونے والے آہنگ، آواز اور لے کو ساتھ لے کر جب الفاظ کے بطن میں اترتی ہے تو الفاظ زندہ ہو جاتے ہیں اور شعر منہ سے بولنے لگتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عشق میں انتہائی شدت ہے، وارفتگی ہے، عالم جذب وشوق میں صحرا صحرا پھرنے اور گریبان چاک کرنے کا احساس ہے لیکن اسی کے ساتھ اظہار بیان میں ایک نپا تلا پن، ایک توازن ہے۔ ہاں دل و دماغ مل کر ایک وحدت بناتے ہیں۔ (ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اُردو، جلد اول ص 570)

سراج کی شاعری کا دوسرا اہم موضوع تصوف ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جابجا مخصوص صوفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے اور حقائق و معارف کے دریا بہائے ہیں۔ ان کے اشعار صوفیانہ تجربات کی ترجمانی، نغمگی و ترنم اور وجد آفریں کیف و سرور کا بہترین نمونہ ہیں:

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی
چلی سمتِ غیب سے کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہو سو ہری رہی
نظر تغافل یار کا گلہ کس زباں سے بیاں کروں
کہ شراب صد قدحِ آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی

سراج نے چھوٹی بڑی کل گیارہ مثنویاں لکھیں۔ ان میں ''بوستان خیال'' نہایت اہم ہے۔ سراج نے یہ مثنوی 1160 ہجری میں لکھی۔ ''بوستان خیال'' اس کا تاریخی نام ہے جو اس مثنوی کے سنہ تصنیف اور تعداد اشعار (1160) کو ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے یہ مثنوی صرف دو دن میں لکھی۔ اس میں انھوں نے کوئی فرضی قصہ یا خیالی داستان نظم نہیں کی ہے بلکہ اپنی آپ بیتی بیان کی ہے۔ سادگی، سلاست، روانی اور ربط کلام کے اعتبار سے بوستان خیال اُردو کی بہترین مثنویوں میں سے ایک ہے۔

سراج کی شاعری میں حسن خیال اور لطف گفتار کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ انھوں نے بیانیہ شاعری کے محاسن جیسے تشبیہ و استعارے کی تازگی، تلمیحات کی ندرت اور علم بدیع کی صنعتوں کے برجستہ اور موزوں استعمال سے اپنے لہجے اور اسلوب میں دلچسپی، لطف اور مٹھاس پیدا کی ہے۔

داؤد اورنگ آبادی: ولی کے بعد سرزمین اورنگ آباد سے جو سخنور اٹھے ان میں داؤد اورنگ آبادی ایک صاحب دیوان شاعر کی حیثیت سے اہم ہیں۔ ان کا اصل نام مرزا داؤد بیگ تھا۔ ان کے والد کا نام مرزا سلیمان تھا جو بہ اعتبار نسب مغل تھے۔ داؤد کی ولادت اورنگ آباد میں ہوئی۔ انھیں تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ نہیں مل سکا لیکن انھوں نے علما و فضلا کی صحبتوں میں رہ کر لیاقت پیدا کی۔ قدرت نے انھیں موزوں طبعیت عطا کی تھی۔ فطری صلاحیت کے مطابق شعر کہنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہو گئے۔ شاعری میں وہ کسی کے شاگرد نہیں تھے چنانچہ کہتے ہیں:

مجھ کوں کچھ علم نہیں ہے وہ خدا آپ علیم
شعر کہنا مجھے داؤد خدا داد آیا

داؤد کا انتقال 1168ھ میں ہوا۔ داؤد بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے۔ غزلیہ شاعری میں انہوں نے ولی کا اثر قبول کیا۔ ولی کو وہ اپنا معنوی استاد اور اپنے آپ کو ولی کا جانشین سمجھتے تھے۔

کہتے ہیں سب اہل سخن اس شعر کوں سن کر
تجہ طبع میں داؤد ولؔی کااثر آیا
حق نے بعد از ولؔی مجھے داؤد
صوبہ شاعری بحال کیا

ولؔی کے تتبع میں داؤد نے بھی محبوب کے حسن کی رعنائیوں کو اپنی غزل کا مرکزی موضوع بنایا۔ان کی غزل محبوب کے حسن و جمال کی تفسیر ہے۔ معشوق کے لب ورخسار کا تذکرہ اگر چہ روایتی ہے لیکن حسن کی مختلف کیفیات کو محسوس کرنے اور انھیں الفاظ کی گرفت میں لانے کا انداز داؤد کا اپنا ہے۔

جس نے وہ گلبدن نہیں دیکھا — اس نے سیر چمن نہیں دیکھا
غنچہ کیا پاوے تری گفتار کوں — سرو کیا پہنچے تری رفتار کوں
جب وہ مہ رخسار یکا یک نظر آیا — اس ماہ کی طلعت سوں سُرج دل میں درآیا
دیکھ داؤد ہے غزل تیری — مصحف حسنِ یار کی تفسیر

داؤد کے دیوان میں حمدیہ، نعتیہ، منقبتی ، اخلاقی اور ناصحانہ اشعار بھی ملتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔محبوب کے حسن و جمال اور اس کے خدوخال کی تعریف وتوصیف ان کا مرغوب موضوع ہے۔

دکنی ادب کی تاریخ میں داؤد کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے ولؔی کی روایت کی تکرار کی اور ولؔی کے اسلوبِ زبان اور رنگ سخن کو مقبول بنانے میں بھرپور حصہ لیا۔

عاجز اورنگ آبادی: اصل نام عارف الدین خاں اور عاجز تخلص تھا۔ عاجز اصلاً ایرانی تھے۔ان کے والد اورنگ زیب کے زمانے میں بلخ سے ہندوستان آئے۔ عاجز ابھی کم عمر ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔نواب لشکر خاں بہادر نصرت جنگ صوبہ دار اورنگ آباد کی سرپرستی میں عاجز نے تعلیم وتربیت حاصل کی اور انھیں کی سفارش پر آصف جاہ اول اور ناصر جنگ کے دربار میں باریاب ہوئے اور خطاب ومنصب سے سرفراز کیے گئے۔1178ء میں ناندیڑ (مہاراشٹرا) میں عاجز کا انتقال ہوا وہیں آسودہ خاک ہوئے۔

عاجز نہایت ذہین اور خوش طبع انسان تھے۔اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کی فکر رسا اور طبعیت کی شوخی وشگفتگی کی تعریف کی ہے۔ان کا کلام نہایت موزوں اور چست ہوتا تھا۔تاریخ گوئی کے فن میں وہ بے مثال تھے۔انہوں نے جھولنہ، کبت اور اشلوک لکھے۔ علاوہ ازیں صنعت مہملہ (بے نقط) میں قصائد لکھے لیکن کلام کی جمع وترتیب کے معاملے میں وہ نہایت لا اُبالی واقع ہوئے تھے، جس کی وجہ سے ان کا بیشتر کلام ضائع ہوگیا۔انھوں نے فارسی اور اردو میں ایک ایک دیوان مرتب کیا تھا۔

عاجز کی شاعری کا امتیازی وصف سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی اور ضائع و بدائع کا استعمال ہے۔انہوں نے مشکل قافیہ وردیف اور مشکل بحروں میں غزلیں لکھ کر اپنی جولانی اور مشاقی کا مظاہر کیا ہے۔اس طرح کی شاعری کیف واثر سے خالی ہوتی ہے لیکن اس دور میں کمال فن کے اظہار کا یہی طریقہ تھا۔سنگلاخ اور طویل بحروں کے علاوہ عاجز نے ایہام گوئی کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ان کے اشعار میں خیال کی تازگی، تشبیہات کی ندرت اور شگفتہ بیانی کا احساس ہوتا ہے۔

خیال اس شوخ کا کب مجھ دل بے تاب میں ٹھیرے — کہاں بجلی کا سایہ چشمہ سیماب میں ٹھیرے
بلبلو آج ہے صیاد کے آنے کی خبر — ہم میں نئیں طاقت پرواز خدا خیر کرے

چمن میں چل کے سجن بے حساب ساغر کھینچ　　بہار رنگ گلستاں کے سر سے چادر کھینچ

دیوان غزلیات کے علاوہ عاجز سے ایک مثنوی لال و گوہر بھی یادگار ہے۔درحقیقت اس مثنوی کو ان کے دیوان سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ مثنوی لال و گوہر پانچ سو اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں عاجز نے بنگالے کے شہزادے لال اور پریوں کی شہزادی گوہر کے عشق کی داستان بیان کی ہے۔اس میں فوق الفطرت عناصر' طلسمات و کرشمات اور حیرت انگیز واقعات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔مثنوی لال و گوہر کی زبان اور اسلوب عاجز کی غزلیات کے مقابلے میں شستہ اور سلیس ہے۔اس میں کہیں کہیں دکنی الفاظ' دکنی طرز اظہار اور دکنی لب ولہجہ بھی ملتا ہے۔مثنوی لال و گوہر کا سنہ تصنیف نامعلوم ہے۔نصیرالدین ہاشمی نے قرائن کی بنیاد پر لکھا ہے کہ یہ 1150ھ اور 1180ھ کے درمیان لکھی گئی۔[ہاشمی' یورپ میں دکھنی مخطوطات' ص526]

شاہ قاسم اورنگ آبادی: ولی کے خورد ہم عصروں میں شاہ قاسم ایک اہم صاحب دیوان شاعر ہیں۔ان کا اصل نام شاہ قاسم علی تھا' قاسم تخلص کرتے تھے۔عاجز اورنگ آبادی کے گہرے دوستوں میں سے تھے چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں

شہ قاسم علی چوک میں عاجز نے پکارا　　جاتا ہے کدھر شہر ہ آفاق ادھر آ

شاہ قاسم کا سنہ ولادت اور سنہ وفات نامعلوم ہے۔ان کے والد کا نام شیخ عبداللہ انصاری تھا۔وہ ایک درویش طبع انسان تھے۔شاہ قاسم برہان پور میں پیدا ہوئے لیکن سن شعور کو پہنچنے کے بعد اورنگ آباد آ گئے اور یہیں انھوں نے شاعری کا آغاز کیا۔شاہ قاسم کے دیوان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خاصے پڑھے لکھے انسان تھے۔انھیں شاعری کے رموز ولوازم پر عبور حاصل تھا لیکن شاعری میں وہ کسی کے شاگرد نہیں تھے۔

قاسم سخن میں مجھ کو عطائے رسولؐ ہے　　نئیں شعر میں مرے کسی استاد کی طرح

شاہ قاسم کے دیوان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے جنوب کے مختلف شہروں کی سیر کی تھی۔وہ حیدرآباد بھی آئے تھے۔شاہ قاسم ایک حسن پرست' عاشق مزاج اور رندمشرب انسان تھے۔انھوں نے ایک قلندر کی طرح زندگی گزاری۔

ہم قلندر وضع بے پروا فقیر　　رندمشرب عاشق بے باک ہیں

شاہ قاسم کو اپنی شاعری پر بڑا ناز تھا۔وہ اس فن میں کسی کو اپنا مدمقابل نہیں سمجھتے تھے۔

رہے گا تا قیامت شاہ قاسم　　ترا یہ گرم بازار سخن سبز

شاہ قاسم دکن سیں تا دلی　　کون دیوے ترا جواب سخن

دیوان قاسم میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جن میں عشق کی گہرائی' جذبے کی شدت اور اظہار کی نشتریت پائی جاتی ہے:

اس کو کیا جانے خدا جانے ہوا کیا یارو　　سارے عالم سیتی بے زار ہے دل کچھ نہ کہو

ہزار افسوس یارب یہ بہاریں یوں چلی جائیں　　ہماری آہ و نالوں کی پکاریں یوں چلی جائیں

ہمارے سامنے اب دوستی کا نام نہ لو　　خدا کرے مجھے اس کا روبار سے محفوظ

سید شاہ غلام قادر سامی: سامی ولی کے کم عمر معاصرین میں سے تھے۔سامی کے دادا سید فیض مغل شہنشاہ شاہجہاں کے ملازم تھے۔سامی کے والد نظام الملک آصف جاہ اول کے مصاحب تھے۔سامی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ابھی وہ بچے ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ان کے دادا نے ان کی پرورش کی۔سامی کو تحصیل علم کا شوق تھا۔وہ علما کی مجلسوں میں بیٹھتے تھے۔

سامی کو نوجوانی کی عمر سے شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔تھوڑے دنوں کی مشق سے قادر الکلام شاعر بن گئے۔ان کے شاگردوں کا حلقہ بھی وسیع تھا۔سامی نے 1196ھ میں وفات پائی۔اورنگ آباد میں مدفون ہوئے۔سامی صاحب دیوان شاعر تھے لیکن دیوان اب نہیں ملتا۔انھوں نے 1175ھ

میں ایک مثنوی'' سرو وشمشاد لکھی۔ اس میں سرو اور شمشاد کے عشق کی داستان نظم کی گئی ہے۔قصہ کے درمیان انھوں نے (505) علوم وفنون کی معلومات کا مظاہرہ کیا ہے۔ مثلاً کلام' مذہب' تفسیر' فقہ' حدیث' طبیعات' طب' طلسمات' کیمیا' جفر' موسیقی' منطق' عروض' ہندسہ' مساحت' نجوم' رمل وغیرہ۔

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں''اگر چہ سامی کی زبان گولکنڈہ و بیجاپور کے مثنوی نگاروں کے مقابلے میں صاف ہے' تا ہم دکنی زبان کا اثر جگہ جگہ نمایاں ہے۔ حالانکہ سامیؔ کے دادا دہلی سے آئے تھے لیکن وہ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں کا روزمرہ سیکھا۔''[ڈاکٹر زور' تذکرہ مخطوطات' جلد اول ص 73]

درج ذیل اشعار سے سامیؔ کی زبان اور لہجے کا اندازہ ہوتا ہے:

زمانے کا میں دیکھا ہوں عجب رنگ
کبھی ہے صلح اس میں اور کبھی جنگ
کوئی عورت نہ کی دعویٰ خدائی
اسے الفت میں افزوں ہے صفائی
جلا ئیں کوئی مرد عورت کی خاطر
ستی ہوتی ہے عورت سو ہے ظاہر
کرے کاں تک کوئی قبروں کا ساماں
ہوا وہ شہر سب گنج شہیداں

سید عبدالولی عزلتؔ : عزلتؔ اٹھارویں صدی کے ممتاز شاعر تھے۔ وہ 1104ھ میں پیدا ہوئے۔ان کے والد شاہ سعداللہ جید عالم تھے۔عزلت نے معقول اور منقول کی تعلیم انھیں سے حاصل کی ۔عزلت کو سیاحت کا شوق تھا۔انھوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیر کی جن میں دہلی' اورنگ آباد' حیدرآباد اور مرشد آباد (بنگال) شامل ہیں۔ آخر عمر میں وہ حیدرآباد آئے جہاں نواب صلابت جنگ نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی ۔1189ھ میں عزلت کا انتقال ہوا۔دائرہ میر مومن (حیدرآباد) میں پیوند خاک ہوئے۔

عزلت جامع الکمالات واقع ہوئے تھے۔انھیں کئی علوم وفنون میں مہارت حاصل تھی۔ان کی تصانیف میں دیوان فارسی' دیوان اُردو' مثنوی راگ مالا' ساقی نامہ' بارہ ماسی اور بیاض شعرا شامل ہیں۔ ہندی میں انہوں نے بے شمار دوہے' کبت' جھولنہ' سوال جواب' مکرنیاں اور پہیلیاں لکھیں۔تذکرہ شعرائے دکن کے مصنف عبدالجبار خاں صوفی ملکا پوری لکھتے ہیں کہ امیر خسرو طوطی ہند تھے تو عزلت کو طوطی دکن کہنا چاہیے۔[ملکا پوری' تذکرہ شعرائے دکن جلد دوم ص 812] عزلت کی غزلیہ شاعری کا نمونہ درج ذیل ہے۔

سدھارے گل کہاں سونے پڑے ہیں گلستاں اپنے — گئی ہیں بلبلیں کیدھر جلا کر آشیاں اپنے
سیہ روزی میں میری قدر کو احباب کیا جانیں — اندھیری رات میں کس کو کوئی پہنچانتا ہے گا
مرے مرقد پہ ہو کر شعلہ رویاں سیم بر نکلیں — برنگ شمع میری استخواں سے چشم تر نکلیں

مثنوی''راگ مالا'' عزلتؔ کی شاہکار مثنوی ہے جو فن موسیقی میں ان کی مہارت کا ثبوت ہے۔اس میں انھوں نے ہندوستانی راگوں اور اس کی ذیلی قسموں کی وضاحت کی ہے۔ یہ 1176 اشعار پر مشتمل ہے اور اس کا سنہ تصنیف 1179ھ ہے۔

ہندو مذہب میں ہر راگ اور راگنی کی ایک تصویر اور کچھ خصوصیات مقرر ہیں۔عزلتؔ نے اس مثنوی میں ہر راگ کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ساقی نامہ بھی عزلت کی ایک اہم تصنیف ہے۔

شاہ صادق اورنگ آبادی: شاہ صادق ولؔی کے کم سن ہم عصر تھے۔ لالہ لچھمی نرائن شفیق کے تذکرے چمنستان شعرا میں ان کا ذکر ہے۔ شاہ صادق کا اصل نام سید محمد صادق تھا۔ وہ اردو میں صادق اور فارسی میں مشرقی تخلص کرتے تھے۔ [بحوالہ افسر صدیقی، مخطوطات انجمن، جلد پنجم 368] بعض اردو غزلیات میں انھوں نے اپنا تخلص صادقی بھی استعمال کیا ہے۔ شاہ صادق قادریہ سلسلے میں شاہ عبداللطیف ثالث (کرنول، آندھرا پردیش) کے مرید تھے۔

شاہ صادق کا ذکر وجدیؔ کرنولی نے اپنی مثنوی مخزن عشق میں کیا ہے۔ وجدیؔ کو مثنوی لکھنے کی ترغیب شاہ صادق ہی نے دی تھی۔ انہوں نے ہی اورنگ آباد سے مخزن عشق کا قصہ جو فارسی نثر میں تھا، وجدیؔ کو بھیجا تھا۔ وجدیؔ نے اپنی مثنوی میں شاہ صادق کی مثنوی ''محبوب المعانی'' فارسی دیوان اور دکنی دیوان کا ذکر کیا ہے۔

شاہ صادق کی غزل متصوفانہ خیالات کی آئینہ دار ہے ان کا دکنی دیوان غزلیات، قصائد، مخمس اور رباعیات پر مشتمل ہے۔

مثنوی شمس الحقائق شاہ صادق کی صوفیانہ مثنوی ہے جس میں حقیقت و معرفت کے مسائل کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ مثنوی جو گیارہ سو اشعار پر مشتمل ہے 1145ھ کے بعد کے زمانے میں لکھی گئی۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ ولؔی کا اصل نام اور ان کا سنہ وفات کیا ہے؟

2۔ سراج اورنگ آبادی کی تصانیف کے نام بتایئے؟

3۔ عاجز اورنگ بادی اور سامؔی کی مثنویوں کے نام بتایئے؟

4۔ عزلت کی راگ مالا کس قسم کی تصنیف ہے؟

12.3 ولی کے دیگر دکنی معاصرین

شاہ معظم: شاہ معظم ولی کے بزرگ معاصر تھے۔ وہ بیجاپور کے باشندے تھے۔ ان کے حالات زندگی نہیں ملتے۔ ان کے کلام کی داخلی شہادتوں سے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے عادل شاہی خاندان کے آخری حکمراں سکندر عادل شاہ [1067ھ تا 1083ھ] کا عہد دیکھا اور شہنشاہ اورنگ زیب کا بھی۔ وہ زوال بیجاپور کے عینی شاہد تھے۔

شاہ معظم کا پورا نام محمد حسینی قادری تھا۔ وہ چشتیہ سلسلے میں سید شاہ امین الدین اعلیٰ کے مرید تھے۔ شاہ امین الدین اعلیٰ نے انھیں اپنے مرید و خلیفہ شاہ قادر لنگا کوتال کے حوالے کیا۔ اس طرح شاہ معظم کو شاہ امین اور شاہ قادر لنگا کوتال سے بیعت وارادت حاصل تھی۔

معظم نے اپنی مثنوی ''شجرۃ الاتقیا'' میں شاہ امین الدین اعلیٰ کے علاوہ ان کے فرزند بابا شاہ حسینی اور پوتے سید علی پیر کا بھی ذکر کیا ہے۔ چونکہ علی پیر 1119ھ میں سجادہ نشین ہوئے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ معظم 1119ھ تک حیات تھے۔ معظم ایک کثیر التصانیف شاعر تھے۔ ان کی تصانیف میں غزلیات کا ایک دیوان مثنوی مفتاح الاسرار، مثنوی شجرۃ الاتقیا، مثنوی گلزار چشت، معراج نامہ، ساقی نامہ، قصیدہ گفتار عقل و عشق وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ معظم نے دکنی نثر میں ایک مختصر نثری رسالہ ''شرح شکار نامہ'' بھی لکھا تھا جو حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے فارسی شکار نامہ کی شرح ہے۔ معظم کی غزلیات، صوفیانہ خیالات اور عارفانہ مضامین پر مشتمل ہیں۔ انھوں نے اپنی ہر غزل میں اپنے پیر و مرشد قادر لنگا کوتال کا ذکر والہانہ انداز میں کیا ہے۔

بزرگی اسم اعظم کی لکھا قرآن میں لیکن — معظم کو وِرد کرنے سو قادر نام خوش لگتا
قادر اُپر معظم کرتا ہے سر تصدق — یوں کوئی گر کرے تو اس کو کتے فقیر

قاضی محمود بحری: شاہ معظم کی طرح بحری بھی ولی کے بزرگ معاصر تھے۔ان کا نام سید محمود اور تخلص بحری تھا۔ بحری گوگی کے باشندے تھے جو سگر یا نصرت آباد (علاقہ کرناٹک) کے مضافات میں واقع ہے۔ان کے والد بحرالدین گوگی کے قاضی تھے اور عوام میں قاضی دریا کے نام سے مشہور تھے۔ بحری کے جداعلیٰ سید جمال الدین مکران (ابلوچستان) کے متوطن تھے۔وہ سید عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں تھے۔ بحری کے والد علاقہ مدراس سے گوگی آئے۔انھوں نے بیجاپور کے مشہور صوفی شاہ برہان الدین جانم کے خانوادے میں بیعت وارادت حاصل کی۔ (بحوالہ محمد سخاوت مرزا مرتب مثنوی من لگن' کراچی 1955ء ص 16)

قاضی محمود بحری نے مکتبی تعلیم حاصل نہیں کی لیکن ان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔وہ شیخ محمد باقر عرف منجن بحری کے مرید تھے۔اس کے علاوہ انھیں اپنے والد سے بھی بیعت وخلافت حاصل تھی۔ 1095ھ میں بحری گوگی سے بیجاپور گئے جہاں سکندر عادل شاہ (1083ھ تا 1097ھ) نے ان کی بڑی قدر ومنزلت کی۔ 1097ھ میں اورنگ زیب نے بیجاپور فتح کرلیا تو بحری نے حیدرآباد کا رخ کیا۔اس سفر کے دوران ڈاکوؤں نے ان کا سارا مال واسباب لوٹ لیا جس میں ان کا کلام بھی شامل تھا جو پچاس ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ حیدرآباد میں بحری نے دو سال گزارے تھے کہ مغل فوجیں یہاں بھی حملہ آور ہوئیں۔حیدرآباد پر مغلوں کے قبضے کے بعد بحری مدراس چلے گئے۔(بحوالہ ڈاکٹر زور' تذکرہ مخطوطات' جلد سوم' ص 41) 1100ھ میں بحری اپنے پیرو مرشد کے آستانے میں گوشہ گیر ہوگئے۔ 1130ھ 1717ء میں ان کا انتقال ہوا۔مزار گوگی (کرناٹک) میں واقع ہے۔

دکنی میں بحری کی تین اہم تصانیف ہیں: (1) مثنوی من لگن (2) بنگاب نامہ (3) دیوان غزلیات۔مثنوی من لگن ایک صوفیانہ مثنوی ہے۔بحری نے یہ مثنوی 1112ء میں تصنیف کی۔اس کے اشعار کی تعداد اٹھارہ سو سے زائد ہے۔مثنوی کے ابتدائی ابواب میں حمد' نعت' مدح خلفائے راشدین' اپنے پیرومرشد کی منقبت اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی توصیف بیان کی گئی ہے۔اس کے بعد کے ابواب میں سلوک ومعرفت کے مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں۔مثنوی کی زبان نہایت ادق ہے کیونکہ اس میں سنسکرت الفاظ زیادہ استعمال کیے گئے ہیں 1116ھ میں بحری نے من لگن کے خاص خاص مضامین کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام ''عروسِ عرفاں'' رکھا۔

''من لگن'' کی طرح ''بنگاب نامہ'' بھی بحری کی معرکتہ الآرا تصنیف ہے۔بنگاب نامہ مثنوی کی ہیت میں ہے۔اس میں بارہ بند ہیں جنھیں ''جام'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ہر جام میں بارہ اشعار ہیں۔''بنگاب نامہ'' میں بحری نے معرفت کو بنگاب (بھنگ کا شربت) سے تعبیر کیا ہے۔

بحری کا دیوان ایک سو تیرہ غزلیات پر مشتمل ہے۔غزلیات میں وہ ایک رند اور عاشق کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔غزلیات کا زیادہ تر حصہ عشق مجازی کی ترجمانی کرتا ہے۔بحری کا عشق ارضی ہے اور ان کا محبوب اسی دنیا کا انسان ہے۔ان کے اشعار میں محبوب کے رخسار کی سرخی' چہرے کی آب وتاب' لب ورخسار کی رنگینی اور جذبات کی آنچ صاف محسوس ہوتی ہے۔بحری کو دکن سے بہت محبت تھی۔انھوں نے اپنی شاعری میں حب الوطنی کے جذبات کی ترسیل بڑے خوب صورت انداز میں کی ہے۔

اب دل پہ یہی ہے جو دکن چھوڑ نہ جانا
جُوتے یو دکھن' کھن کے رتن چھوڑ نہ جانا
بحری کو دکن یوں ہے کہ جوں نل کو دمن ہے
پس نل کو ہے لازم جو دمن چھوڑ نہ جانا

سید شاہ حسین ذوقی: ان کا اصل نام سید شاہ حسین' تخلص ذوقی اور خطاب ''بحرالعرفان'' تھا جو ان کے مرشد شاہ خان محمد نے عطا کیا تھا۔ذوقی اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کے ایک شاگرد احمد نے اپنی تصنیف شہادت نامہ میں جس کا سنہ تصنیف 1155ھ ہے ان کے نام کے آگے''

مدظلہٗ'' لکھا ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ ذوقی 1155ھ تک زندہ تھے لیکن ان کے سنہ وفات کا پتہ نہیں چلتا۔ ذوقی ایک پختہ مشق شاعر تھے۔انھیں اپنی شاعری پر ناز تھا۔خود کو نصرتی سے بلند پایہ شاعر اور فصاحت و بلاغت میں'' حسان ہند'' سمجھتے تھے۔ ان کی پانچ مثنویاں دستیاب ہوئی ہیں۔وصال العاشقین ،غوث نامہ، وفات نامہ رسول اور نزہت العاشقین ۔ان کے متعدد مرثیے اور غزلیں بھی دریافت ہوئی ہیں۔ان کی ایک اور تصنیف ''صدوسی مسائل'' کا ذکر بھی ملتا ہے۔

وصال العاشقین ذوقی کی سب سے اہم مثنوی ہے۔اس کا دوسرا نام حسن و دل ہے۔اس میں ذوقی نے وہی داستان نظم کی ہے جسے وجہی نے سب رس کے نام سے دکنی نثر میں لکھا تھا۔اس کا سنہ تصنیف 1109ھ ہے۔ ذوقی کی ایک اور مثنوی ''غوث نامہ'' بھی 1109ھ کی تصنیف ہے۔اس میں شیخ عبدالقادر جیلانی کے فضائل وکمالات بیان کیے گئے ہیں۔

ذوقی کی ایک اور مثنوی نزہت العاشقین ہے جس کا دوسرا نام منصور نامہ ہے۔اس میں منصور بن حلاج کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

سید محمد فراقی بیجاپوری: ان کا اصل نام سید محمد اور فراقی تخلص تھا۔ان کے والد کا نام سید کریم محمد حسینی تھا۔فراقی 1097ھ میں بیجاپور میں پیدا ہوئے ۔فراقی حافظ قرآن ہونے کے ساتھ معقول ومنقول کے عالم، مفسر اور محدث تھے۔انہوں نے 1144ھ میں وفات پائی ۔تصانیف میں ایک ضخیم مثنوی مراۃ الحشر کے علاوہ غزلیات اور نعتیں بھی ان سے یادگار ہیں ۔مثنوی مراۃ الحشر تین ہزار پچپن اشعار پر مشتمل ہے۔فراقی نے یہ مثنوی 1133ھ میں تصنیف کی۔اس میں حمد ونعت کے بعد عالم نزاع، احوال قبر، علامات قیامت، دابتہ الارض کے ظہور، یاجوج و ماجوج اور دجال کے خروج، حضرت عیسیٰ کے نزول، حشر ونشر، میزان، پل صراط وغیرہ کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔فراقی نے مثنوی کے نام اور موضوع کی صراحت اس طرح کی ہے۔

قیامت کا دیکھ حال تس سے بھیتر　　رکھیا نانوں میں مراۃ الحشر کر

فراقی نے غزلیں بھی لکھیں، ان کی غزلوں میں عاشقانہ اور ناصحانہ دونوں رنگ صاف نظر آتے ہیں۔

لذت جو کوئی پایا اہے تجھ عشق کی تلوار کا
یک وار بیٹھے بیچ لگ مشتاق دسرے وار کا

گال ہے خال ہے الک ہے پلک
دل بچارہ کدھر کدھر ہونا

فقیراں با وجود دست و پا بے دست وپا اچھنا
انوں سب کی نظر میں ان کی نظروں میں خدا اچھنا

فراقی کشتہ ہوں اس آن کا جس دم کہ وہ ظالم
کمر سوں کھینچتا خنجر چڑھا تا آستیں آئے

فراقی کا شمار دکنی کے ان شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے شمالی ہند کا سفر کیا تھا۔انھوں نے ولی اور فقیر اللہ آزاد کے ساتھ سورت، احمد آباد اور دلی تک کا سفر کیا تھا۔ولی اور فراقی میں معاصرانہ چشمک تھی۔ ولی کا ایک شعر ہے:

ترے اشعار ایسے نئیں فراقی　　کہ جس پر رشک آوے گا ولی کوں

تاہم ولی نے فراقی کے ایک مصرعے کی تضمین کر کے فراقی کی قدر افزائی بھی کی ہے۔ولی کا شعر درج ذیل ہے جس کا مصرع ثانی فراقی کا ہے۔

ولی مصرع فراقی کا پڑھوں تب جب کہ وہ ظالم　　کمر سوں کھینچتا خنجر چڑھاتا آستیں آوے

اگرچہ فراقی نے دلی کا سفر کیا تھا لیکن مثنوی مراۃ الحشر اور غزلیات کی زبان پر شمالی ہند کی بولی یا ریختہ کا اثر دکھائی نہیں دیتا۔ان کی زبان اور اسلوب پر بیجاپوری زبان اور اسلوب کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔

وجدی کرنولی: ولی وسراج کے عہد کے ایک اہم شاعر وجدی کرنولی ہیں۔وجدی کا نام شیخ وجیہ الدین تھا۔وجدی کی مثنوی ''مخزن عشق'' سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا وطن دھارور (مہاراشٹرا) تھا۔

وجدی پیشے کے اعتبار سے حکیم تھے۔ وہ دھارور سے ترک وطن کر کے کرنول گئے اور نواب اسماعیل خاں پنی کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔ وجدی کی تصانیف کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سنی المسلک صوفی تھے۔ان کے پیر طریقت کا نام سید فخرالدین شامی تھا۔وجدی کے سنہ ولادت اور سنہ وفات کا پتہ نہیں چلا۔ان کی تین تصانیف دریافت ہوئی ہیں جو مثنویات کی شکل میں ہیں۔ان کے نام درج ذیل ہیں:

(1) مخزن عشق (باغ جانفزا)'(2) پنچھی باچھا (پنچھی نامہ)'(3) تحفہ عاشقاں (گل و ہرمز)۔ان مثنویات کے علاوہ ان کے ایک دیوان کا بھی ذکر ملتا ہے جواب ناپید ہے۔البتہ ان کی کچھ غزلیات ملتی ہیں۔

مثنوی مخزن عشق وجدی کی اولین تصنیف ہے۔ یہ مثنوی وجدی نے 1145ھ میں مکمل کی۔اس میں وجدی نے ایران کے بادشاہ منوچہر کیومرثی کے وزیر بیدار دل اور چین کے بادشاہ فغفور کی دختر پری رخ کے عشق کی داستان نظم کی ہے۔ یہ ایک ضخیم مثنوی ہے جو [5054] اشعار پر مشتمل ہے۔

وجدی کی دوسری تصنیف ''پنچھی باچھا'' ہے۔یہ فارسی کے مشہور صوفی شاعر شیخ فریدالدین عطار کی مثنوی منطق الطیر کا دکنی ترجمہ ہے۔وجدی نے اصل مثنوی کا لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ انھوں نے کہیں طوالت اور کہیں اختصار سے کام لیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ مثنوی ترجمہ نہیں معلوم ہوتی۔

وجدی کی تیسری مثنوی ''تحفہ عاشقاں'' ہے۔یہ بھی شیخ فریدالدین عطار ہی کی فارسی مثنوی گل وہرمز کا ترجمہ ہے۔اصل مثنوی مختصر ہے لیکن وجدی نے اس میں اپنی طرف سے حالات و واقعات کا اضافہ کر کے داستان کو طول دیا ہے۔اس میں چار ہزار پانچ سو ابیات ہیں۔اس مثنوی کا سنہ تصنیف 1166ھ ہے۔وجدی عہد ولی کے ایک اہم مثنوی نگار ہیں۔انھوں نے اپنی مثنویوں میں کردار نگاری، منظر کشی اور رزم و بزم کی مرقع کشی کے پر اثر نمونے پیش کیے ہیں۔

ولی ویلوری: ولی ویلوری ولی اورنگ آبادی کے معاصر تھے۔ولی ویلوری کا اصل نام میر ولی فیاض تھا۔وہ ویلور (ٹاملناڈو) کے باشندے تھے۔ابتدا میں انھوں نے سات گڑھ (شمالی ارکاٹ۔ٹامل ناڈو) کے امیر حراست خاں کی ملازمت اختیار کی لیکن بعض وجوہات کی بنا پر انھیں یہ ملازمت چھوڑنی پڑی۔اس کے بعد وہ کڑپہ (آندھراپردیش) کے صوبیدار نواب عبدالمجید خاں کے دربار میں حاضر ہوئے۔نواب نے انھیں سدھوٹ میں ملازمت دی۔مثنوی رتن پدم میں ولی ویلوری نے ان تمام تفصیلات کا ذکر کیا ہے۔

سدھوٹ میں ولی نے طویل مدت تک قیام کیا۔اس کے بعد وہ ویلور واپس آگئے اور اپنی زندگی کا آخری حصہ وہیں گزارا۔ولی ویلوری نے ارکاٹ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ولی ویلوری کا سنہ وفات نامعلوم ہے۔ولی ویلوری نے 1162ھ میں مثنوی روضۃ العقبیٰ تصنیف کی۔لہذا یہ بات یقینی ہے کہ ان کا انتقال 1162ھ کے بعد ہوا۔ولی ویلوری کی درج ذیل تصانیف کا ذکر ملتا ہے۔

1۔ روضۃ الشہدا　2۔ روضۃ الانوار　3۔ روضۃ العقبیٰ　4۔ دعائے فاطمہ　5۔ مثنوی رتن پدم۔

ان پانچ مثنویوں کے علاوہ ولی کی تین اور تصانیف کا ذکر ملتا ہے۔ 1۔ مثنوی وفات نامہ نبیؐ 2۔ مثنوی اگر و ملاگیر　3 ۔ تنبیہ نامہ۔

روضۃ الشہدا ولی ویلوری کی سب سے مشہور مثنوی ہے جو تقریباً ساڑھے پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ایک عرصے تک اسے ولی اورنگ آبادی

سے منسوب کیا جاتا رہا لیکن بعد کی تحقیق سے ثابت ہوا کہ یہ ولی ویلوری کی تصنیف ہے۔ یہ دراصل ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف روضۃ الشہدا کا منظوم دکنی ترجمہ ہے۔ چونکہ اس میں دس ابواب ہیں اس لیے اس کا نام دہ مجلس بھی ہے۔اس میں کربلا سے ماقبل اور کربلا کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔روضۃ الشہدا کا سنہ تصنیف 1137ھ ہے۔

روضۃ الانوار ولی ویلوری کی ایک نایاب مثنوی ہے جس آنحضرتؐ کی سیرت طیبہ بیان کی گئی ہے۔اس کا سنہ تصنیف 1159ھ ہے۔روضۃ العقبیٰ بھی ولی ویلوری کی ایک نادر مثنوی ہے۔اس میں احوال آخرت کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس کا سنہ تصنیف 1162ھ ہے۔

رتن پدم وَلی ویلوری کی ایک اہم مثنوی ہے۔ اس میں چتوڑ کے راجہ رتن سین اور سراندیپ کی راجکماری پدماوت کی داستان محبت بیان کی گئی ہے۔اس کا قصہ ملک محمد جائسی کی پدماوت سے ماخوذ ہے۔وَلی ویلوری کی مثنوی رتن پدم چار ہزار اشعار پر مشتمل تھی۔لیکن اب یہ مثنوی دستیاب نہیں ہے۔

ضعیفی: شیخ داؤد نام ضعیفی تخلص قطب شاہی سلطنت کے عہد زوال کے شاعر تھے۔ان کی پرورش قطب شاہی دور کے آخر میں ہوئی تھی (بحوالہ نصیرالدین ہاشمی' یورپ میں دکھنی مخطوطات ص 331) انھیں اورنگ زیب عالم گیر کے عہد کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ان کی تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک متبحر عالم دین تھے اور انھیں عربی و فارسی زبانوں پر کامل عبور حاصل تھا۔ضعیفی کو حضرت گیسو دراز سے بڑی گہری عقیدت تھی۔انہوں نے اپنی مثنویوں میں حضرت گیسو دراز کی تعریف کی ہے۔ضعیفی ایک کثیر التصانیف مذہبی شاعر تھے۔ان کی درج ذیل مثنویوں کا پتہ چلا ہے:

(1) ہدایت ہندی،(2) نصیحت مدن،(3) عشق صادق،(4) مثنوی تصرف،(5) رسالہ اذکار،(6) حرمت علیکم،(7) قصہ کفن چور،(8) وفات نامہ،(9) رسالہ اذکار (منظوم)

ہدایت ہندی ایک فقہی مثنوی ہے جس میں احکام شریعت کی وضاحت کی گئی ہے۔ضعیفی نے یہ مثنوی 1100ھ 1688ء میں تصنیف کی۔ ہدایت ہندی کسی عربی یا فارسی کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ اسی موضوع کی عربی و فارسی کتب کو پیش نظر رکھ کر مصنف [ضعیفی] نے خود ایک نئی کتاب دکنی میں مرتب کی ہے (ڈاکٹر زور' تذکرہ مخطوطات ج ا' ص 44) اس مثنوی میں ضعیفی نے اورنگ زیب کی مدح بھی لکھی ہے۔یہ اورنگ زیب کی شان میں کسی دکنی شاعر کی پہلی مدح ہے۔ضعیفی کی یہ مثنوی زائد از تین ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔

نصیحت مدن تقریباً ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں احادیث نبویؐ کی روشنی میں اخلاق و نصیحت کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔مثنوی عشق صادق ایک ایسی عورت کی داستان ہے جسے رسول اکرمؐ سے سچی عقیدت تھی۔اس میں ضعیفی نے دکن کی خواتین کی زبان استعمال کی ہے۔اس طرح اس مثنوی میں خواتینِ دکن کی بول چال کی زبان اور ان کے محاورے محفوظ ہو گئے ہیں

ضعیفی کی مثنوی ''حرمت علیکم'' ایک مختصر مثنوی ہے جس میں ان رشتوں کی صراحت کی گئی ہے جن سے نکاح حرام ہے۔مثنوی قصہ کفن چور' میں ایک چور کی روداد بیان کی گئی ہے جو مردوں کے کفن چرایا کرتا تھا۔لیکن آخر میں وہ توبہ کر کے سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے۔ان مثنویوں کے علاوہ ضعیفی کی ایک مثنوی وفات نامہ اور ایک رسالہ اذکار (منظوم) کا بھی ذکر ملتا ہے۔ضعیفی کی متعدد غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔

عشرتی: عشرتی دکن کے دور انتشار کے ایک اہم شاعر اور ضعیفی کی طرح وَلی اورنگ آبادی کے بزرگ معاصر تھے۔عشرتی کا اصل نام سید محمد تھا۔ان کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات نامعلوم ہیں۔عشرتی کے والد عراق سے دکن آئے تھے۔[بحوالہ نصیرالدین ہاشمی۔ وضاحتی فہرست کتب خانہ سالار جنگ ص 619] زوال بیجاپور کے بعد عشرتی اورنگ زیب کی ملازمت میں داخل ہوئے اورنگ زیب انھیں شاہ راجو حسینی [سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے مرشد] کی متروکہ جاگیرات عطا کرنا چاہتا تھا لیکن عشرتی نے انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔اورنگ زیب نے ان کی سفارش پر یہ جاگیرات شاہ راجو حسینی کی اولاد کو واپس کر دیں۔عشرتی کا مزار شاہ راجو حسینی کے گنبد (مصری گنج۔حیدرآباد) کے پہلو میں واقع ہے۔

عشرتی کا گھرانہ سادات درویش کے نام سے مشہور تھا۔عشرتی کی اولاد میں ان کے ایک لڑکے سید احمد ہنر بھی شاعر تھے جنھوں ابن نشاطی کی ''پھول بن'' کے جواب میں ایک مثنوی ''نیہہ درپن'' لکھی۔اسی طرح عشرتی کے ایک پوتے احسان علی احسانؔ بھی ایک اچھے شاعر تھے۔انھوں نے ''گلشن احسان'' کے نام سے ایک ضخیم مثنوی لکھی۔

عشرتی کی تین تصانیف کا پتہ چلا ہے۔(1) قصہ پدماوت،(2) چت لگن،(3) دیپک پتنگ۔قصہ پدماوت فارسی میں ہے۔اس کا سنہ تصنیف 1110ھ ہے۔عشرتی نے اس میں ملک محمد جائسی کی پدماوت کا خلاصہ پیش کیا ہے۔چت لگن دکنی زبان میں لکھی گئی ایک مثنوی ہے جس میں عشرتی نے ایک قدیم طرز کی داستان بیان کی ہے۔مثنوی دیپک پتنگ عشرتی کی شاہکار مثنوی ہے۔اس میں انھوں نے ملک محمد جائسی کی پدماوت کا دکنی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔لیکن یہ پدماوت کا براہ راست ترجمہ نہیں ہے بلکہ عشرتی نے پدماوت کے فارسی ترجمے مثنوی شمع و پروانہ (مصنفہ عاقل خاں رازی) کو پیش نظر رکھا ہے۔ڈاکٹر زور نے مثنوی دیپک پتنگ کا سنہ تصنیف 1114ھ بیان متعین کیا ہے۔[ڈاکٹر زور'دکنی ادب کی تاریخ'ص 93]۔

والہ موسوی: والہ موسوی ولی اورنگ آبادی کے ہم عصر تھے۔ان کا پورا نام میر سید محمد اور تخلص والہؔ تھا۔وہ ملا سید محمد باقر موسوی فراسانی کے فرزند تھے۔ان کے سنہ پیدائش کا علم نہیں۔مقام پیدائش خراسان ہے۔والہ نے مروجہ علوم کی تکمیل اپنے والد کے ہاں کی۔والد کے انتقال کے بعد وہ خراسان سے نکل پڑے اور سفر کرتے ہوئے دہلی آئے۔نظام الملک آصفجاہ اول نے انھیں اپنا مصاحب مقرر کیا۔وہ ان کے ساتھ حیدرآباد آئے اور دکن ہی کے ہور ہے۔والہ موسوی ارکاٹ کے نواب محمد علی والا جاہ کے ہم زلف تھے۔اس رشتے سے وہ حیدرآباد سے ارکاٹ گئے اور ترچناپلی میں مقیم ہو گئے۔وہیں 1184ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

والہ ایک زبردست عالم' سخنور' انشا پرداز اور نقاد تھے۔مدراس میں اکثر شعرا ان کے علم وفضل سے مستفید ہوئے۔فارسی میں وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔فارسی کے علاوہ والہ نے دکنی زبان میں بھی شاعری کی۔دکنی کی اہم مثنوی ''طالب وموہنی'' والہ کی تصنیف ہے۔ڈاکٹر زور کا خیال ہے کہ یہ مثنوی 1150ھ کے قریبی زمانے میں حیدرآباد میں لکھی گئی۔[ڈاکٹر زور' طالب وموہنی (مطبوعہ) مقدمہ ص 17] اس میں طالب نامی ایک نوجوان مسلمان مسافر اور ایک ہندو مہاجن کی دختر موہنی کے عشق کی المیہ داستان بیان کی گئی ہے۔بعض محققوں کا خیال ہے کہ میر تقی میر نے اپنی مثنوی دریائے عشق کا پلاٹ اسی مثنوی سے لیا ہے۔خالق باری کی طرز پر لکھی گئی ایک منظوم لغت 'رازق باری' بھی والہؔ کی تصنیف بتائی جاتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ شاہ معظم کی شعری تصانیف کا ذکر کیجیے؟

2۔ بحریؔ کے حالات بیان کیجیے؟

3۔ وجدیؔ کہاں کے باشندے تھے۔ان کی کتنی مثنویاں ملتی ہیں؟

4۔ ولی ویلوری کی ادبی خدمات بیان کیجیے؟

12.4 ولی کے گجراتی معاصرین

ولیؔ اور سراجؔ کے عہد میں علاقہ گجرات میں بھی متعدد اُردو شعرا دادِ سخن دے رہے تھے۔ان میں بعض ولیؔ سے عمر میں بہت بڑے تھے' بعض ہم عمر تھے اور بعض ولیؔ کے شاگرد تھے۔ذیل میں ان میں سے چند اہم شعرا کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

شیخ محمد امین گجراتی: امین کا پورا نام شیخ محمد امین تھا۔وہ گودھرا (گجرات) کے باشندے تھے۔امین کے حالات زندگی کی تفصیلات نامعلوم ہیں۔اس نے چار مثنویاں لکھیں جن کے نام یہ ہیں۔(1) یوسف زلیخا (2) تولد نامہ (3) معراج نامہ (4) وفات نامہ

ان مثنویوں کے علاوہ اس کا ایک قصیدہ بھی ملتا ہے۔امین کی اصل شہرت مثنوی یوسف زلیخا کی بدولت ہے۔اس نے یہ مثنوی مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں 1109ھ (1297ء) میں مکمل کی۔قدیم زمانے میں گجرات کے شعرا اردو کو گجری کہتے تھے۔امین بھی اپنی زبان گجری کہتا ہے۔

سنو مطلب اہے اب یوں امین کا لکھے گجری منیں یوسف زلیخا

درج ذیل شعر میں اس نے مثنوی کے اشعار کی تعداد اور اپنے وطن کی وضاحت کی ہے

بیتاں چالیس سو چودہ اور سو ہے لکھا گودھرے کے بیچ سن لیو

خروشی: خروشی کا ذکر کسی تذکرے یا تاریخ میں نہیں ملتا لیکن بعد کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ ان کا پورا نام شاہ حبیب اللہ تھا اور ان کا اصل وطن کشمیر تھا۔معلوم نہیں خود خروشی نے کشمیر سے گجرات کو ہجرت کی یا ان کے آبا و اجداد میں سے کسی نے کشمیر سے ترک وطن کر کے گجرات میں سکونت اختیار کی خروشی کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں بھی نا معلوم ہیں۔انھوں نے ولی کی غزلوں کی زمینوں میں غزلیں لکھی ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ولی کے ہم عصر تھے۔ خروشی کی اٹھائیس غزلیات دستیاب ہوئی ہیں۔کلام کی غالب کیفیت صوفیانہ ہے لیکن مجازی رنگ کے اشعار بھی موجود ہیں۔

اگر وہ نازنیں گلگوں قبا گلشن میں جاوے گا
گریباں چاک کر گلشن میں ہر یک گل کو آوے گا
طاقت کسے ہے شوخ ترے مکھ کی تاب کا
سینہ جلا ہے جس کے سبب آفتاب کا

سید محمد اشرف: ان کا نام سید محمد اشرف اور تخلص اشرف تھا۔متعدد تذکروں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔

اشرف کے جد اعلیٰ کا وطن مدینہ منورہ تھا۔اشرف کے والد کا نام شیخ محمد موسیٰ مدنی الشاہی تھا۔اشرف احمد آباد کے مشہور صوفی بزرگ شاہ عالم کے خاندان میں مرید تھے۔شعر و سخن میں اشرف ولی کے شاگرد تھے۔وہ ایک پرگو شاعر تھے۔غزل کے علاوہ انہوں نے مثنوی اور مرثیہ جیسی اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔اشرف کو اپنے زمانے میں بڑی مقبولیت حاصل تھی۔انھیں استاد فن مانا جاتا تھا۔اشرف کا ایک دیوان غزلیات' ایک مثنوی موسوم بہ جنگ نامہ حیدر اور تیرہ مرثیے دستیاب ہوئے ہیں جو نہایت پر اثر ہیں۔

اشرف کا اصل میدان غزل ہے۔ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔اشرف کی غزل گوئی کی نمایاں خصوصیت جذبات کی فراوانی اور بیان کی سادگی ہے۔ان کا محبوب کوئی ماورائی ہستی نہیں بلکہ ارضی مخلوق ہے۔اس کی خصوصیات وہی ہیں جو عام انسانوں میں ملتی ہیں۔اشرف جب اپنے محبوب سے خطاب کرتے ہیں تو اس کے ایک ایک لفظ سے اس کے محبت کے جذبات اور دلی کیفیات اپنا جادو جگاتی نظر آتی ہیں۔نمونۂ کلام:

اے ہوش ربا سندر مجھ پاس ٹک آتی جا
رشتے کوں محبت کے بازو پہ بندھاتی جا
یوں دل منے خواہش ہے تجھ گھر کی طرف آوں
ٹک ناؤں بتاتی جا یا ٹھاوں بتاتی جا
دیدار ستی اپنے محروم نہ رکھ مجھ کوں
آنچل کوں اٹھا مکھ سوں' ٹک درس دکھاتی جا

ہاشم علی: ان کا نام ہاشم علی تھا اور وہ اپنے پورے نام کو بہ طور تخلص استعمال کرتے تھے۔ہاشم علی کا وطن گجرات تھا جس کا ذکر انھوں نے اپنے اشعار میں کیا

ہے۔ ہاشم علی گجرات کے اہم مرثیہ گو شاعر تھے۔ ان کے معاصرین میں روحی، مرزا دکنی اور قادر مرثیہ گوئی میں مشہور ہوئے۔ ہاشم علی ان شاعروں کو اس طرح یاد کرتا ہے۔

ہزار حیف نئیں شاعران دکن   سو روحی و مرزا و قادر نہیں

ہاشم علی نے اپنے مرثیوں کا مجموعہ 'دیوان حسینی' کے نام سے مرتب کیا۔ اس دیوان سے پتہ چلتا ہے کہ ہاشم علی نے مرثیے کے سوا کسی دوسری صنف سخن میں طبع آزمائی نہیں کی۔

ہاشم علی ہمیشہ ثنا خوان راہ کا   جز مدح و منقبت اس نے لکھا نہیں

دیوان حسینی میں مرثیوں کی تعداد تین سو ہے جو ردیف وار مرتب کیے گئے ہیں۔ ہاشم علی کہتے ہیں کہ ان کا اصل مقصد شاعری نہیں گریہ و زاری ہے۔ یہ مراثی زیادہ تر مربع اور مخمس کی ہیئت میں ہیں اور شاذ غزل کی ہیئت میں بھی۔

غلامی: غلامی کا نام غلام حیدر یا غلام مرتضیٰ تھا۔ ان کا وطن گجرات تھا۔ یہ ہاشم علی کے ہم عصر تھے۔ غلامی بنیادی طور پر مرثیہ گو تھے لیکن انھوں نے چند کبت بھی لکھے ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے سترہ مرثیے دستیاب ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر زور کے مطابق ''اپنے ہم عصروں ہاشم علی اور رضا اور دیگر ساتھیوں کے مقابلے میں حقیقت نگاری کے لحاظ سے وہ بہت اچھا شاعر تھا۔ اس کے خیالات بھی اعلیٰ تھے۔ کربلا کے دل شکن واقعات کو اس نے اس انداز سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا ان کو حقیقی تاریخی واقعات سمجھنے لگتا ہے۔''

ہاشم علی اور غلامی کے علاوہ رضا گجراتی بھی اس دور کا ایک اہم مرثیہ گو شاعر تھا جس کے چند مرثیے ملتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ امین گجراتی کے شعری کارناموں پر روشنی ڈالیے۔
2۔ دیوان حسینی کس قسم کا دیوان ہے، واضح کیجیے۔
3۔ خروشی کے حالات بیان کیجیے۔

12.5 خلاصہ

مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی فتح دکن آصف جاہی سلطنت کے قیام کے ابتدائی دور تک کا زمانہ دکنی ادب کا مغل دور کہلاتا ہے۔ مغل دور میں دکنی شعرا اور ادبا پریشانی اور ناقدری کا شکار ہو گئے تھے کیونکہ ان کی سرپرستی کرنے والی دکنی سلطنتیں یعنی بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت اور گولکنڈے کی قطب شاہی سلطنت زوال یاب ہو چکی تھیں۔ اس دور میں دو اہم شعرا سرزمین اورنگ آباد سے اٹھے ایک ولؔی اور دوسرے سراج۔ دکنی شعر و ادب کا یہ دور ایک طرح سے ولؔی اور سراؔج کا عہد تھا۔

ولؔی اورنگ آباد کے باشندے تھے۔ بعض مصنفین نے انھیں گجرات کا باشندہ بتایا ہے لیکن ان کے دیوان کی داخلی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اورنگ آباد کے باشندے تھے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں ولؔی ایک عہد ساز شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے اردو غزل کا رشتہ فارسی غزل سے جوڑا اور روایتی دکنی غزل کو ایک نئی سمت عطا کی۔ ولؔی نے 1700ء میں دہلی کا سفر کیا۔ ان کے سفر دہلی کے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ ولؔی کی تقلید میں شمالی ہند کے شعرا نے اردو میں باقاعدہ غزل گوئی کا آغاز کیا۔ اس طرح ولؔی کے اثر سے شمالی ہند میں اردو غزل کو فروغ حاصل ہوا۔

ولؔی کے جانشین کے طور پر سراج کا نام روشن ہوا۔ وہ 1128ھ میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ وہ نہایت زود گو شاعر تھے۔ ان کی غزل میں عشق کی حرارت اور صوفیانہ خیالات کی سرمستی پائی جاتی ہے۔ وہ شاہ عبدالرحمٰن چشتی کے مرید تھے۔ مرشد کے کہنے پر انھوں نے شاعری ترک کر دی۔ سراج

کی کلیات میں غزلوں کے علاوہ مثنویات، رباعیاں، قصائد وغیرہ شامل ہیں۔علاوہ ازیں ایک مثنوی" بوستان خیال" بھی سراج کی اہم تصنیف ہے جس میں انھوں نے اپنی روداد عشق بیان کی ہے۔

ولؔی اور سراج کے عہد میں متعدد شعرا دکن کے مختلف علاقوں اور گجرات میں دادِ سخن دے رہے تھے۔ولی اور سراج کے اورنگ آبادی۔معاصرین میں داؤدؔ غزل گو شاعر تھے جن سے غزلیات کا ایک دیوان یادگار ہے۔وہ اپنے آپ کو ولی کا جانشین کہتے تھے۔عاجزؔ بھی اورنگ آباد کے اہم شاعر تھے۔ انھوں نے فارسی اور اردو میں ایک ایک دیوان مرتب کیا۔علاوہ ازیں لال وگوہر کے نام سے ایک داستانی مثنوی لکھی۔اسی دور میں شاہ قاسم بھی تھے جن کا دیوان غزلیات شائع ہو چکا ہے۔سامؔی، ولؔی کے کم عمر معاصر تھے۔ان کا دیوان غزلیات ناپید ہے لیکن مثنوی ''سروشمشاد'' موجود ہے۔ان کے علاوہ عزلت اور شاہ صادق بھی عہد ولی وسراج کے اہم اورنگ آبادی شعرا ہیں۔

ولی اور سراج کے دیگر دکنی معاصرین میں شاہ معظم حسینی بیجاپور کے مشہور صوفی حضرت امین الدین اعلیٰ کے مرید تھے۔انھوں نے غزلیات کے دیوان کے علاوہ متعدد صوفیانہ مثنویاں لکھیں جیسے شجرہ الاتقیا، گلزار چشت، معراج نامہ، ساقی نامہ وغیرہ۔اسی زمانے کے ایک مشہور صوفی شاعر قاضی محمد بحری ہیں جنھوں نے بیجاپور کے علاوہ حیدرآباد میں بھی زندگی کا کچھ عرصہ گزارا۔ان کی تصانیف میں دیوان غزلیات کے علاوہ مثنوی ''من لگن'' نہایت مشہور اور مقبول ہے۔

سید شاہ حسین ذوقؔی بھی صوفی شاعر تھے۔انھوں نے سب رس کی داستان کو وصال العاشقین کے نام سے مثنوی کی شکل میں لکھا۔دیگر مثنویوں میں غوث نامہ، وفات نامہ رسول اور نزہت العاشقین شامل ہیں۔فراقی بیجاپوری ولؔی کے کم عمر معاصر تھے۔ان کی چند غزلیات اور ایک ضخیم مثنوی "مراۃ الحشر" دستیاب ہوئی ہے جس میں قیامت کے احوال بیان کیے ہیں۔

وجدی اصلاً دھارور (مہاراشٹرا) کے باشندے تھے لیکن کرنول میں بود و باش اختیار کی تھی۔ان سے تین مثنویاں، مخزن عشق، پنچھی باچھا اور تحفۂ عاشقاں یادگار ہیں۔ولی ویلوری بھی اس دور کے اہم دکنی شاعر تھے جنھوں نے ملا حسین واعظ کاشفی کی مثنوی روضۃ الشہدا کا دکنی زبان میں منظوم ترجمہ کیا۔ان کی آٹھ مثنویوں کا ذکر ملتا ہے لیکن ان میں چار دستیاب نہیں ہیں۔ملا داؤد ضعیفی اس دور کے پہلے دکنی شاعر ہیں جنھوں نے اورنگ زیب کی مدح لکھی۔انھوں نے فقہی مسائل اور اخلاق وتصوف پر مثنویاں لکھیں۔عشرتی بھی اس دور کے اہم شاعر تھے جنھوں نے تین مثنویاں قصہ پدماوت، چت لگن اور دیپک پتنگ لکھیں۔

ولی اور سراج کے عہد میں علاقہ گجرات میں بھی اردو شاعری کے چرچے تھے۔ولؔی کے گجراتی معاصرین میں شیخ محمد امین گجراتی نہایت اہم ہیں جن کی چار مثنویاں ملتی ہیں۔ان میں مثنوی یوسف زلیخا اہم ہے۔خروشی نامی شاعر نے ولی کی زمینوں میں غزلیں لکھیں۔ہاشم علی گجرات کا سب بڑا مرثیہ گو شاعر تھا۔اس کے مرثیوں کا مجموعہ دیوان حسینی ہے جس میں سو مرثیے ہیں۔ہاشم علی کے علاوہ غلامی اور رضا گجراتی بھی اس دور کے اہم مرثیہ گو شعرا تھے۔

12.6 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

1۔ولؔی کے حالات زندگی اور ان کے کلام کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

2۔ولؔی کے اورنگ آبادی معاصرین کا تعارف کرائیے۔

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

1۔سراج اورنگ آبادی پر مختصر نوٹ تحریر کیجیے؟

2۔ولی کے گجراتی معاصرین کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

12.7 فرہنگ

الفاظ	معنی
مجتہد	کوشش کرنے والا، راہ نیک نکالنے والا
پتیارا	اعتماد، اعتبار
غمزہ	آنکھ اور بھوں سے معشوق کا اشارہ کرنا
متنازعہ	جس پر جھگڑا ہو
سرچشمہ	پانی کا سوتا
انبساط	خوشی، کھلنا
چین پیشانی	پیشانی کی شکن
کھبالے بال	گھنگریالے بال
جودھا	پہلوان، بہادر
بان	تیر
آزادمشرب	آزادخیال
افاقہ	مرض یا تکلیف سے نجات پانا
الہام	دل پر خدا کی طرف سے کوئی بات ظاہر ہو جانا

12.8 سفارش کردہ کتابیں

1۔	دکن میں اردو	نصیرالدین ہاشمی
2۔	تاریخ ادب اردو جلد اول	ڈاکٹر جمیل جالبی
3۔	تاریخ ادب اردو، جلد اول و دوم	پروفیسر سیدہ جعفر، گیان چند جین
4۔	اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام	مولوی عبدالحق
5۔	دکنی ادب	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

پانچواں باب: شمالی ہند میں شعر و ادب کا ارتقا

اکائی 13 دبستانِ دہلی

اکائی کے اجزا

13.0 مقصد

13.1 تمہید

13.2 دبستان دہلی کا سماجی و تہذیبی پس منظر

13.3 میر تقی میرؔ

13.4 مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

13.5 دبستانِ دہلی کے دیگر شعرا

13.5.1 مرزا محمد رفیع سوداؔ

13.5.2 خواجہ میر دردؔ

13.5.3 میر سوزؔ

13.5.4 مومن خاں مومن

13.5.5 شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ

13.5.6 بہادر شاہ ظفرؔ

13.6 دبستانِ دہلی کی خصوصیات

13.7 خلاصہ

13.8 نمونۂ امتحانی سوالات

13.9 فرہنگ

13.10 سفارش کردہ کتابیں

13.0 مقصد

اس اکائی میں دبستان دہلی کے شعرا اور خصوصیات کو سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔اس اکائی کے پڑھنے کے بعد طلبا اس قابل ہوسکیں گے کہ

- ☆ دبستان دہلی کی تہذیبی وسماجی مسائل کے بارے میں مختصراً جان سکیں
- ☆ میر تقی میرؔ اور غالبؔ کی حیات وشاعری کو بیان کرنے کے قابل ہوسکیں
- ☆ مرزا محمد رفیع سوداؔ، خواجہ میر دردؔ، میر سوزؔ، مومن خاں مومنؔ، ذوقؔ اور بہادر شاہ ظفرؔ کی شاعری کو مختصراً جان سکیں اور
- ☆ دبستان دہلی کو سمجھ سکیں اور اس کی خصوصیات بیان کرنے کے قابل ہوسکیں۔

13.1 تمہید

اُردو شاعری کے دو اہم دبستان ہیں' ایک دبستانِ لکھنؤ اور دوسرا دبستانِ دہلی۔اس اکائی میں دبستانِ دہلی کی شاعری کے تعلق سے گفتگو کی گئی ہے۔دبستانِ دہلی کے سماجی وتہذیبی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس دبستان کے دو الگ الگ عہد یعنی اٹھارہویں وانیسویں صدی کے دو اہم شعرا میر تقی میرؔ اور مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کی حیات اور ان کی شاعری پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔میرؔ اور غالبؔ کے ہم عصر جو اہم شعرا ہیں ان کی شاعری پر بھی مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔دبستانِ دہلی کی خصوصیات پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔آخر میں اکائی کا خلاصہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس اکائی میں اپنی معلومات کی جانچ کے لیے سوالات بھی دیے گئے ہیں۔پوری اکائی مکمل ہونے پر طلبا کی سہولت کے لیے نمونۂ امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں۔آخر میں فرہنگ اور سفارش کردہ کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔

13.2 دبستانِ دہلی کا سماجی وتہذیبی پس منظر

دبستان دہلی کو سمجھنے کے لیے اورنگ زیب عالمگیر کے بعد ہندوستان کا سیاسی، سماجی وتہذیبی منظر نامہ پیش نظر رکھنا ہوگا۔شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے 1707ء میں وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔بادشاہت حاصل کرنے کی غرض سے اپنے بھائیوں یا قریبی رشتہ داروں کو قتل کرنا اس وقت کا رواج بن گیا تھا۔اورنگ زیب نے اسی ڈر سے اپنے تینوں بیٹوں معظم، اعظم اور کام بخش میں اپنی سلطنت تقسیم کرکے جنگ وجدال سے بچانے کی کوشش کی مگر ایسا نہیں ہوا۔معظم نے اپنے دونوں بھائیوں کو قتل کردیا اور شاہ عالم بہادر شاہ کا لقب اختیار کرکے حکومت کرنے لگا۔مگر پانچ سال بعد ہی اس کا انتقال ہوگیا۔بہادر شاہ کے چار بیٹے تھے جن میں معز الدین جہاں دار شاہ نے اپنے تینوں بھائی عظیم الشان، رفیع الشان اور نجستہ اختر جہاں شاہ کو قتل کرکے 1712ء میں بادشاہت حاصل کرلی۔جہاں دار شاہ ایک نااہل اور عیاش بادشاہ تھا۔اس لیے دوسرے افراد شاہی تخت پر نظر رکھنے لگے۔جہاں دار کے بھتیجے فرخ سیر نے 1713ء میں بادشاہ کو شکست دے کر خود شاہی تخت پر قبضہ کرلیا۔مگر سید برادران کو اس کی کوئی بات انتہائی ناپسند گزری اور انہوں نے 1719ء میں فرخ سیر کا قتل کرادیا۔پھر محمد شاہ تخت نشیں ہوا۔محمد شاہ کے دور میں ملک کو پے در پے مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔روہیلوں کی بغاوت ہوئی، نادر شاہ واحمد شاہ ابدالی کے حملے ہوئے اور ملک میں خانہ جنگی کے حالات پیدا ہوگئے۔1748ء میں محمد شاہ کا انتقال ہوا تو احمد شاہ نے حکومت سنبھالی مگر 1754ء احمد شاہ کا بھی انتقال ہوگیا۔پھر عالم گیر ثانی، اس کے بعد شاہ جہاں ثانی کچھ عرصے تک تخت نشیں رہے۔احمد شاہ ابدالی نے پھر دہلی پر حملہ کیا اور 1761ء میں اس پر قبضہ کرکے شاہ عالم ثانی کو تخت نشیں کیا۔اس طرح مغلیہ حکومت بالکل تباہی کے دہانے پر پہونچ گئی۔میر تقی میرؔ نے احمد شاہ ابدالی کی قتل وغارت گری کا حال 'ذکرِ میرؔ' میں تفصیل سے لکھا ہے۔

مغلیہ حکومت کی کمزوری پر انگریزوں نے پوری نظر رکھی تھی۔وہ دھیرے دھیرے مغلیہ حکومت پر قبضہ کرنے لگے۔1803ء میں ولزلی نے دہلی

پر قبضہ کرلیا مگر بادشاہ کا نام باقی رہا۔شہنشاہ دہلی کے احکامات صرف قلعے تک محدود ہوگئے۔ 1806ء میں اکبر شاہ ثانی تخت نشیں ہوئے۔اس طرح کئی بادشاہ بنے مگر انہوں نے صرف انگریزوں کی کٹھ پتلی کے طور پر کام کیے۔عوام معاشی تنگی اور بدحالی سے گزرنے لگی۔ بہادر شاہ ظفر مغلیہ حکومت کے سب سے آخری بادشاہ رہے۔انگریزوں نے مغلیہ حکومت پر اتنا قبضہ کرلیا تھا کہ بادشاہ کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔اسی درمیان انقلاب 1857ء کا واقعہ رونما ہوا جس میں بے انتہا ہندوستانی انقلابی شہید ہوئے۔انگریزوں کو بہادر شاہ ظفؔر سے پوری طرح حکومت چھین لینے کا اچھا بہانہ مل گیا۔انہوں نے بہادر شاہ ظفؔر پر 1857ء میں ہندوستانی انقلابیوں کا ساتھ دینے کے جرم میں مقدمہ چلایا۔ پھر انہیں گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا گیا جہاں 1862ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ایک لمبے عرصے تک دہلی میں فسادات، بدنظمی اور بیچارگی صاف نظر آتی ہے۔ مغلیہ حکومت اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی۔عوام معاشی تنگ دستی سے پریشان تھی۔کسی ملازم کو وقت پر تنخواہ نہیں ملتی تھی۔شاہی زندگی گزارنے والے قلعہ کے افراد کو کھانے کے لالے پڑ گئے تھے۔ان تمام صورت حال کا تہذیب وتمدن اور ادب پر براہ راست اثر پڑا۔ خاص کر اردو شاعری پر اس کے دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ دہلی کے اسی ماحول میں اُردو شاعری پروان چڑھی۔میرؔ نے دہلی کی اس صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے لکھا ؎

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تخت و تاج کا

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے

صحیح جواب کی نشاندہی کیجیے

1۔ اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال کب ہوا؟ ( )

(الف)1720ء (ب)1707ء (ج)1607ء (د)ان میں سے کوئی نہیں

2۔ مغلیہ حکومت کے آخری بادشاہ کا نام بتائیں۔ ( )

(الف)بہادر شاہ ظفر (ب) عالم گیر ثانی (ج)شاہ عالم ثانی (د) اورنگ زیب

3۔ بہادر شاہ ظفؔر کو گرفتار کر کے کہاں بھیجا گیا تھا؟ ( )

(الف)رنگون (ب) رامپور (ج)لکھنؤ (د)کلکتہ

4۔ اکبر شاہ ثانی کس سنہ میں تخت نشیں ہوا؟ ( )

(الف) 1810ء (ب)1812ء (ج)1806ء (د)1808ء

13.3 میر تقی میرؔ

میر تقی میرؔ کی پیدائش 1722ء میں آگرہ میں ہوئی۔اصل نام محمد تقی اور تخلص میرؔ تھا۔ان کے والد کا نام محمد علی متقی تھا۔ میرؔ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد کے دوست امان اللہ اور بعد میں اپنے والد سے حاصل کی۔میرؔ ابھی بمشکل گیارہ برس کی عمر کو پہنچے تھے کہ ان کے والد کا 1733ء میں انتقال ہوگیا۔ یہیں سے میرؔ کی زندگی میں رنج والم کا باب کھل گیا۔ میرؔ نے آگرہ میں ہی روزگار تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔مجبوراً 1734ء میں تلاش معاش کی غرض سے دہلی روانہ ہوئے۔مختلف پریشانیوں کا سامنا کرنے کے بعد جب ان کی ملاقات صمصام الدولہ سے ہوئی جن پر ان کے والد کے کئی احسانات تھے تو صمصام الدولہ نے میر تقی میرؔ کے لیے ایک روپیہ یومیہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ میرؔ واپس آگرہ آگئے جہاں کچھ عرصے تک ان کو وظیفہ ملتا رہا۔مگر جب صمصام الدولہ کا انتقال ہوا تو میرؔ کا وظیفہ بھی بند ہوگیا۔جس کے بعد میرؔ نے مجبور ہوکر دوبارہ دہلی کا رخ کیا۔اس بار میرؔ نے اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی

خاں آرزو کے گھر قیام کیا جو خود عالم اور مشہور شاعر تھے۔ یہاں میر سات سال تک مقیم رہے۔ میر کو یہاں نہ صرف معاشی پریشانیوں سے چھٹکارا ملا بلکہ وہ تعلیمی مراحل سے بھی گزرے۔ کسی بات کی وجہ سے جب سراج الدین علی خاں نے میر کے ساتھ بدسلوکی شروع کی تو تنگ دل ہوکر میر وہاں سے دوسری جگہ چلے گئے۔

میر جب سراج الدین علی خاں کے یہاں تھے تبھی سے شاعری کرنے لگے اور 1740ء میں بحیثیت شاعر ان کی شہرت ہوگئی۔ سراج الدین علی خاں کے یہاں سے نکلنے کے بعد میر مختلف حکام کے یہاں ایک عرصے تک نوکری کرکے گزر بسر کرتے رہے مگر وہ ہمیشہ پریشان رہے۔ کچھ دن ناگرمل سنگھ کے ساتھ بھی رہے۔ مگر جب مرہٹوں نے دہلی کو لوٹ لیا تو میر کوڑیوں کے محتاج ہوگئے اور صرف شاعری ان کا مشغلہ رہ گیا۔ اس طرح میر اپنی عمر کے پچاس سال تک مختلف پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ انہیں کبھی آرام کا موقع میسر نہ ہوسکا۔ جس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا۔

میر پر قسمت اس وقت مہربان ہوئی جب آصف الدولہ نے 1781ء میں انہیں لکھنؤ آنے کی دعوت بھیجی۔ میر نے لکھنؤ پہنچ کر آصف الدولہ کی قصیدہ خوانی کی تو انہیں بہت پسند آئی اور تین سو تا چار سو روپے ماہانہ تنخواہ پر بطور ملازم مقرر کیا۔ اس طرح میر کے لکھنؤ میں 31 برس آرام کے گزرے اور 20 ستمبر 1810ء جمعہ کے دن دار فانی کو چ کر گئے۔

میر نے غزل کے علاوہ دیگر اصناف پر بھی طبع آزمائی کی مگر غزل ان کا اہم میدان تھا۔ ان کی غزلیں ذاتی مسائل کے علاوہ سماجی، سیاسی اور معاشرتی مسائل کی عکاس ہیں۔ میر ہر بات کو سادگی سے بیان کرتے ہیں۔ جیسا کہ میر کی سوانح عمری سے پتہ چلتا ہے کہ میر زندگی بھر مختلف پریشانیوں سے گزرے۔ تلاش معاش میں مختلف امرا کے یہاں کام بھی کیا۔ اس وقت دہلی کے حالات بھی کچھ ایسے رہے کہ دہلی کو بار بار لوٹا گیا۔ اس طرح میر کی شخصیت کے داخلی و خارجی دونوں پہلو پر غم کا اثر رہا جو میر کی شاعری میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ میر کی شاعری میں عصری جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ دہلی کی تباہی و بربادی اور بادشاہوں کے آنکھوں کو دہکتی سلائیوں سے جلانے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ میر اپنے اشعار میں اکثر ہمکلامی کرتے نظر آتے ہیں۔ میر کی آپ بیتی جگ بیتی لگتی ہے۔ کیوں کہ میر نے وہی کہا جو ان کے دل پر گزری۔ میر اپنے جذبات، کیفیات، تجربات اور واردات کو ایسی جمالیاتی کیفیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے یا سننے والا ان کے کلام کی سحر انگیزی سے بچ نہیں پاتا۔ چند منتخب اشعار پیش ہیں۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی — انہیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا — دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

کِھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے — اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

گل ہو مہتاب ہو آئینہ ہو خورشید ہو میر — اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہے

میر اپنے محبوب کو مختلف طریقے سے یاد کرتے ہیں۔ محبوب کے سراپا اور اس کے حسن کو مختلف انداز سے دیکھتے ہیں۔ میر کا محبوب اتنا حسین ہے کہ پھول و کلیاں بھی اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے کم کم کھلنا سیکھتی ہیں۔ اس کے ہونٹ پنکھڑیوں سے بھی زیادہ نرم و خوبصورت ہیں۔ پھول، آئینہ، چاند و سورج سب اس کے حسن کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔ میر کے اشعار میں محبوب کی ہر ادا دکھائی دیتی ہے۔ معشوق کے قد و قامت، غمزہ و ادا اور میر کے ساتھ اس کے نخروں کی صاف تصویریں نظر آتی ہیں۔ میر ہر وقت بس ذکرِ محبوب میں مصروف رہتے ہیں۔

اگرچہ دیگر کئی شعرا نے عشق کو موضوع بنا کر غزل گوئی کی ہے مگر میر نے جس طرح مکمل طور پر عشق کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر عشق کو موضوع بنایا ہے وہ دیگر شعرا کے یہاں نہیں ملتا۔ میر کی شاعری میں عشق مجازی و عشق حقیقی دونوں ملتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف عشق حقیقی کو موضوع بنایا ہے بلکہ وحدت الوجود،

وحدت الشہود، فنا و بقا، وحدت و کثرت، وجود و عدم، جبر و قدر پر بھی گفتگو کی ہے۔ میرؔ کو زندگی کی بے ثباتی کا بھی احساس ہے۔ چند منتخب اشعار پیش ہیں۔

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا　　خورشید میں بھی اس کا ہی ذرہ ظہور تھا

گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا　　جدھر دیکھا ادھر تیرا ہی رو تھا

ہستی اپنی حباب کی سی ہے　　یہ نمائش سراب کی سی ہے

میرؔ کے اشعار میں دل سوزی، حزنیہ کیفیات، المناک فضا اور نشتر کی طرح دل میں اتر جانے والی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ میرؔ کی آپ بیتی جگ بیتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے اشعار سے قاری کو ایسی انسیت و اپنائیت ہوتی ہے گویا خود اسی کا معاملہ ہو۔ ان کی زبان نرم اور رسیلی ہے۔ میرؔ کی شاعری میں کہیں کہیں حیات و کائنات کے رنگا رنگ مظاہر کا بھی ذکر ملتا ہے۔ میرؔ اپنے اشعار میں نشتریت و چبھن بھی پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔

حال بد گفتنی نہیں میرا　　تم نے پوچھا تو مہربانی کی

میرؔ کے اشعار میں نرمی، غنائیت، موسیقیت اور ترنم اس طرح ہے جیسے نغمے کی لہر دوڑ جائے۔ وہ اپنے اشعار میں مترنم الفاظ، چھوٹی بحروں اور نغمگی پیدا کرنے والے ردیف و قافیہ کا استعمال کرتے ہوئے تکرار الفاظ سے نغمگی پیدا کرتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات کا خوب استعمال کرتے ہیں۔

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے　　جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

میرؔ کی یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنیاد پر میرؔ نے غزل کو بلندیوں پر پہونچایا۔ غنائیت اور داخلی شاعری میں ان کا کوئی نظیر نہیں۔ انہیں کی غزلیہ شاعری کا نتیجہ تھا کہ وہ دور غزل کا عہد زریں کہلایا۔ میرؔ کے زیادہ تر اشعار حزنیہ کیفیت رکھتے ہیں مگر یہ اشعار مایوس نہیں کرتے بلکہ ناکامی و مایوسی سے نکل کر زندگی جینے کا سلیقہ دیتے ہیں۔

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے　　یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

میر تقی میرؔ کی مختلف تصانیف ملتی ہیں جن میں کلیاتِ اُردو، جو چھ دیوان پر مشتمل ہے، کے علاوہ فارسی دیوان، ذکر میر (فارسی میں میر کی سوانح عمری) اور نکات الشعرا (تذکرہ) ہیں۔ میرؔ نے غزل کے بعد مثنوی پر سب سے زیادہ طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی مثنویات میں بطور خاص دریائے عشق، معاملات عشق، خواب و خیال، شعلۂ عشق اور جوش عشق قابل ذکر ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھیں تو میرؔ کی شاعری میں تشبیہات و استعارات کی ندرت، خوبصورت پیکر تراشی، عصری حسیت، روانی، سلاست، نغمگی، بے ساختگی، قوت متخیلہ، امیجری اور اپنے دور کے مسائل کی عکاسی میرؔ کو آفاقی شاعر بنا دیتے ہیں۔ میرؔ کی شاعری کی عظمت کے سبب انہیں خدائے سخن کہا گیا۔ غالبؔ، ذوقؔ، داغؔ، امیر مینائیؔ اور فراقؔ گورکھپوری جیسے شعرا نے نہ صرف میرؔ کی شاعری کا اعتراف کیا ہے بلکہ ان کا اثر بھی قبول کیا ہے۔ غالبؔ نے خود کہا کہ

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ　　آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

13.4 اسد اللہ خاں غالبؔ

مرزا غالبؔ 1797ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام مرزا اسد اللہ خاں تھا۔ ابتدا میں اپنا تخلص اسدؔ رکھا مگر بعد میں غالبؔ استعمال کرنے لگے۔ غالبؔ کی عرفیت مرزا نوشہ قرار پائی۔ والد کا نام عبد اللہ بیگ تھا۔ غالبؔ کے سر سے بچپن میں والد کا سایہ اٹھ چکا تھا، اس لیے ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے غالبؔ کی پرورش کی۔ مگر غالبؔ ابھی آٹھ سال کی عمر کو پہونچے تھے کہ ان کے چچا کا بھی انتقال ہوگیا۔ 1810ء میں تیرہ سال کی عمر میں غالبؔ کی شادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ 1812ء میں آگرہ چھوڑ کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ غالبؔ کی کوئی اولاد نہ تھی۔ سات بچے پیدا ہوئے مگر کوئی زندہ نہ رہا۔

غالبؔ کی پوری زندگی معاشی تنگدستی میں گزری۔ دہلی میں جب معاشی تنگی درپیش ہوئی تو غالبؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کے یہاں قلعہ میں ملازمت اختیار کرلی۔ جہاں بہادر شاہ ظفرؔ نے مرزا غالبؔ کو نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کا خطاب عطا کر کے 50 روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر کے خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا۔ ذوقؔ کے بعد بہادر شاہ ظفرؔ نے غالبؔ کو اپنا استاد تسلیم کیا۔ 1857 کے بعد جب غالبؔ کی سرکاری پنشن بند ہوگئی تو ان کی زندگی نہایت ہی کس مپرسی میں گزرنے لگی۔ غالب کی صحت مزید خراب ہوتی گئی۔ مرنے سے ایک روز قبل دماغ پر فالج کا اثر ہوا اور 15 فروری 1869ء کو وفات پاگئے۔ دہلی کی بستی حضرت نظام الدین میں انہیں دفنایا گیا۔

غالبؔ نے اُردو شاعری کو نئی بلندیوں تک پہونچایا۔ نئے نئے موضوعات شامل کیے۔ فلسفیانہ خیالات کو جگہ دی۔ غالبؔ زندگی کا اچھا شعور رکھتے تھے۔ غالبؔ نے زندگی کے حقائق اور نفسیات کو بڑی سادگی سے اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے بنیادی معاملات و مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں پھر ان کی گتھیوں کو سلجھا کر انسان کو اس کی عظمت کا احساس دلاتے ہیں۔ غالبؔ نے اُردو اور فارسی دونوں میں شاعری کی مگر ان کو اُردو شاعری کے سبب شہرت حاصل ہوئی۔ غالبؔ تقلید کے قائل نہیں تھے وہ اپنا راستہ خود بناتے تھے۔ انہوں نے اُردو غزل میں نئے نئے تجربے کر کے اس میں وسعت بخشی۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی ''غالبؔ کی بڑائی اس میں ہے کہ انہوں نے متنوع موضوعات کو غزل کے سانچے میں ڈھالا ہے''۔

غالبؔ کی شاعری کئی حیثیت سے انفرادیت رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں طنز و ظرافت، رمز و ایمائیت، نکتہ آفرینی، نادر تشبیہات و استعارات اور تصوف کا ذکر بالخصوص پایا جاتا ہے۔ غالبؔ کی غزل حسن خیال، حسن معنی اور حسن بیان کا پرتو ہے۔ ان کی شاعری میں قول محال کا استعمال ملتا ہے، یعنی ایسی بات جو بظاہر درست مفہوم نہ لگے مگر غور کریں تو درست ہو۔ ایک ہی شعر کے کئی کئی معانی نکلتے ہیں۔ لطافت و نکتہ آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔ خوبصورت تشبیہات و استعارات کا استعمال ملتا ہے۔ انسان دوستی بھی ان کی شاعری کا موضوع ہے۔ ذیل میں چند منتخب اشعار پیش ہیں۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالبؔ شخصی طور پر ایک اچھے انسان بھی تھے اور شاعر کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ انھوں نے فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں اچھی شاعری کی۔ غالبؔ نے قصیدے بھی لکھے لیکن دراصل وہ قصیدے کے شاعر نہیں تھے بلکہ ان کا رنگ تو غزل میں کھلتا ہے۔ ان کے کلام میں سادگی، سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔ غالبؔ کو بات کرنے کا انداز آتا تھا۔ وہ ایسی جدت اور ندرت سے کام لیتے تھے کہ بات کچھ کی کچھ ہوجاتی تھی۔ غالبؔ کے کلام کی خصوصیت شوخی اور ظرافت بھی ہے۔ یہ اُن کی شخصیت کا کمال تھا کہ اتنی آفتوں کو سہنے اور ایسے ہولناک مناظر کو دیکھنے کے باوجود انھوں نے شوخی اور ظریفانہ حس کو برقرار رکھا۔

غالبؔ نے اپنے خطوط کے ذریعہ اردو نثر کو بھی بلندیوں تک پہونچا۔ الغرض غالبؔ صرف اپنے دور کے ہی عظیم شاعر نہیں بلکہ ہر دور کے بڑے شاعر ہیں۔ اُن کی عظمت کے گُن اُردو شعر و ادب میں ہمیشہ گائے جاتے رہیں گے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے

خالی جگہوں کو پُر کیجیے

1۔ نکات الشعرا..... کا تذکرہ ہے۔

2۔ .....میرؔ کی سوانح ہے۔

3۔ ..... کو خدائے سخن کہا جاتا ہے۔

4۔ غالبؔ.....کے قائل نہیں تھے۔

5۔ غالبؔ کی بڑائی اس میں ہے کہ انہوں نے متنوع موضوعات کو ..... کے سانچے میں ڈھالا ہے۔

13.5 دبستان دہلی کے دیگر اہم شعرا

دبستان دہلی کو دو اہم ادوار میں تقسیم کرنے کے بعد دیکھا جائے تو ایک میرؔ کا عہد کہلاتا ہے تو دوسرا غالبؔ کا عہد۔ میرؔ کے ہم عصر اہم شعرا میں مرزا محمد رفیع سوداؔ، خواجہ میر دردؔ اور میر سوزؔ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اس عہد سے زبان کی اصلاح دینے والے شاہ حاتمؔ اور مظہر جان جاناںؔ کا تعلق بھی ہے۔ اس عہد میں قدیم ہندی و دکنی زبان متروک ہوئی۔ اس دور کا سب سے اہم کارنامہ ایہام گوئی کا ترک کیا جانا ہے۔ اُردو شاعری جس پر غزل کا قبضہ تھا اس میں قصائد، ہجو، مثنویاں اور مرثیے لکھے جانے لگے۔ شعرا کی تعداد بڑھی اور تذکرے بھی لکھے جانے لگے۔ غالبؔ کے عہد کے اہم شعرا میں مومن خاں مومنؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ اور بہادر شاہ ظفرؔ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ دبستانِ دہلی کے ان شعرا پر ذیل میں مختصراً روشنی ڈالی جارہی ہے۔

13.5.1 مرزا محمد رفیع سوداؔ:

مرزا محمد رفیع سوداؔ 1706ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ مرزا محمد رفیع نام اور سوداؔ تخلص تھا۔ والد کا نام مرزا محمد شفیع تھا۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کو انہوں نے مخمس و شہر آشوب کی شکل میں بڑے دلکش انداز میں تحریر کیا ہے۔ دہلی کی تباہی کے بعد دیگر کئی شعرا کی طرح وہ بھی لکھنؤ روانہ ہوگئے۔ لکھنؤ میں شجاع الدولہ، آصف الدولہ اور سعادت علی خاں سبھی نے ان کی شاعری کی عظمت کو تسلیم کیا۔ انہیں ملک الشعرا کا خطاب بھی ملا۔ وہیں 1781ء میں وفات پائی۔

اردو قصیدہ کے حوالے سے سوداؔ کا کوئی ثانی نہیں ملتا۔ ان کے قصیدے فارسی قصیدوں کے ہم پلہ شمار کیے گئے۔ انہوں نے فارسی قصیدہ نگاری کا بغور مطالعہ کیا اور اس کی تمام خصوصیات کو اردو قصیدہ میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی۔ متنوع موضوعات پر بے شمار قصیدے لکھے۔ قصیدے کے علاوہ ان کی غزلیں، مثنویاں اور مراثی بھی ملتے ہیں۔

13.5.2 خواجہ میر دردؔ:

خواجہ میر دردؔ کی پیدائش 1721ء میں دہلی میں ہوئی۔ خواجہ میر ان کا نام اور تخلص دردؔ تھا۔ موسیقی سے کافی لگاؤ تھا۔ دردؔ کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ان کی مذہبیت و خدا شناسی ہے۔ 1785ء میں دہلی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ دردؔ نے فقیرانہ زندگی گزارنا پسند کیا۔ ان کی زندگی کا عکس ان کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ وہ ایک صوفی بزرگ تھے اور ان کی شاعری میں حقیقی عشق ملتا ہے۔ سادگی، زبان و بیان کی دلکشی ان کے کلام میں کثرت سے نظر آتی ہے۔ اُردو کو ابتدا میں ترقی دینے والے چار ستونوں مرزا مظہر جان جاناںؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ اور میر تقی میرؔ کے ساتھ ان کا شمار کیا جاتا ہے۔

13.5.3 میر سوزؔ:

میر سوزؔ کی پیدائش 1721ء میں دہلی میں ہوئی۔ محمد میر ان کا نام اور سوزؔ تخلص تھا۔ ابتدا میں میرؔ بھی تخلص رکھا تھا مگر میر تقی میرؔ کی شہرت کے باعث

سوزؔ تخلص اختیار کرلیا۔ دہلی کی تباہی کے بعد فرخ آباد اور فیض آباد میں رہائش اختیار کی مگر آخر میں لکھنؤ کو اپنا مسکن بنایا۔ 99-1798ء میں لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

سوزؔ کی غزلوں میں سیدھے سادے خیالات، اُسلوب کی سادگی، زبان کی صحت وصفائی ملتی ہے۔ سوزؔ کی محبت اس گوشت پوست کی دنیا کی محبت ہے جس میں ناکامی وکامیابی کی درمیانی کیفیت کا اظہار ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں ناکامی کے بعد کی شدت ناپید ہے۔ البتہ ان کے یہاں سطحیت بھی نہیں ہے جو محبت میں کامیابی کے بعد ملتی ہے۔ ان کے یہاں روز مرہ کے عشق کی کیفیات کا اظہار ہے۔ وہ صاف الفاظ میں حال دل بیان کرتے ہیں۔ سوزؔ کے یہاں فلسفہ تصوف بھی نہیں ملتا۔ سوزؔ کی شاعری میں سادگی، بے تکلفی وشیرینی ملتی ہے۔ سوزؔ کا خاص میدان غزل ہے مگر مثنوی، رباعی اور مخمس میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ سوزؔ کی حیثیت میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کے مساوی نہیں ہے مگر دبستانِ دہلی کے ایک اہم رکن کی حیثیت ضرور رکھتے ہے۔ چند منتخب اشعار دیکھیے۔

صنم کا وصل جو چاہے تو حائل ہو نہ اے عاشق — غبار جسم اٹھ جاوے تو کچھ حائل نہیں ہوتا
بلبل نے جس کا جلوہ جا کر چمن میں دیکھا — وہ آنکھ موند اپنی ہم من ہی من میں دیکھا
اہل ایماں سوزؔ کو کہتے ہیں کافر ہوگیا — آہ یارب راز دل ان پر بھی ظاہر ہوگیا

13.5.4 مومن خاں مومنؔ:

مومن خاں مومن کی پیدائش 1800ء میں دہلی میں ہوئی۔ اصل نام محمد مومن تھا۔ والد کا نام حکیم غلام نبی خاں تھا جو دہلی کے مشہور حکیم تھے۔ چونکہ مومنؔ کا خاندانی پیشہ طب تھا، اس لیے انہیں بھی طب کی اچھی معلومات ہوگئی تھی۔ وہ علم نجوم سے بھی واقف تھے۔ وہ نہایت ہی خوبصورت اور حسین تھے۔ مومنؔ کی زندگی کا سب سے دلچسپ حصّہ ان کی حیات معاشقہ ہے۔ ان کی شاعری میں عشق مجازی کا پورا رنگ ملتا ہے۔ مومنؔ کی وفات 1852ء میں دہلی میں ہوئی۔

مومن خاں مومن کی غزلوں کے علاوہ قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، قطعہ، رباعی اور واسوخت بھی ملتے ہیں، مگر غزل ان کا خاص میدان ہے۔ تغزل، داخلیت، نازک خیالی، ندرت اسلوب، مکر شاعرانہ، سادگی اور پیچیدہ انداز کی شاعری، ان کی غزل کی خصوصیات ہیں۔ تشبیہات واستعارات، صنائع وبدائع کو بھی مومنؔ نے بڑی خوبی سے برتا ہے۔ ان کی شاعری میں مکر شاعرانہ بھی پایا جاتا ہے یعنی شاعر بظاہر ایسی بات کرتا ہے جس میں محبوب کے فائدہ کا احساس ہوتا ہے مگر دراصل اس میں عاشق کا فائدہ ہوتا ہے۔ عشق مجازی مومنؔ کا خاص میدان ہے۔ وہ عشق کے مختلف جذبات وحالات کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ وعدہ کرنا اور پھر اس کو نہ نباہنا، روٹھنا اور تمنا کرنا کہ کوئی منالے، جذبات نگاری کی جو دلکش تصویر کشی مومن کے یہاں ملتی ہے وہ دیگر شعرا میں کم ملتی ہے۔

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری — واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا
عیش میں بھی کبھی جاگے نہیں تم کیا جانو — کہ شب غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے

مومنؔ کی درج ذیل غزل بہت مشہور ہوئی، جو معاملہ بندی کی پوری تصویر کشی کرتی ہے۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو — وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے، وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں — وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم بھی چاہ تھی، کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی — کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا　　میں وہی ہوں مومن مبتلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مومنؔ کے یہاں نازک خیالی، ندرت اسلوب اور شاعرانہ شوخی ملتی ہے۔ مومنؔ کی عظمت کا انداز اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ درج ذیل شعر کے تعلق سے غالبؔ نے کہا تھا کہ مومنؔ مجھے یہ شعر دے دیں اور میرا دیوان لے لیں۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

13.5.5 شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ:

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ 1790ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اصل نام شیخ محمد ابراہیم اور ذوقؔ تخلص تھا۔ والد کا نام شیخ محمد رمضان تھا۔ جب وہ پیدا ہوئے تو دہلی میں شعر و شاعری کا دور دورہ تھا۔ انہوں نے بھی بہت کم عمر میں شاعری شروع کردی۔ انہوں نے اس عہد کے مشہور استاد سخن استاد نصیر کی شاگردی اختیار کی۔ مگر کچھ دنوں بعد ذوقؔ نے اپنی غزلوں پر خود ہی نظر ثانی کرنے لگے اور جلد ہی دہلی کے مشہور شاعروں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ وہ نہ صرف شاعری کرنے لگے بلکہ ان کے شاگردوں کی تعداد بھی تیزی سے بڑھنے لگی۔ وہ بہادر شاہ ظفر کے بھی استاد رہے۔ ذوقؔ کو موسیقی، نجوم، طب، تعبیر خواب وغیرہ پر کافی دسترس حاصل تھی۔ دربار دہلی سے انہیں ''خاقانی ہند'' کا خطاب ملا۔ 1854ء میں دہلی میں ذوقؔ کا انتقال ہوگیا۔

غزل اور قصیدہ ذوقؔ کے خاص موضوعات تھے۔ اس کے علاوہ مثنوی، قطعہ، واسوخت بھی تحریر کیے۔ ذوقؔ کے کلام کی خصوصیات میں رعایت لفظی، تازگی مضمون، صفائی کلام، چستی ترکیب اور خوبیٔ محاورہ شمار کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے حسن تعلیل اور محاورے کو خوب استعمال کیا ہے۔ سوداؔ کے بعد قصیدہ میں ان کا کوئی مقابل نہیں ہے۔ شیخ محمد ابرہیم ذوقؔ کے چند منتخب اشعار پیش ہیں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے　　مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات　　ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

تم بھول کر بھی یاد نہیں کرتے ہو کبھی　　ہم تو تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا چکے

خط بڑھا کاکل بڑھے زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے　　حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

13.5.6 بہادر شاہ ظفرؔ:

بہادر شاہ ظفرؔ کی پیدائش 1775ء دہلی میں ہوئی۔ ان کا پورا نام ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ تھا۔ ابوظفر ان کا تاریخی نام تھا۔ اسی رعایت سے اپنا تخلص ظفرؔ رکھا۔ تعلیم و تربیت قلعۂ معلیٰ میں ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر اپنے والد اکبر شاہ ثانی کے انتقال کے بعد مغلیہ سلطنت کے وارث مقرر ہوئے۔ یہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا دور تھا۔ بہادر شاہ ظفرؔ کی آمدنی کم اور شاہی اخراجات زیادہ تھے۔ اس لیے دھیرے دھیرے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ 1857ء کی تحریک انقلاب کی ناکامی کے بعد جسے انگریزوں نے 'غدر' کا نام دیا تھا، بہادر شاہ ظفرؔ کو انگریزوں نے گرفتار کرکے ان پر باغی ہونے کا مقدمہ چلایا۔ پھر مجرم ثابت کرکے قیدی بنا کر انہیں رنگون بھیج دیا گیا جہاں 1862ء میں ان کا انتقال ہوگیا اور رنگون ہی میں مدفون ہوئے۔

بہادر شاہ ظفرؔ کی شاعری پر دہلی کے ابتر حالات کا اثر نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں خارجیت و داخلیت کا امتزاج ملتا ہے۔ ذوقؔ کے بعد غالبؔ سے اپنی شاعری پر اصلاح لی۔ تصوف، اخلاق اور معاملہ بندی ان کی شاعری کے خاص موضوع ہیں۔ شاعری میں ہندی الفاظ کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔ حمد، نعت، سلام، مرثیہ، مسدس، مخمس، قطعات و رباعیات ان کے دیوان میں موجود ہیں۔ کلیات میں تیس ہزار کے قریب اشعار ملتے ہیں۔ چند اشعار پیش ہیں۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں　　جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی　　جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

بہادر شاہ ظفرؔ کی پوری زندگی دہلی کے قلعہ معلیٰ میں گزری مگر زندگی کے آخری ایام میں انقلاب 1857ء کے بعد حالات ایسے بدلے کہ انہیں رنگون میں قید کر دیا گیا جہاں ان کا انتقال بھی ہو گیا۔ حالانکہ ان کی خواہش تھی کہ وہ دہلی میں رہیں۔ اپنی اس مجبوری کی داستان اپنی شاعری میں تحریر کی ہے۔

کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لیے　　دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

13.6 دبستان دہلی کی خصوصیات

دہلی کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں دہلی کے حالات بہتر نہ تھے۔ مختلف حکمرانوں نے دہلی پر قبضہ کرنے کے لیے بار بار حملہ کیا اس طرح دہلی کئی بار اجڑی اور پھر بسی۔ چونکہ شاعر کی شاعری پر اس کے اردگرد کے حالات و مسائل کا بھی اثر پڑتا ہے، اس لیے دہلی کے شعرا پر بھی دہلی کے حالات کا اثر پڑا۔ دہلی میں رہنے والے میرؔ اور غالبؔ جیسے اہم شعرا کی ذاتی زندگی بھی معاشی اعتبار سے کافی پریشان کن تھی، اس لیے ان کی شاعری پر اس کا مزید اثر ہوا۔ یہی وجہ رہی کہ اس دور کے شعرا کے اشعار میں غم کی لہریں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ جس کے سبب دہلی کے شعرا کے یہاں داخلیت، حقیقی جذبات، عشق حقیقی، تصوف، الفاظ سے زیادہ معانی پر زور، سادہ و سلیس زبان اور آورد کے بجائے آمد کی کیفیت ملتی ہے۔

دہلی کے سیاسی حالات نے ہر شخص کے دل کو گداز اور دردمند بنا دیا تھا۔ حالات کے نشیب و فراز نے انھیں سادگی پسند اور تکلف و تصنع سے دور رکھا۔ زندگی کی سادگی اُن کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ میرؔ و سوداؔ سے لے کر انشاؔ و مصحفیؔ کی شاعری میں ہمیں تکلف اور بناوٹ کی جگہ سادگی اور خلوص کا احساس نظر آتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ　　نادان پھر وہ جی سے بُھلایا نا جائے گا　　(میرؔ)

جو ملا اُس نے بے وفائی کی　　کچھ عجب رنگ ہے زمانے کا　　(مصحفیؔ)

تیرا جو ستم ہے اُس کی تو جان　　اپنی تھی سو خوب کر گئے ہم　　(سوداؔ)

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ اس دور کے شعرا کے اشعار میں غم کی لہریں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں، وہ اس لیے ہے کہ ان شعرا کا غم صرف اپنی ذات کا غم نہیں تھا بلکہ ایک عظیم الشان تہذیب کے خاتمہ کا غم تھا۔ جس کا احساس اور ملک و سماج کی ابتر حالت نے ان کی زندگیوں میں غم و یاس کا زہر گھول دیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے　　درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا　　(میرؔ)

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے　　ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے　　(دردؔ)

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل　　انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں　　(غالبؔ)

دبستان دہلی کے شعرا کے یہاں تصوف کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ میرؔ، سوداؔ، غالبؔ اور مؤمنؔ تمام ہی شعرا کے یہاں تصوف کے مضامین ملتے ہیں۔ خواجہ میر دردؔ کی پوری شاعری تصوف میں ڈوبی ہوئی ہے۔ تصوف کے اس اثر نے جذبات میں گہرائی اور خیالات میں بلندی پیدا کر دی۔ چند اشعار دیکھیے۔

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا　　موسیٰ نہیں کہ سیر کروں کوہِ طور کا　　(سوداؔ)

نظر میرے دل کی پڑی دردؔ کس پر　　جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے　　(دردؔ)

اُردو شاعری کے پورے سرمایہ میں مضامین عشق و محبت کو ایک غالب عنصر کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ دبستان دہلی کے شعرا نے عشق حقیقی اور

عشق مجازی دونوں کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔انہوں نے لکھنوی شعرا کی طرح اپنی عشقیہ شاعری کو جذبے کی بالائی سطح کے اظہار کا اسیر نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے خارجی مضامین باندھنے کی جگہ داخلی جذبہ کی ترجمانی کی۔ان کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ ان کی دل کی تپش اور روح کی بے قراری کا اندازہ اُن کے محبوب کو ہو جائے۔یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں روح کی تڑپ سوز و گداز اور درد و اضطراب کی کیفیت ملتی ہے۔

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ کتنے آنسو پلک تک آئے تھے (میرؔ)

جہاں تک دبستانِ دہلی سے وابستہ شعرا کی زبان و بیان کا تعلق ہے تو اس میں بھی اُن کے مزاج کی سادگی، صفائی، بے تکلفی اور بے ساختگی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ وہ دہلی کے روزمرہ محاوروں پر جان دیتے ہیں۔ وہ تشبیہات و استعارات سے بھی کام لیتے ہیں۔لکھنؤ کے شعرا کی طرح عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ سے زبان کو بوجھل نہیں بناتے بلکہ آسان و شیریں الفاظ استعمال کرتے ہیں۔اس طرح صفائی، سادگی اور سلاست دبستان دہلی کی شاعری کے ساتھ مخصوص ہیں۔ذیل کے اشعار ملاحظہ کریں۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے (دردؔ)

فقیرانہ آئے صدا کر چلے میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے (میرؔ)

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو (غالبؔ)

اس طرح دبستان دہلی کی خصوصیات میں داخلیت، حقیقی جذبات، عشق حقیقی، تصوف، الفاظ سے زیادہ معانی پر زور، سادہ و سلیس زبان اور آورد کے بجائے آمد کی کیفیت ہے۔بقول نورالحسن ہاشمی ''دہلویت نام ہے ایک نقطۂ نظر، ایک افتادِ ذہنی، ایک مزاج شعری کا، جسے سمجھنے کے لیے لکھنویت سے قدم بقدم مقابلہ کرنا ہوگا'' اس لیے مختصراً دبستان لکھنؤ پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ دراصل دہلی کے مسائل سے پریشان ہوکر جب چند شعرا نے آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ کا سفر کیا تو انہیں یہاں کا ماحول بڑا سازگار معلوم ہوا۔ یہاں نوابوں کے یہاں دولت کی فراوانی تھی۔ جب شعرا کو انعامات اور عزت و احترام ملنے لگا تو آرزو، فغاں، میر حسن، حسرت، مصحفی وغیرہ کئی شعرا دہلی چھوڑ کر لکھنؤ رہنے لگے۔ان شعرا کے سبب یہاں شعر و شاعری کا ایک ماحول بنا اور چونکہ یہاں معاشی تنگی نہیں تھی اس لیے ان شعرا کی شاعری میں واہ اور خارجیت کے ساتھ ہی معنی کے بجائے لفظیات پر توجہ دی جانے لگی۔محبوب کا سراپا کھلے لفظوں میں پیش کیا جانے لگا۔مشکل سے مشکل تر الفاظ کا استعمال کرنا شاعری کی عظمت شمار کیا جانے لگا۔لکھنؤ کے شعرا دہلی سے اپنی شاعری کو ممتاز کرنے کی غرض سے حد سے تجاوز کر گئے اور واہ، خارجیت اور مشکل الفاظ کے استعمال کو اپنی پہچان بنالی۔

غرض دبستانِ دہلی کی شاعری ہر اعتبار سے عوام و خواص میں بے حد مقبول رہی۔ واضح رہے کہ دہلویت سے مراد صرف وہی شعرا نہیں ہیں جو دہلی میں رہے بلکہ وہ شعرا بھی ہیں جو دہلی کے باہر رہے مگر دہلوی انداز شاعری اختیار کی اور ان کی شاعری میں وہ خصوصیات باقی رہیں جن کی وجہ سے دبستان دہلی جانا جاتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے

صحیح جوڑ ملائیے۔

1۔غالبؔ کی پیدائش	( )	(الف) 1800ء
2۔میرؔ کا ہم عصر شاعر	( )	(ب) 1797ء
3۔مومن خان مومنؔ کی پیدائش	( )	(ج) سوداؔ
4۔دبستانِ دہلی کی اہم خصوصیت	( )	(د) غالبؔ

5۔موت کا ایک دن معین ہے ( ) (ر) سادگی وسلاست

یہ مصرعہ کس شاعر کا ہے؟ ( ) (س) میرؔ

13.7 خلاصہ

شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے 1707ء میں وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔ بادشاہت حاصل کرنے کی غرض سے اپنے بھائیوں یا قریبی رشتہ داروں کو قتل کرنا اس وقت کا رواج بن گیا تھا۔ اورنگ زیب کے بعد اس کا لڑکا معظم (بہادر شاہ) اپنے بھائیوں کو قتل کر کے تخت نشیں ہوگیا۔ جیسے ہی اس کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا معز الدین جہاں دار شاہ نے اپنے بھائیوں کو قتل کر کے 1712ء میں بادشاہت حاصل کر لی۔ 1713ء میں جہاں دار کے بھتیجے فرخ سیر نے اس کو شکست دے کر خود شاہی تخت پر قبضہ کر لیا۔ 1719ء میں جب فرخ سیر کو قتل کر دیا گیا تو محمد شاہ تخت نشیں ہوا۔ محمد شاہ کے بعد احمد شاہ، عالم گیر ثانی، شاہ جہاں ثانی اور شاہ عالم ثانی حکومت کرتے رہے۔ مغلیہ حکومت کی کمزوری پر انگریزوں نے پوری نظر رکھی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے مغلیہ حکومت پر قبضہ کرنے لگے۔ بہادر شاہ ظفر مغلیہ حکومت کے سب سے آخری بادشاہ رہے۔ انگریزوں نے بہادر شاہ ظفرؔ پر 1857ء میں ہندوستانی انقلابیوں کا ساتھ دینے کے جرم گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا جہاں 1862ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ایک لمبے عرصے تک دہلی میں فسادات، بدنظمی اور بیچارگی صاف نظر آتی ہے۔ ان تمام صورت حال کا تہذیب وتمدن اور ادب پر براہ راست اثر پڑا۔ خاص کر اردو شاعری پر اس کے دیرپا اثرات مرتب ہوئے۔ اٹھارہویں صدی کے اہم شعرا یعنی میرؔ، سوداؔ، دردؔ اور میر سوزؔ کی شاعری پر اس کا اثر پڑا۔ اسی طرح انیسویں صدی کے شعرا یعنی غالبؔ، مومن خاں مومن ذوقؔ اور بہادر شاہ ظفرؔ کی شاعری پر بھی ان حالات کا اثر ہوا۔ ان حالات کے پیش نظر دہلی کی شاعری نے جو خصوصیات اختیار کر لی وہی دبستان دہلی کہلایا۔

میر تقی میرؔ کی پیدائش 1722ء میں آگرہ میں ہوئی۔ ابھی بمشکل گیارہ برس کی عمر کو پہنچے تھے کہ ان کے والد کا 1733ء میں انتقال ہوگیا۔ یہیں سے میرؔ کی زندگی میں رنج والم کا باب کھل گیا۔ تلاش معاش کی غرض سے میرؔ نے دہلی کا سفر کیا۔ جہاں کچھ دن تو آرام ملا مگر پھر معاشی تنگی پیش آگئی۔ میرؔ اپنی عمر کے پچاس سال تک دہلی میں مختلف پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ انہیں کبھی آرام کا موقع میسر نہ ہوسکا۔ آصف الدولہ نے جب 1781ء میں میرؔ کو لکھنؤ بلایا اور ماہانہ تنخواہ پر بطور ملازم مقرر کر لیا تو میرؔ کی زندگی آرام سے بسر ہونے لگی۔ اس طرح میرؔ لکھنؤ میں 31 برس آرام کے گزار کر 1810ء میں دار فانی سے کوچ کر گئے۔

میرؔ نے غزل کے علاوہ دیگر اصناف پر بھی طبع آزمائی کی مگر غزل ان کا اہم میدان تھا۔ ان کی غزلیں ذاتی مسائل کے علاوہ سماجی، سیاسی اور معاشرتی مسائل کی عکاس ہیں۔ میرؔ کی شاعری میں عصری جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ دہلی کی تباہی و بربادی اور بادشاہوں کے آنکھوں کو دہکتی سلائیوں سے جلانے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ میرؔ اپنے اشعار میں اکثر ہمکلامی کرتے نظر آتے ہیں۔ میرؔ کی آپ بیتی جگ بیتی لگتی ہے۔ کیوں کہ میرؔ نے وہی کہا جو ان کے دل پر گزری۔ میرؔ اپنے جذبات، کیفیات، تجربات اور واردات کو ایسی جمالیاتی کیفیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے یا سننے والا ان کے کلام کی سحر انگیزی سے بچ نہیں پاتا۔ میرؔ کے اشعار میں دل سوزی، حزنیہ کیفیات، المناک فضا اور نشتر کی طرح دل میں اتر جانے والی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ میرؔ کی آپ بیتی جگ بیتی محسوس ہوتی ہے۔

میرؔ کے ہم عصر اہم شعرا میں مرزا محمد رفیع سوداؔ، خواجہ میر دردؔ اور میر سوزؔ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ اردو قصیدہ کے حوالے سے سوداؔ کا کوئی ثانی نہیں ملتا۔ ان کے قصیدے فارسی قصیدوں کے ہم پلہ شمار کیے گئے۔ انہوں نے متنوع موضوعات پر بے شمار قصیدے لکھے۔ خواجہ میر دردؔ ایک صوفی بزرگ تھے اور ان کی

شاعری میں حقیقی عشق ملتا ہے۔ سادگی، زبان و بیان کی دلکشی ان کے کلام میں کثرت سے نظر آتی ہے۔ سوؔز کی غزلوں میں سیدھے سادے خیالات، اُسلوب کی سادگی، زبان کی صحت وصفائی ملتی ہے۔ ان کے یہاں روزمرہ کے عشق کی کیفیات کا اظہار ہے۔ وہ صاف الفاظ میں حال دل بیان کرتے ہیں۔

مرزا غالبؔ 1797ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ بعد میں آگرہ چھوڑ کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ غالبؔ کی پوری زندگی معاشی تنگدستی میں گزری۔ ان کی صحت اکثر خراب رہتی تھی۔ بالآخر 1869ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ غالبؔ نے اُردو شاعری کو نئی بلندیوں تک پہونچایا۔ نئے نئے موضوعات شامل کیے۔ فلسفیانہ خیالات کو جگہ دی۔ غالبؔ نے اُردو اور فارسی دونوں میں شاعری کی مگر ان کو اُردو شاعری کے سبب شہرت حاصل ہوئی۔ انہوں نے اُردو غزل میں نئے نئے تجربے کر کے اس میں وسعت بخشی۔ غالبؔ کی شاعری کئی حیثیت سے انفرادیت رکھتی ہے۔ ان کی شاعری میں طنز و ظرافت، رمز و ایمائیت، نکتہ آفرینی، نادر تشبیہات و استعارات اور تصوف کا ذکر بالخصوص پایا جاتا ہے۔ غالبؔ کی غزل حسن خیال، حسن معنی اور حسن بیان کا پرتو ہے۔ ایک ہی شعر کے کئی کئی معانی نکلتے ہیں۔ لطافت ونکتہ آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔ خوبصورت تشبیہات و استعارات کا استعمال ملتا ہے۔ غالبؔ کے کلام کی خصوصیت شوخی اور ظرافت بھی ہے۔ انھوں نے فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں اچھی شاعری کی۔ غالبؔ نے قصیدے بھی لکھے۔ غالب نے اپنے خطوط کے ذریعہ اردو نثر کو بھی بلندیوں تک پہنچایا۔ الغرض غالبؔ صرف اپنے دور کے ہی عظیم شاعر نہیں بلکہ ہر دور کے بڑے شاعر ہیں۔

غالبؔ کے ہم عصر اہم شعرا میں مومن خاں مومن، شیخ محمد ابراہیم ذوق اور بہادر شاہ ظفر کا نام لیا جاسکتا ہے۔ مومن خاں مومن کا غزل خاص میدان ہے۔ تغزل، داخلیت، نازک خیالی، ندرت اسلوب، مکر شاعرانہ، سادگی اور پیچیدہ انداز کی شاعری، ان کے غزل کی خصوصیات ہیں۔ عشق مجازی مومنؔ کا خاص میدان ہے۔ وہ عشق کے مختلف جذبات و حالات کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ غزل اور قصیدہ دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ ان کے کلام کی خصوصیات میں رعایت لفظی، تازگی مضمون، صفائی کلام، چستی ترکیب اور خوبی محاورہ شمار کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے حسن تعلیل اور محاورے کو خوب استعمال کیا ہے۔ سوداؔ کے بعد قصیدہ میں ان کا کوئی مقابل نہیں ہے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کا دور مغلیہ سلطنت کے زوال کا دور تھا۔ ان کی شاعری پر دہلی کے ابتر حالات کا اثر نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں خارجیت و داخلیت کا امتزاج ملتا ہے۔ تصوف، اخلاق اور معاملہ بندی ان کی شاعری کے خاص موضوع ہیں۔ شاعری میں ہندی الفاظ کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔ حمد، نعت، سلام، مرثیہ، مسدس، مخمس، قطعات و رباعیات ان کے دیوان میں موجود ہیں۔ کلیات میں تیس ہزار کے قریب اشعار ملتے ہیں۔

دہلی کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اٹھارہویں، انیسویں اور بیسویں صدی میں دہلی کے حالات بہتر نہ تھے۔ مختلف حکمرانوں نے دہلی پر قبضہ کرنے کے لیے بار بار حملہ کیا اس طرح دہلی کئی بار اجڑی اور پھر بسی۔ دہلی میں رہنے والے میرؔ اور غالبؔ جیسے اہم شعرا کو دیکھتے ہیں تو ان شعرا کی ذاتی زندگی بھی معاشی اعتبار سے کافی پریشان کن تھی۔ یہی وجہ رہی کہ اس دور کے شعرا کے اشعار میں غم کی لہریں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔ حالات کے نشیب و فراز نے انھیں سادگی پسند بنایا اور تکلف و تصنع سے دور رکھا۔ زندگی کی سادگی اُن کی شاعری میں نظر آتی ہے۔

دبستان دہلی کے شعرا کے یہاں تصوف کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ میرؔ، سوداؔ، غالبؔ اور مومنؔ تمام ہی شعرا کے یہاں تصوف کے مضامین ملتے ہیں۔ خواجہ میر دردؔ کی پوری شاعری تصوف میں ڈوبی ہوئی ہے۔ دبستان دہلی کے شعرا نے عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔ انھوں نے خارجی مضامین باندھنے کی جگہ داخلی جذبہ کی ترجمانی کی۔ دبستانِ دہلی کی زبان و بیان میں بھی سادگی، صفائی، بے تکلفی اور بے ساختگی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ شعرا دہلی کے روزمرہ، محاوروں، تشبیہات و استعارات کا استعمال کرتے ہیں۔ آسان و شیریں الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح صفائی، سادگی اور سلاست دبستان دہلی کی شاعری کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس طرح دبستان دہلی کی شاعری کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈالیں تو داخلیت، سادہ و سلیس طرزِ بیان، حقیقی جذبات، تصوف، الفاظ سے زیادہ معانی پر زور اور آورد کے بجائے آمد کی کیفیت ہے۔

13.8 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

1۔ دبستان دہلی سے آپ کیا سمجھتے ہیں، خصوصیات بیان کرتے ہوئے وضاحت کریں۔

2۔ میرؔ کی شاعری کی خصوصیات مثالوں کے ساتھ پیش کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

1۔ غالبؔ کی شاعری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

2۔ مومن خاں مومنؔ، شیخ ابراہیم ذوقؔ اور بہادر شاہ ظفر میں سے کسی ایک کی شاعری پر روشنی ڈالیں۔

3۔ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کی شاعری میں فرق واضح کریں۔

13.9 فرہنگ

الفاظ	معنی
غنائیت	موسیقیت
امیجری	تصویر کشی
تصنع	دکھاوا، بناوٹ
ندرتِ اسلوب	انوکھا اسلوب
طرزِ بیان	بیان کرنے کا طریقہ
تصوف	دل سے خواہشوں کو دور کر کے اللہ کی طرف دھیان لگانا

13.10 سفارش کردہ کتابیں

1۔ دلی کا دبستان شاعری — نورالحسن ہاشمی

2۔ تاریخ ادب اردو — ڈاکٹر جمیل جالبی

3۔ میر تقی میرؔ (مونوگراف) — مظفر حنفی

4۔ بہادر شاہ ظفر — اسلم پرویز

اکائی 14 دبستانِ لکھنؤ

اکائی کے اجزا

14.0 مقصد

14.1 تمہید

14.2 دبستانِ لکھنؤ کا سماجی وتہذیبی پس منظر

14.3 دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات

14.4 دبستانِ لکھنؤ کے اہم شعرا

14.4.1 شیخ قلندر بخش جرات

14.4.2 انشا اللہ خاں انشا

14.4.3 غلام ہمدانی مصحفی

14.4.4 شیخ امام بخش ناسخ

14.4.5 خواجہ حیدر علی آتش

14.5 دبستانِ لکھنؤ کے دیگر شعرا

14.6 خلاصہ

14.7 نمونۂ امتحانی سوالات

14.8 فرہنگ

14.9 سفارش کردہ کتابیں

14.0 مقصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

☆ دبستان کے معنی ومفاہیم واضح کرسکیں۔

☆ دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات مثالوں سے سمجھا سکیں۔

☆ دبستانِ لکھنؤ کے نمائندہ شاعر جرات سے متعلق گفتگو کر سکیں۔

☆ انشا کے طرزِ تحریر کے بارے میں سمجھا سکیں۔

☆ مصحفی کی شاعری کی خصوصیات بیان کر سکیں۔

☆ آتش کے کلام کی خصوصیات کون کون سی ہیں' حوالوں سے سمجھا سکیں۔

☆ اصلاح زبان کی تحریک پر روشنی ڈال سکیں۔

14.1 تمہید

دبستان' فارسی زبان کا لفظ ہے۔اس کے لغوی معنی اسکول و مدرسہ کے ہیں۔ادب میں چار دبستانوں کا ذکر ملتا ہے۔ دبستانِ دہلی' دبستانِ لکھنؤ' دبستانِ عظیم آباد اور دبستانِ رامپور۔ان میں دبستانِ دہلی اور لکھنؤ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ جب کسی عہد یا علاقے میں وسیع تناظر میں خیال' موضوع' لب و لہجہ وغیرہ میں یکسانیت پائی جانے لگے اور ان ہی بنیادوں پر اس کی شناخت قائم ہو جائے تو اسے دبستان کہتے ہیں۔ دبستانِ دہلی اور لکھنؤ کی خصوصیات اپنی اپنی جگہ مسلم ہیں۔ دونوں دبستانوں میں کچھ افتراقات و امتیازات ہیں۔ دلی کی شاعری میں آمد کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ یہ کیفیت اُس عہد کے بیشتر شعرا کے یہاں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔ دلّی کی زبان میں سادگی' سلاست اور روانی ایک اہم جزو کی شکل میں موجود ہے۔غزلوں میں کرداروں کی ایک دُنیا آباد ہوتی ہے۔رقیب' محبوب' پیامبر' عاشق' مخبر وغیرہ دلّی کی شاعری میں ان کرداروں میں مجموعی طور پر سادگی پائی جاتی ہے۔ یہاں شاعر محبوب کے سراپے کے بیان اور عشقیہ اظہار جیسے موضوعات کی وضاحت بھی اشارے کنایے میں کرتا ہے اور اس فنی باریکی کے ہنر سے خوب واقف ہے۔ دوسری طرف دبستانِ لکھنؤ نے اُردو ادب میں بیش بہا اضافے کیے ہیں۔ وہاں کی شاعری میں آورد کی کیفیت موجود ہے۔اس کیفیت سے وہاں کے شاعروں نے خوب فائدہ اُٹھایا ہے۔ اِرادہ کر کے شعر باندھنا بھی ہنر ہے۔صنعتوں کا استعمال' زبان کی صحت پر زور اور صنف ریختی کے فروغ جیسے غیر معمولی کمالات دبستانِ لکھنؤ کے ہی مرہونِ منت ہیں۔

14.2 دبستانِ لکھنؤ کا سماجی و تہذیبی پس منظر

اُردو ادب کی تاریخ میں دبستانِ لکھنؤ کا سماجی و تہذیبی پس منظر ہمیشہ سے اہمیت کا حامل رہا ہے۔اس کی مضبوط و مستحکم بنیاد سعادت خاں برہان الملک نے رکھی۔ اُنہوں نے اودھ میں خودمختار حکومت کی ابتدا کی۔ یہ حکومت تقریباً سوا سو سال کی تاریخ پر محیط ہے جس میں شجاع الدولہ' نواب آصف الدولہ' سعادت خاں غازی الدین حیدر' نصیرالدین حیدر اور واجد علی شاہ کے دورِ حکومت شامل ہیں۔ برہان الملک بہادر بڑے دوراندیش انسان تھے۔ وہ صوبے کے کاموں میں عملی طور پر حصہ لیتے تھے۔ابواللیث صدیقی فیض آباد شہر کے حوالے سے ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'' میں لکھتے ہیں:

> ''بیگمات کے لیے بھی اسی طرح کے کچے محل تعمیر کیے گئے' برہان الملک اپنا زیادہ وقت تو صوبہ کے مختلف علاقوں کے دورے میں گزارتے لیکن جب ان امور سے فرصت پاتے تو اس خس پوش بنگلے میں آ کر قیام کرتے' اِسی مناسبت سے اس بستی کا نام بنگلہ پڑ گیا جو صفدر جنگ کے عہد میں فیض آباد کے نام سے موسوم ہوا' یہی ہمارے اودھ کا پہلا دارالخلافہ تھا۔''
>
> (ص۔27)

فیض آباد اودھ کا پہلا دارالخلافہ تھا لیکن یہ منصوبہ بند طریقے سے نہیں بسایا گیا تھا۔اس بنگلے کے اطراف و اکناف میں بتدریج ترقی ہوتی جا رہی تھی اور پھر یہ نہایت بارونق اور آبادی سے بھرا پُرا ہو گیا۔شجاع الدولہ اور اُن کی اہلیہ بہو بیگم نے فیض آباد کو ادبی و ثقافتی اعتبار سے پہچان عطا کیا۔ جب دلی پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا' اس وقت متعدد شاعر' فن کار اور مختلف پیشے سے وابستہ پریشان حال لوگوں نے اودھ کا ہی رُخ کیا تھا۔بعض شاعروں کو شجاع

الدولہ نے ازخود اودھ آنے کی دعوت دی تھا اور آنے والوں کو عزت و توقیر عطا کی۔ شجاع الدولہ کے بعد نواب آصف الدولہ نے بھی اپنی دانشمندی سے مملکت کو کامیابیوں سے ہمکنار کیا۔ آصف الدولہ نے فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو دارالسلطنت بنایا۔ ان کے عہد میں فن تعمیر کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ انہیں ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ مہمان نواز اور کھلے دل و دماغ کے شخص تھے۔ انہوں نے آنے والوں کی پذیرائی کی اور انہیں انعامات و اکرامات سے نوازا۔ آصف الدولہ کے بھائی سعادت علی خاں تھے۔ انہوں نے تقریباً سولہ سال تک تخت و تاج سنبھالا۔ لکھنؤ کی تاریخ میں آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کا دور بہترین دور رہا ہے۔ غازی الدین حیدر بھی اودھ کے نواب وزیر رہے ہیں۔ لیکن اِس زمانے کے آتے آتے انگریزوں کا تسلط ہو چکا تھا اور اُن کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔ اس دبستان کا آخری بادشاہ نواب واجد علی شاہ تھے۔ انہیں فنون لطیفہ سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ متعدد کتابوں کے مصنف و مولف تھے۔ انہیں اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان سے بھی بہت لگاؤ تھا اور وہ ان دونوں زبانوں میں لکھا کرتے تھے۔ لکھنؤ کے اس آخری تاجدار' واجد علی شاہ کو انگریزوں نے مٹیا برج بھیج دیا۔ اس طرح لکھنؤ کے بادشاہوں کی سخاوت' آپسی محبت و بھائی چارگی' ادب دوستی' شاعروں اور دیگر فنکاروں کی قدردانی و سرپرستی کا چراغ جو برہان الملک کے عہد سے روشن تھا وہ واجد علی شاہ کی معزولی کے ساتھ 1856ء میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔

دبستانِ لکھنؤ ہمیشہ سے تہذیب کا مرقع رہا ہے۔ نوابین' امرا و رؤسا اور زندہ دل لوگوں کی آماجگاہ یہ شہر اپنی منفرد خصوصیات کی وجہ سے ہمیشہ مرکزِ نگاہ رہا ہے۔ رجب علی بیگ سرور نے فسانہ عجائب میں یہ بات بڑے دعوے کے ساتھ لکھی ہے کہ ''حال خطّہ بے نظیر دل پذیر رشک گلشن جنان مسکن حور و غلمان جائے مردم خیز باشندے یہاں کے ذکی فہیم عقل کے تیز۔ اگر دیدہ انصاف و نظر غور سے اس شہر کو دیکھیے تو جہاں کی دید کی حسرت نہ رہے' آنکھ بند کرے شعر سنا۔ رضوان بھی جس کا خوشہ چیں ہے وہ بیشک لکھنؤ کی سرزمین ہے۔'' سرور کے اس خیال سے انکار ممکن نہیں ہے۔

کسی بھی شہر کی تاریخ میں وہاں کے بنیادگزار کا نام ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ متذکرہ خطے کے حوالے سے شجاع الدولہ' آصف الدولہ' غازی الدین حیدر اور واجد علی شاہ کا نام ہمیشہ تابندہ رہے گا۔ وہ فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھتے تھے اور ان کی اس دلچسپی کی بازگشت ان کے عہد سے عصر حاضر تک سنائی دیتی ہے۔ ہر علاقے کی اپنی اپنی تہذیب ہوتی ہے جس کے سبب اس علاقے کی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب کی جھلک وہاں کے لباس' طرز معاشرت' غذا' عادات و اطوار میں واضح طور پر ملتی ہے۔ مثلاً کڑھائی کیے ہوئے کُرتے' چوڑی دار پاجامے' دوپلّی ٹوپی' ریشمی رومال' مخملی جوتے وغیرہ وہاں کے خاص لباس ہیں۔ وہاں کی رضائی گوٹے کنارے لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ چکن کا کام ساری دُنیا میں مشہور ہے بلکہ اب تو یہ مخصوص کام لکھنوی ورک کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

لکھنؤ کے رہن سہن' طرز زندگی' رسومات' عقائد' توہمات وغیرہ منفرد نوعیت کے ہوتے ہیں۔ دبستان لکھنؤ کی شاعری اور نثر میں طوائفوں کا ذکر بھی اکثر و بیشتر ملتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہاں کے نوابین اور معتبر لوگوں کے یہاں طوائفوں کو معیوب نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ لکھنؤ کے تہذیبی عناصر کا ایک اہم جز و تھیں۔ وہ نوجوان لڑکوں کو آداب زندگی اور سلیقہ مندی کی تربیت دیتی تھیں۔ مجرے' خواجہ سرا' لونڈیاں اور مامائیں وغیرہ وہاں کے معاشرے کا حصہ تھیں۔ سلام کرنے کا طریقہ' آداب کہنے کا انداز' چھوٹوں کو دعا دینے اور اُن سے شفقت سے پیش آنے میں وہاں کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔ لکھنؤ کے بازار' باغات' سڑکیں' چوک وغیرہ بھی اپنی خاص پہچان رکھتے ہیں۔

لکھنؤ اہل تشیع کے حوالے سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرثیہ نگاری کو جتنی شہرت لکھنؤ میں ملی' کسی دوسرے شہر میں نہ مل سکی۔ وہاں محرم کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ وہاں کے مختلف علاقوں میں امام باڑے موجود ہیں جن میں سے بعض کی تو تاریخی اور ادبی حیثیت بھی ہے۔ وہ امام باڑے فنِ تعمیر کے بہترین نمونے ہیں اور قابل دید ہیں۔ لکھنؤ کی تہذیب میں فنونِ لطیفہ کا بھی دخل ہے۔ وہاں کے عوام موسیقی' مصوری اور خطاطی کے ساتھ ساتھ کبوتر بازی' بٹیر بازی' مرغ بازی وغیرہ میں بھی دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جنہیں دبستانِ لکھنؤ کا سماجی و تہذیبی پس منظر کہا جا سکتا ہے اور

اِسی پس منظر میں وہاں کی شاعری پروان چڑھی۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ فیض آباد کے بعد لکھنؤ کو اودھ کا دارالخلافہ کس بادشاہ نے بنایا؟

2۔ ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'' کے مصنف کا نام کیا ہے؟

3۔ انگریزوں نے کس بادشاہ کو ''مٹیا برج'' بھیج دیا؟

14.3 دبستانِ لکھنؤ کی خصوصیات

اٹھارہویں صدی دلی اور لکھنؤ کی ادبی دُنیا اور خصوصاً شاعری کے لیے بہت نشیب وفراز کا دور رہا ہے۔ اٹھارہویں صدی میں لکھنؤ میں اُردو شاعری کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ دوسری طرف دلّی میں بھی اٹھارہویں صدی میں متعدد بلند پایہ شاعر وادیب موجود تھے۔ میر تقی میر، مرزا رفیع سودا، خواجہ میر درد، سوز جیسے قدآور شعرا اس عہد میں شاعری کے گیسو سنوار رہے تھے۔ اِن میں سے ہر شاعر یکتا تھا۔ لیکن وہاں طرح طرح کی مصیبتیں نازل ہونے لگیں اور وہ دلّی جو عالم میں انتخاب تھا اُسے واقعی لوٹ کر ویران کر دیا گیا۔ مورخین اور تذکرہ نگاروں نے ان واقعات کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس عہد میں وہاں کے شعرا وادبا کو دلّی کے روح فرسا ماحول نے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان میں سے بہت سے شعرا نے اودھ جانے کو ترجیح دی۔

لکھنؤ میں شعروادب کے لیے ہر طرح سے ماحول سازگار تھا۔ وہاں کے شاعر، ادیب و فنکار سبھی کو بادشاہوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ شجاع الدولہ، آصف الدولہ، سعادت علی خاں، واجد علی شاہ ادب دوست اور ادب نواز تھے۔ وہ نہ صرف شاعری سے شغف رکھتے تھے بلکہ ان میں سے بیشتر خود بھی شاعر تھے۔ واجد علی شاہ کو فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی۔ نیر مسعود نے اپنے ناول ''طاؤس چمن کی مینا'' میں واجد علی شاہ کی فنون لطیفہ سے دلچسپی کا نقشہ کھینچا ہے اور اودھ کے زوال آمادہ معاشرے کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ دلّی سے جتنے شعرا ہجرت کر کے لکھنؤ پہنچے اُنہیں وہاں ایک اچھا ماحول میسر آیا، دربار تک رسائی ہوگئی۔ وہاں کے نوابین، امرا و رؤسا نے ان کے شایان شان اُنہیں نوازا۔ وہاں ان شاعروں کو چین وسکون نصیب ہوا۔ وہاں کی فارغ البالی کے ماحول نے ایسے شاعروں کی شعری تخلیقیت کو مزید قوت وتوانائی عطا کی جس سے ان کی شاعری کا حسن دوبالا ہوگیا۔

دبستانِ لکھنؤ کی سرزمین ادبی حوالے سے دلّی سے مختلف تھی۔ وہاں کے ماحول اور مزاج میں رنگینی رچی بسی تھی۔ ہر طرف خوشحالی تھی۔ نوابوں کے اپنے اپنے شوق تھے۔ فنون لطیفہ سے دلچسپی، گھڑسواری کا شوق، تلوار بازی اور بٹیر بازی میں دلچسپی تھی۔ گھنگھروؤں اور پائلوں کی جھنکار گلی کوچے میں سنائی دیتی تھی۔ عیش وعشرت اور داد و دہش کا دور تھا۔ اس ماحول میں جو شاعری ہو رہی تھی ان میں لفظی صنعت گری، زبان کی بازی گری، تصنع وتکلفات، صنعتوں کا استعمال، مشکل پسندی، دور کی کوڑی لانے کی کوشش، حسن وعشق اور محبوب کے سراپا کا بیان وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ایسے اجزا وعناصر ہیں جن سے دبستانِ لکھنؤ کی شاعری عبارت ہے۔ سید وقار عظیم نے دبستانِ لکھنؤ کی شاعری سے متعلق لکھا ہے:

> ''تکلف اور تصنع، محسوسات کی سادگی اور واردات کی سچائی کے بجائے خیال کی رنگینی اور فکر کی باریکی، لفظی صنعت گری، دوراز کار استعارے اور تشبیہیں، سخت اور سنگلاخ زمینیں، پُر شکوہ الفاظ اور تراکیب، دل کی بجائے دماغ سے تخاطب، لب و لہجہ میں ایک طرح کا ہلکا پن جو بار بار بدمستی، ہوسنا کی اور عریانی پر منتج ہوتا ہے۔''
>
> (بحوالہ کشاف تنقیدی اصطلاحات ص۔79)

یہ وہ خصوصیات ہیں جن سے دبستانِ لکھنؤ کی شاعری پُر ہے۔ جو شعرا یہاں پہلے سے موجود تھے ان کی شاعری متذکرہ خصوصیات سے مزین ہے۔ اسی تسلسل میں یہ بات بھی حقیقت ہے کہ دلی سے آنے والے شعرا بھی یہاں کے اسی ماحول میں رفتہ رفتہ ڈھل گئے۔ اس ماحول میں ڈھلنا اُن کے

طبعی میلان کے ساتھ ساتھ وقت کا تقاضا بھی تھا۔ ان کی مجبوری بھی تھی۔ ایسے شعرا بادشاہِ وقت کی خوشنودگی' دربار تک رسائی اور داد وتحسین' نیز عوام میں کلام کی مقبولیت کا ایک بہترین ذریعہ شاعری میں انفرادیت اور جدت پیدا کرنا سمجھتے تھے۔ اِسی لیے شاعروں نے شعوری اور غیر شعوری دونوں طور پر اس رنگ کو اختیار کر لینے کی کوشش کی تھی۔

ادب کی تمام اصناف میں غزل کو ہر زمانے میں شہرت ملی جس کا موضوع اور دائرہ کار اور مرکز ومحور حسن وعشق ہے۔ دبستانِ لکھنؤ میں ان روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ محبوب کے سراپا کا بیان اور اس کی جزئیات نگاری پر زور دیا گیا ہے تا کہ لطف وانبساط کا ذریعہ بن سکے اور اسی سبب بعض دفعہ فحش اور ابتذال جیسی باتیں بھی شاعری میں در آتی تھیں۔ غزل کی مقبولیت کا یہ عالم رہا ہے کہ معروف ادیب رشید احمد صدیقی نے اسے اُردو شاعری کی آبرو قرار دیا ہے۔ ابتدائی دنوں میں غزل میں عشق کی کیفیات اور قلبی واردات' جذباتی کیفیات کا اظہار ہوتا تھا۔ غزل اپنے اصطلاحی معنوں میں اس صنف سخن کو کہا جاتا ہے کہ جس میں عورتوں سے باتیں کی جائیں یا اس کے بارے میں باتیں کی جائیں۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ دُنیا کی بے ثباتی ' معاشرے کے جیتے جاگتے واقعات' بہار کے موسم' گرما کی شدت وغیرہ جیسے موضوعات بھی اس میں شامل ہوتے گئے۔ عہد حاضر میں تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کوئی ایسا موضوع نہیں جس کے تعلق سے غزل کے شعر نہ کہے گئے ہوں۔ آج ہر موضوع پر غزل کہی جا رہی ہے۔

دبستانِ لکھنؤ میں اُردو کی ایک اور شعری صنف ''ریختی'' کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ اس صنف کی ابتدا دکن میں ہاشمی بیجا پوری سے ہوتی ہے اور لکھنؤ میں رنگین اس جانب متوجہ ہوئے۔ رنگین کے ساتھ انشا بھی تھے۔ رنگین کا دعویٰ تھا کہ وہ اس کے موجد ہیں۔ اِس صنف میں عورتوں کی زبان میں شاعری کے ساتھ ساتھ اس کے دُکھ درد' نفسیات وکیفیات' عورت کے ناز وادا اور اس کی نشست کے آداب وغیرہ کی مکمل عکاسی کی جاتی ہے تا کہ مکمل شبیہ اُبھر سکے۔ یہ بات بھی حیران کن ہے کہ ریختی مرد حضرات ہی نے لکھی ہے۔ یہاں تک کہ دربار میں بھی اُنہوں نے ہی پیش کی ہے۔ ایسے شعرا عموماً نسوانی لب ولہجے اور انداز وادا کے ساتھ نسوانی لباس بھی زیب تن کیا کرتے تھے۔ مثال دیکھیے:

اور مستانیاں وہ ہوتی ہیں　　مردوں پر جو جان کھوتی ہیں　　(مرزا شوق لکھنوی)

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں　　ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں　　(انشا)

ابتدا سے ہی یہ تصور کیا جاتا ہے کہ صنعتوں کا استعمال شاعری میں حسن پیدا کرتا ہے۔ دبستان لکھنؤ میں بھی اس کا کثرت سے استعمال کیا گیا۔ تشبیہ' استعارے' مجاز مرسل' مراۃ النظیر' لف ونشر وغیرہ صنعت کی قسمیں ہیں۔ ایہام بھی ایک صنعت ہے۔ ایہام کے معنی وسوسہ پیدا کرنا ہے۔ اس میں کسی لفظ کو شعر میں اس طرح برتا جاتا ہے کہ اُس سے دو معنی نکلتے ہوں۔ اس طرح قاری ایہام کا شکار ہو جاتا ہے کہ آیا شاعر نے کون سے معنی مراد لیے ہیں۔ لکھنؤ کی شاعری میں صنعت ایہام کا استعمال ایک فن تصور کیا جاتا تھا۔ وہاں کے شعرا ایہام سے شاعری میں فضا قائم کرتے تھے۔ ایسے ایسے ذو معنی الفاظ تلاش کر کے شاعری میں استعمال کرتے کہ حسن میں اضافے کے ساتھ ساتھ لطف کا سامان مہیا ہو جائے۔ دبستانِ لکھنؤ میں اسے ہنر اور کمال تصور کیا جاتا تھا لیکن جب کوئی بھی چیز حد سے تجاوز کر جائے تو اس میں کچھ خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لکھنؤ کی شاعری بھی تکلفات کے بوجھ سے دبی جا رہی تھی۔ اُسی عہد میں ناسخ اور مرزا مظہر جان جاناں نے اصلاح زبان کی تحریک شروع کی۔ اُنہوں نے زبان کی صفائی پر زور دیا۔ ہندی اور سنسکرت کے الفاظ سے گریز کیا۔ قواعد کے مطابق زبان کی اصلاح کی اور نئی نئی بندشیں اور تراکیب ایجاد کیں۔ اِنہیں دبستانِ لکھنؤ میں ایک منفرد مقام ومرتبہ حاصل ہوا۔ دبستانِ لکھنؤ میں ایک طرف منفرد لب ولہجے کی شاعری ہو رہی تھی وہیں دوسری طرف اسی دور میں مرثیے کی ایک صحت مند روایت کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ وہاں حمد' نعت' منقبت وغیرہ بھی کہے جا رہے تھے۔ میر انیس اور دبیر نے مرثیے اور رباعی کو بام عروج تک پہنچایا بلکہ اُس کے لیے سازگار ماحول بھی بنایا۔ ان کے یہاں دل ودماغ کی پاکیزگی اور خراج عقیدت پیش کرنے کا جذبہ تھا۔ مرثیے کو ثواب کا ذریعہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس لیے کہ اس میں واقعات کربلا اور

شہدائے کربلا کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے جس سے ایک روحانی فضا قائم ہوتی ہے۔انیس و دبیر اس دور کے اہم مرثیہ گو تھے۔

دبستانِ لکھنؤ کی شعری خصوصیات اور اہمیت دبستانِ دہلی کے مدمقابل قدرے کم تسلیم کی جاتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ لکھنؤ کی شاعری نے ادب میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ یہاں کے شعرا نے ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے کی غرض سے نئے نئے تراکیب ایجاد کیے' مشکل ردیف وقوافی میں شاعری کی' الفاظ کا مختلف انداز سے استعمال کیا' خارجی کیفیات واحساسات کے بیان پر کافی زور دیا۔امرا ورؤسا اور نوابوں کو خوش کرنے کے لیے قصد کر کے شاعری کرتے تھے جس سے اُن کی مشق سخن جاری رہی۔اپنی اِس صلاحیت پر وہ نازاں وفرحاں رہا کرتے تھے۔آتش نے بجا کہا ہے:

بندشیں الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

آتش نے الفاظ کی مرصع سازی کو ایک فن مانا ہے۔شاعری میں الفاظ ایسے ہی جڑے جاتے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگوں کو جڑا جاتا ہے۔اِس فنکاری سے دبستانِ لکھنؤ کے شعرا بحسن وخوبی واقف تھے اور عمل پیرا بھی تھے۔یہ اس دبستان کا خاصا بن کر رہ گیا تھا۔دبستانِ لکھنؤ میں زبان کی نفاست و نزاکت پر زور دیا گیا ہے۔ اِس دبستان کے شعرا کو بادشاہ کی سرپرستی حاصل تھی اور معاشرہ خوشحال تھا۔اسی لیے وہاں شاعروں کو خوب پھلنے پھولنے اور اپنے کمالات کے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔وہاں شاعری میں غزل کے ساتھ ساتھ مثنوی اور مرثیے کو بھی خوب شہرت حاصل ہوئی۔

14.4 دبستانِ لکھنؤ کے اہم شعرا

14.4.1 شیخ قلندر بخش جرات

شیخ قلندر بخش جرات کا اصل نام یحییٰ امان تھا۔جرات اُن کا تخلص تھا۔وہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ان کے خاندان کے لوگ مغل دربار میں خدمات انجام دیا کرتے تھے۔والد کا نام حافظ امان تھا۔وہ خوددار اور خداترس انسان تھے۔اورنگ زیب کے انتقال کے کچھ برسوں بعد جب نادرشاہ نے دلی پر حملے کیے اور حد درجہ تباہی و بربادی مچادی تب دلی اُجڑ سی گئی۔نادرشاہ کے حملے کا ذکر کتابوں میں تاریخی سانحے اور ایک سیاہ باب کی طرح ملتا ہے۔ اس حملے کے دوران جرات کے والد بھی مارے گئے۔جرات بے سروساماں ہوگئے۔مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔جرات کا شعروشاعری سے طبعی میلان تھا۔ وہ ابتدا میں جعفرعلی حسرت کے شاگرد تھے۔جرات کو حسرت سے بہت عقیدت تھی۔وہ ان کا دل سے احترام کرتے تھے۔شاعری کے علاوہ جرات علوم نجوم سے واقف تھے۔موسیقی سے بھی دلچسپی تھی اور ستار بھی اچھا بجایا کرتے تھے۔لیکن اُن کی شہرت ومقبولیت بحیثیت شاعر ہوئی۔جرات کی جوانی میں ہی دونوں آنکھوں کی روشنی چلی گئی جس کا قلق اُنہیں عمر بھر رہا۔مرزا سلیمان شکوہ کے زمانے میں لکھنؤ چلے آئے اور دربار سے وابستہ ہوگئے۔لکھنؤ میں انشا و مصحفی کا طوطی بول رہا تھا۔جرات سے اُن کے معرکے شروع ہوگئے اور ان معرکوں اور مقابلوں کے باوجود جرات نے اپنی ایک منفرد شناخت قائم کرلی۔

جرات مزاجاً بڑے رنگین تھے۔انہیں زبان پر بھی قدرت تھی۔لہٰذا وہ جذبات و کیفیات کا بیان بڑے عمدہ طریقے سے کرتے تھے۔روانی اور بے ساختگی ان کی شاعری کی ایک اہم خوبی تھی۔موضوع کے اعتبار سے اُن کا مرکز ومحور عاشقانہ تھا۔کبھی کبھی عشق کے بیان میں اتنی شدت اور گہرائی پیدا ہوجاتی تھی کہ وہ فحش نگاری تک پہنچ جاتی تھی۔جرات کی شاعری میں معاملہ بندی کے اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔جرات کے استاد جعفرعلی حسرت کے یہاں بھی یہی خصوصیت ملتی تھی لیکن جرات اُن سے بھی آگے نکل گئے۔

جرات کی زندگی خاصہ حصہ لکھنؤ میں گزرا۔ان کی شاعری دبستانِ لکھنؤ کی شعری خوبیوں سے مملو ومزین تھی۔جرات کا محبوب تخیلاتی وتصوراتی نہ ہوکر حقیقی تھا۔اُنہوں نے غزلیں' مثنویاں' مرثیے اور قطعات یادگار چھوڑے ہیں۔1810ء میں لکھنؤ ہی میں اُن کی وفات ہوئی۔اُن کے اشعار کے نمونے ملاحظہ کیجیے:

اپنے پہلو سے جب وہ اُٹھ کے چلا اے جرات
اُس کا منھ دیکھ کے بس رہ گئے مجبور سے ہم
دور سے کل ہم نے اُس کے آستاں کو دیکھ کر
رو دیا کن حسرتوں سے آسماں کو دیکھ کر

14.4.2 انشا اللہ خاں انشا

انشاءاللہ خاں انشا1756ء میں مرشدآباد میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔شاہ عالم ثانی کے زمانے میں اپنے والد ماشاءاللہ، کے ہمراہ دلی تشریف لائے۔ انشا کافی پڑھے لکھے انسان تھے۔ بلاکے ذہین،بذلہ سنج اور حاضر جوابی میں یکتا تھے۔ وہ کئی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ ترکی،بھاکا،فارسی،سنسکرت وغیرہ زبانوں سے اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ انشا بڑے ہی ہنسوڑ قسم کے انسان تھے۔ وہ کسی بھی محفل میں بلاتکلف اور بغیر کسی مصلحت کے کچھ بھی کہہ جاتے تھے۔ جو دل میں آتا اُسے کہنے سے گریز نہ کرتے تھے۔ وہ جب دلی میں تھے اس وقت بھی انشا کی اپنے معاصرین سے سرد جنگ چلتی رہتی تھی۔انشا سلیمان شکوہ کے زمانے میں لکھنؤ آئے۔ یہاں مصحفی پہلے سے موجود تھے۔ دونوں میں نظریاتی اختلاف شروع ہوگیا اور حددرجہ تلخی پیدا ہوگئی۔ مصحفی وہاں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔لیکن انشا نے بھی اپنی ذہانت سے سبھوں کو قائل کرلیا اور دبستان لکھنؤ کی دُنیائے شاعری پر چھاگئے۔انشا کی سعادت علی خاں کے دربار تک رسائی ہوگئی۔

سعادت علی خاں انشا کے لطیفے اور ان کی ذہانت کے اتنے قائل ہوگئے کہ انہیں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔انہیں وہ وقار اور سہولتیں عطا کی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ انشا اپنی اس عزت افزائی اور وقار کو سنبھال نہ سکے۔ وہ اکثر حد سے تجاوز کر جاتے تھے۔کبھی کبھی لطیفوں اور گفتگو کے درمیان ایسی مثالیں دے دیتے کہ وہ سعادت علی خان کی ناراضگی کا باعث ہو جاتا تھا۔رفتہ رفتہ یہ ناراضگی تلخی میں بدل گئی۔انہیں دربار سے ملنے والی سہولتوں اور بادشاہ کی کرم فرمائیوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔انشا کا آخری وقت بہت عسرت میں گزرا۔انشا کی شاعری ان کے ذاتی مزاج اور لکھنوی شاعری کی خصوصیات سے مزین ہے۔کلام میں سادگی کی جگہ زندہ دلی ہے۔وہ ایسی فضا قائم کرتے تھے جہاں ہنگامہ اور حرکت ہو۔انشا سوز وگداز کے شاعر نہیں تھے۔وہ زندگی کو جینے کے قائل تھے۔جب وہ لکھنؤ پہنچے تو وہاں کی شاعری پورے آب وتاب اور شباب پر تھی۔لکھنوی شاعری کا وہ انداز، وہاں کا عیش و نشاط،محبوب کا سراپا اور معاملہ بندی کا بیان انشا کی شاعری میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔انشا دربار تک رسائی اور معاصر شاعروں سے معرکے کے سبب بھی ہمیشہ تذکروں میں رہے۔ان کے زمانے میں لوگ اور بالخصوص معاصر شعرا ان پر رشک کیا کرتے تھے۔لیکن اعتدال نہ ہونے کے سبب انہوں نے سب کچھ کھودیا۔

انشا بیک وقت شاعر اور نثر نگار دونوں تھے۔انہوں نے اردو قواعد کی کتاب ''دریائے لطافت'' کے نام سے لکھی۔انہوں نے دو داستانیں ''رانی کیتکی کی کہانی'' اور ''سلک گوہر'' لکھیں۔ دونوں ہی داستانوں میں انہوں نے عام روش سے ہٹ کر جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔''سلک گوہر'' بغیر نقطے کی داستان ہے یعنی پوری داستان میں ایسا کوئی بھی حرف استعمال نہیں کیا گیا ہے جس میں نقطہ آتا ہو۔''رانی کیتکی کی کہانی'' خالص بھاشا میں لکھی گئی ہے۔اردو کی یہ داستان عربی و فارسی کے الفاظ سے عاری ہے۔

انشاءاللہ خاں انشا کی شاعری کے چند نمونے ملاحظہ کیجیے:

اچھا ہے خفا ہم سے تم اے صنم اچھا
لو ہم بھی نہ بولیں گے خدا کی قسم اچھا

گرنازنیں کہے سے برا مانتے ہو تم
میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی
کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہت بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے:

1۔ جرات کا پورا نام کیا تھا؟

2۔ جرات ابتدا میں کس شاعر سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے؟

3۔ انشا کی بغیر نقطے کی تحریر کردہ داستان کا نام بتایئے۔

14.4.3 غلام ہمدانی مصحفی

مصحفی کے تخلص سے مشہور اس معروف شاعر کا اصل نام غلام ہمدانی تھا۔وہ 1750 عیسوی میں امروہہ ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہویں صدی کی پانچویں، چھٹی دہائی مغل سلطنت کے زوال اور شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔مصحفی بچپن ہی میں دلی چلے آئے تھے۔یہاں انہیں ادبی ماحول ملا۔مصحفی نے دلی میں رہتے ہوئے عربی اور فارسی زبان پر دسترس پیدا کی۔عمر کے ساتھ ساتھ شاعری میں دلچسپی کا اضافہ ہوا،محفلوں اور مشاعروں میں جانا بھی شروع کر دیا۔مصحفی کو کتب بینی کا شوق بچپن سے تھا۔جب دلی کے حالات بدل گئے اور شعرا نے لکھنو کے لیے رخت سفر باندھنا شروع کر دیا تو مصحفی نے بھی دلی کو خیر باد کہتے ہوئے پہلے فیض آباد اور پھر لکھنؤ چلے گئے۔یہاں مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے منسلک ہو گئے۔جب مصطفیٰ لکھنؤ آئے اس وقت انشا اور جرات وہاں پہلے سے موجود تھے۔مصحفی کی انشا سے ان بن رہنے لگی جو لکھنو کی شاعری کی طرح ہمیشہ کے لیے تاریخ کا حصہ بن گئیں۔دونوں ہی شعرا بہت مشہور تھے اور ان کی شاعری کو پسند کرنے والوں اور شاگردوں کی تعداد بھی خاصی تھی۔آئے دن ان کے مداحوں اور شاگردوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔اساتذہ کی چشمک مداحوں اور شاگردوں میں منتقل ہوگئی اور وہ ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرائی کرنے لگے۔محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں دونوں شاعروں کے اختلافات کا ذکر خوب کیا ہے۔ایسے بلند پایا شعرا کے درمیاں چشمک اور تہذیب کی حدود کو عبور کرتی ہوئی سطحی باتیں،ان کی عظمت اور عزت و وقار کو کم کرتی تھیں۔مصحفی آخر وقت تک لکھنؤ ہی میں رہے اور 1824ء میں یہیں ان کا انتقال ہوا۔

مصحفی بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ بہترین تذکرہ نگار کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔انہوں نے فارسی شعرا کے تذکرے ''عقد ثریا'' کے نام سے رقم کیا اور دو تذکرے شعرائے اردو سے متعلق لکھے جو ''ریاض الفصحا'' اور ''تذکرہ ہندی'' کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

مصحفی قادر الکلام اور زود نویس شاعر تھے۔انہوں نے کثیر تعداد میں غزلیں کہی ہیں۔معاشی تنگی کی وجہ سے وہ اپنی غزلیں معاوضہ لے کر دوسروں کو دے دیا کرتے تھے۔انہیں دلی اور لکھنؤ کے درمیان کا پل بھی کہا جاتا ہے۔اس لیے کہ ان کے یہاں دلی کی شاعری کی خصوصیات بھی ملتی ہیں اور لکھنوی شاعری کے عناصر بھی نظر آتے ہیں۔اس عہد میں دلی میں میر،سودا،درد،سوز وغیرہ چھائے ہوئے تھے جن کے یہاں شاعری داخلیت یعنی داخلی کیفیات سے پر ہے۔اس دور کی دلی کی شاعری تغزل سے بھرپور ہوتی تھی۔دوسری طرف دبستانِ لکھنؤ ہے جہاں خارجیت اور تصنع و تکلفات موجود ہیں۔لکھنو کی شاعری ان خصوصیات سے بھری پڑی ہے۔اس کی بھرپور نمائندگی انشا،جرات اور رنگین کر رہے تھے۔مصحفی کو دونوں دبستانوں سے سروکار رہا۔مصحفی ماضی کی

یاد لیے حال میں جی رہے تھے اور اس ماضی و حال کے درمیان انہیں ایک نئی راہ اختیار کرنی تھی جو منفرد بھی ہو اور ممتاز بھی۔ مجنوں گورکھپوری کا یقین ہے کہ مصحفی کی شاعری میں کئی شعرا کے کلام کی خصوصیات موجود ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"مصحفی بڑے پر گو شاعر تھے۔ ان کا کلام بہت سی خصوصیتوں کا حامل ہے جس میں سودا کی شوکت الفاظ، میر کا سوز و گداز، درد کی شگفتگی، فغاں کی رنگینی، انشا کی ترکیب الفاظ اور جرات کی سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنی غزل کی بنیاد خلوص اور محبت پر رکھی ہے۔"

(مصحفی اور ان کی شاعری، ص 15 مشمولہ ولی سے آتش تک، مرتبہ ایم حبیب خاں)

مصحفی کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا
یا کبھو تک کے در کو کھڑے رہے کبھو آہ بھر کر چلے گئے
ترے کوچے میں گر آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کر چلے گئے

14.4.4 شیخ امام بخش ناسخ

امام بخش نام تھا اور ناسخ تخلص فرماتے تھے۔ ان کے والد شیخ خدا بخش تجارت کی غرض سے لاہور سے اودھ آئے اور یہیں ناسخ کی پیدائش ہوئی۔ ناسخ متمول گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ تعلیم و تربیت کا بھی معقول انتظام تھا۔ یہ بہت لمبے چوڑے انسان تھے جنہیں کھانے کا بہت شوق تھا۔ انہیں آم سے بہت رغبت تھی۔ باقاعدگی سے ورزش کیا کرتے تھے۔ ناسخ بنیادی طور پر اصول پسند انسان تھے۔ جب لکھنؤ دارالخلافہ بن گیا تو فیض آباد سے لکھنؤ چلے آئے۔ شعر و شاعری سے انہیں ابتدا ہی سے شغف تھا۔ لیکن خود ہی مشق سخن کیا کرتے تھے۔ کسی کو اپنا استاد نہیں بنایا۔ ناسخ نے جب شاعری کی ابتدا کی اور رفتہ رفتہ مشاعروں میں جانے لگے تو جلد ہی بہت مقبول ہو گئے۔ شہر کی مشہور و معروف شخصیات نے ان کی شاگردی قبول کی۔ ناسخ کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔ وہ کبھی دربار سے وابستہ نہیں ہوئے تھے۔ ان کے معاصر آتش تھے جن سے ان کی معرکہ آرائی تھی۔ ناسخ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ ان کی شناخت دو حیثیتوں سے ہے۔ شاعری اور اصلاح زبان کی کوششوں کے حوالے سے۔ لکھنو کی شاعری میں جو خصوصیات موجود تھی وہ کسی حد تک ناسخ کے یہاں بھی موجود ہیں۔ البتہ تصنع اور صنعتوں کا کثرت استعمال ناسخ کی شاعری کی روح کو مجروح کر دیتا ہے۔ بقول احتشام حسین ''غزل میں جو جذباتی اقبال اور سوز و گداز ہوتا ہے وہ نہ صرف کہ یہاں بہت کم ہے۔'' جذباتی ابال اور سوز و گداز کی کمی کے باوجود ناسخ کی غزلیں لفظی شان و شوکت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی کی شان میں قصیدے نہیں لکھے۔ ناسخ اپنے زمانے کے بہت مشہور شاعر تھے اور استاذ الاساتذہ کہلاتے تھے۔

ناسخ کا اہم کارنامہ اصلاح زبان کی تحریک ہے۔ وہ اس کے موجد کہلاتے ہیں۔ انہوں نے زبان کی تذکیر و تانیث اور قواعد کا تعین کیا۔ ہندی کے ثقیل الفاظ خارج کر کے اردو زبان کو صحت و سلاست اور روانی عطا کی۔ ناسخ کے زمانے میں دبستان لکھنو کی شاعری کا جو انداز تھا، ناسخ نے اس سے منفرد ایک ایسا طرز ایجاد کیا جس سے لکھنؤ کی ادبی دنیا مزید مستحکم ہوگئی۔ ناسخ نے اردو زبان کے لیے جو اصول و قواعد وضع کیے وہ خود بھی ان اصولوں پر ہمیشہ کاربند رہے۔ یہی اصول کی پابندی ان کی شاعری کے اڑان اور پرواز میں حارج ہو جاتی ہے۔ زبان کی صفائی کے سبب شاعری میں پابندی سی لگ جاتی ہے اور شاعر خیال بندی کے بجائے قوائد و مفاہیم کا شکار ہو جاتا ہے۔

ناسخ کے نمونے کے اشعار ملاحظہ کیجیے:

دور ہے یار اپنی نظروں سے تصور میں قریب
گھر تو ویراں ہے مگر بزم خیال آباد ہے
شبہ ناسخ نہیں کچھ میری استادی میں
آپ بے بہرہ ہیں جو معتقد میر نہیں
کسی کا کب کوئی روز سیہ میں ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے
جسم چھوٹا روح سے دل سے نہ چھوٹا وہ صنم
بت بغل میں لے چلے ہیں ہم خدا کے سامنے

14.4.5 خواجہ حیدر علی آتش

خواجہ حیدر علی نام اور آتش تخلص تھا۔ آتش کے بزرگوں کا وطن بغداد تھا مگر ان کے آباو اجداد دلی منتقل ہو گئے تھے۔ والد کا نام خواجہ علی بخش تھا۔ آتش اپنے والد کے ہمراہ نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد چلے آئے۔ وہ جب کم عمر ہی کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ والد کے انتقال کی وجہ سے ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ آتش کی دوستی کچھ ایسے لڑکوں سے ہوئی ہے جو امرا و رؤسا کے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی دوستی کی وجہ سے آتش کی زبان کافی نکھر گئی۔ وہ عربی و فارسی زبان کی درسی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے تاکہ اس میں مہارت پیدا کر سکیں۔ اس زمانے میں فیض آباد میں ''سپاہ گری'' اور ''تلوار بازی'' کا بھی شوق پایا جاتا تھا۔ آتش نے بھی ان کی تربیت حاصل کی اور مہارت پیدا کر لی۔ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ وہ ''تلواریے'' کے نام سے مشہور ہو گئے۔ وہاں کے رئیس محمد تقی خاں سے آتش کی ملاقات ہوئی۔ وہ آتش کی شاعری سے متاثر ہوئے اور انہیں اپنے یہاں ملازمت پر رکھ لیا۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں محمد تقی حافظ آباد سے لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ آتش بھی ان کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ اس وقت وہاں جرات، انشا، مصحفی، رنگین وغیرہ شاعری کی دنیا پر راج کر رہے تھے۔ انشا و مصحفی کی معرکہ آرائیاں شباب پر تھیں۔ آتش نے بعض معنوں میں مصحفی کا رنگ اختیار کیا اور ان ہی کی شاگردی قبول کی۔ رفتہ رفتہ آتش کی ایک منفرد پہچان بن گئی اور ان کا شمار لکھنؤ کے مشہور شعرا میں ہونے لگا۔

آتش کے مزاج میں توکل تھا۔ مال و دولت سے بے نیاز رہے۔ دربار تک رسائی کی تگ و دو یا امرا و رؤسا سے قربت کی کوشش انہوں نے کبھی نہیں کی۔ نہ کسی کے لیے قصیدے لکھے۔ قناعت پسندی کا یہ عالم تھا کہ الگ تھلگ چھوٹے سے کمرے میں رہا کرتے جہاں آسائش کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی۔ امیروں کے بجائے غریبوں سے ملنا پسند کرتے تھے۔ شاعروں کی سیاست اور سماجی ہنگامہ خیز باتوں سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ اودھ کے دربار سے انہیں 80 روپے ماہوار ملتے تھے۔ اسی میں گزر بسر کرتے تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی ان میں رند، صبا، وزیر اور نسیم نے خوب شہرت پائی۔ آتش کے معاصر شاعروں میں ناسخ بھی تھے جن سے ان کی نوک جھونک چلتی رہتی تھی لیکن دونوں کو ایک دوسرے کا پاس و لحاظ بھی تھا۔ خصوصاً آتش ناسخ کا باقاعدہ ادب کیا کرتے تھے۔ ان کی معرکہ آرائی کی بھی ادبی، تہذیبی اور اخلاقی حدیں تھی۔

آتش کے کلام کے موضوعات میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے ان کی شاعری میں رنگا رنگی تنوع اور تہہ داری پائی جاتی ہے۔ لیکن بنیادی طور پر ان کی شاعری میں عشق، تصوف اور بنی نوع انسان کی بقا کا تصور ملتا ہے۔ اُردو شاعری میں عشق کے موضوعات ابتدا ہی سے ملتے ہیں۔ دبستانِ لکھنو کی شاعری میں یہ رنگ اور بھی گہرا ملتا ہے۔ آتش نے اس روایتی انداز کو اختیار کیا۔ فراق گورکھپوری آتش کی عشقیہ شاعری سے متعلق لکھتے ہیں:

" صحیح ماحول میں محبت اور عشقیہ شاعری دل تنگ نہیں ہوتی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جب دلی اجڑ چکی تھی اس وقت لکھنؤ کی زندگی جنت کی زندگی تھی لیکن کچھ تو فرق دلّی اور لکھنؤ کی زندگیوں میں تھا۔ آتش کی عشقیہ شاعری میں جو ہمک اور لہک ہے وہ بڑی حد تک اسی فرق و امتیاز کی مرہون منت ہے۔"

حالانکہ خلیل الرحمٰن اعظمی کہتے ہیں کہ "آتش کے بہترین کلام پر بھی خارجیت کا رنگ بہت گہرا ہے لیکن یہ خارجیت اس خارجیت سے بہت مختلف ہے جس کے لیے اہل لکھنؤ بدنام ہیں۔"

آتش کی شاعری لکھنؤ کی پرتکلف اور پرکشش ماحول میں پروان چڑھی تھی۔ اس میں مزید نکھارنے اور سنوارنے کا کام آتش کے استاد مصحفی نے کیا۔ آتش کی غزل میں محبوب کا سراپا، انداز و ادا اور اس کے جذبات و احساسات کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ ن کی عشقیہ شاعری کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

کسی کا ہو رہے آتش کسی کو کر رکھے
دو روزہ عمر کو انسان نہ رائیگاں کاٹے

یہ شاعر ہیں الٰہی یا مصور پیشہ ہیں کوئی
نئے نقشے، نرالی صورتیں ایجاد کرتے ہیں

مکی پر معنی روشن، مکاں پر بیت موزوں ہیں
غزل کہتے نہیں ہم چند گھر آباد کرتے ہیں

آتش کی شاعری میں تصوف کا رنگ بھی گہرا ہے۔ وہ قناعت پسند صبر و شکر کرنے والے اور درویشانہ مزاج کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت میں ٹھہراؤ اور پختگی تھی۔ کسی بھی بڑی شخصیت سے وہ مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ ان کی اپنی ایک دنیا آباد تھی جس میں وہ بہت خوش اور مطمئن تھے کہتے ہیں:

بادشاہی سے فقیری کا ہے پایہ بالا
بوریا چھوڑ کے کیا تخت سلیماں مانگوں

چھوڑ کر ہم نے امیری کی فقیری اختیار
بوریئے پر بیٹھے ہیں قالیں کو ٹھوکر مار کر

بادشاہی سے فقیری اور تخت سلیماں کے بجائے بوریا کو اہمیت دینا آتش کی شاعری کے صوفیانہ رنگ کو ظاہر کرتا ہے۔ آتش نے عام روش سے ہٹ کر ایک راہ نکالی اور اس طرح دبستان لکھنؤ کے سرمایہ سخن میں بیش بہا اضافہ کیا اور آنے والے شعرا کے لیے راستے ہموار کیے۔ آتش کے شاگردوں کی کثیر تعداد تھی۔ اس میں ہر مذہب و ملت کی شمولیت تھی۔ وہ انسانیت کے قائل تھے۔ اُن کی شاعری میں اخلاق، انسانی مسائل، آپسی میل جول اور بھائی چارے کا ذکر بار بار آتا ہے۔ ان کے نظریے میں بڑی وسعت تھی جس کا پیغام وہ اپنی شاعری میں دیتے ہیں:

بت خانہ کھود ڈالیے مسجد کو ڈھایئے
دل کو نہ توڑیے کہ خدا کا مقام ہے

ہم کیا کہیں کسی سے کیا ہے طریق اپنا
مذہب نہیں ہے کوئی ملت نہیں ہو کوئی

آتش کے شاگردوں میں دیا شنکر نسیم، وجے دیال وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اپنی مثنوی کی وجہ سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ دبستان لکھنؤ کے نمائندہ

شاعر خواجہ حیدر علی آتش کا انتقال 1846ء میں ہوا۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے:

1۔ ریاض الفصحا کے مصنف کا نام بتایئے۔

2۔ ''اصلاح زبان کی تحریک'' کس نے شروع کی تھی؟

3۔ بادشاہی سے فقیری کا ہے پایہ بالا بوریا چھوڑ کے کیا تخت سلیماں مانگوں

یہ شعر کس کا ہے؟

14.5 دبستانِ لکھنؤ کے دیگر شعرا

دبستانِ لکھنؤ کے مشہور و معروف شعرا میں انشا، مصحفی، ناسخ و آتش وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ ادب میں ان کی غیر معمولی خدمات کا اعتراف کیا جاتا رہے گا۔ ایسے شعرا کو بقائے دوام عطا کرنے والے ان کے شاگرد رشید بھی ہوتے ہیں۔ ناسخ کے تلامذہ میں وزیر، برق، رشک وغیرہ اہم نام ہیں۔ وزیر لکھنؤ کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ دُنیاوی و مادی چمک دمک سے ہٹ کر زندگی بسر کرنے کے قائل تھے۔ امرا، رؤسا اور نوابین وغیرہ کی قربت اور مہربانیوں سے اُنہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ واجد علی شاہ نے انہیں اپنے یہاں آنے کی دعوت دی تھی لیکن اُنہوں نے اُسے نظر انداز کر دیا۔ وہ ناسخ کے زبردست حامی تھے۔ ناسخ کے بنائے ہوئے اصلاح زبان سے متعلق اصول و قواعد کی پیروی بھی کیا کرتے تھے اور ہمیشہ اس کی تقلید کی۔ اُن کا انتقال 1853ء میں ہوا۔ اُنہوں نے اپنی زندگی میں اپنا دیوان مرتب نہیں کیا تھا۔ بعد میں ان کے شاگردوں نے ان کی غزلیں اکٹھا کر کے دیوان کی شکل میں شائع کیا اور اس کا نام دفتر فصاحت رکھا۔ ان کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

جب خفا ہوتا ہے تو یوں دل کو سمجھاتا ہوں میں
آج ہے نا مہرباں، کل مہرباں ہو جائے گا

رشکؔ کا ناسخ کے خاص شاگردوں میں شمار ہوتا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں زبان، قواعد، لفظیات، محاورے وغیرہ پر خاص غور و فکر کیا کرتے تھے۔ رشک کی شاعری ان خوبیوں سے بھری پڑی ہیں لیکن شاعری صرف انہیں اوصاف کی متقاضی نہیں ہوتی ہے۔ ہر صنف کے اپنے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ رشک کی غزلوں میں ایجاز و اختصار اور رنگینی و دلکشی کی کمی کھٹکتی ہے۔ غزلوں میں نزاکت اور سوز و گداز کو بھی لازمی تصور کیا جاتا ہے۔ ترنم و روانی بھی غزل کو مزید حسن عطا کرتی ہے۔ اور یہ تمام وہ خصوصیات ہیں جو غزل کو مقبولِ عام سے خاص بنا دیتی ہیں۔ رشک کی غزلوں میں ان خصوصیات کی واضح کمی نظر آتی ہے۔ اُن کی وفات 1867ء میں ہوئی۔

خواجہ حیدر علی آتش کے بھی متعدد شاگرد تھے جن میں سے رند، شوق لکھنوی اور دیا شنکر نسیم وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نسیم کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ 1812ء میں پیدا ہوئے۔ نسیم نے ابتدا میں غزلیں کہی تھیں۔ ایک شعر دیکھیے:

اب درد جگر ہو کے نکلتا ہے دہن سے
وہ جوش جو برسوں مرے سینے میں نہاں تھا

نسیم کی غزلیں اب بہت کم ملتی ہیں۔ تاریخ اور تذکرہ کی کتابوں میں محض مثالیں ہی بن کر رہ گئی ہیں۔ نسیم اُردو کے علاوہ فارسی زبان کے اچھے واقف کار تھے۔ اُنہوں نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔ ان کی غزلیں بھی فن کے اعتبار سے بھرپور تھیں لیکن وہ اپنی شاہکار مثنوی ''گلزار نسیم'' کے حوالے سے یاد کیے جاتے ہیں۔ گلزار نسیم ابتدا میں کافی طویل تھی۔ نسیم اسے اپنے استاد آتش کے پاس لے گئے اور آتش ہی کے مشورے سے اُنہوں نے اسے مختصر کر دیا۔

گرچہ اس میں تشبیہ واستعارے کا خوبصورت و برمحل استعمال اور رعایت لفظی کا التزام کیا گیا ہے مگر اس مثنوی کی نمایاں خوبی ایجاز واختصار بن گئی۔ بقول رشید حسن خاں:

''اختصار (واقعات اور الفاظ دونوں کا) رعایت لفظی کی مدد سے معنویت کی پیکر تراشی' بندش کی چستی' جس کے فیض سے اشعار کی روانی' ضرب الامثال سے چشمک زنی کرتی ہے۔ ان بنیادی خصوصیات کے علاوہ تشبیہوں اور استعارات کی ندرت بھی اس مثنوی کی ایک خاص صفت ہے۔'' (مثنوی گلزار نسیم' معیاری ادب۔ص8)

ایجاز واختصار کی ایک بہترین مثال ملاحظہ کیجیے جس میں نسیم نے پورے واقعے کو دو اشعار میں پرو دیا ہے:

توتا بن کر شجر پہ آ کر　　پھل کھا کے بشر کا روپ پا کر
پتے پھول گوند چھال لکڑی　　اُس پیڑ سے لے کر راہ پکڑی

توتا کا شجر پر آنا اور پھل کھا کر انسانی شکل اختیار کر لینا انتہائی کم سے کم الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ اس سے کہانی کو آگے بڑھانے میں کافی مدد ملتی ہے۔ گلزار نسیم طبع زاد مثنوی نہیں ہے۔ یہ کہانی پہلے فارسی زبان میں نثر میں تھی۔ نہال چند لاہوری نے اسے اُردو میں ترجمہ کیا جسے بعد میں نسیم نے نظم میں ڈھال دیا۔ اس بلند پایہ مثنوی نگار کی وفات 1844ء میں ہوئی۔

لکھنو کے ایک اور اہم شاعر میر حسن ہیں جو میر غلام ضاحک کے صاحبزادے تھے۔ ضاحک دلی کے متوطن تھے۔ میر حسن کی پیدائش بھی دہلی میں ہی ہوئی تھی لیکن جب اٹھارہویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں مرہٹوں اور جاٹوں نے دہلی میں تاراجی پھیلا دی تب دہلی کے دیگر شاعروں کی طرح میر غلام ضاحک کو بھی اپنے فرزند کے ساتھ لکھنؤ آنا پڑا۔ اس وقت میر حسن کی عمر محض تیرہ برس تھی۔ میر حسن کے فرزند میر خلیق تھے اور خلیق کے فرزند میر انیس تھے۔ خلیق نے تاعمر مرثیہ ہی لکھا اور انیس نے مرثیہ نگاری کو بام عروج تک پہنچا دیا۔

میر حسن نے مرثیے' قصیدے' غزلیں' مثنویاں اور تذکرہ اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ لیکن میر حسن ہمیشہ اپنی مثنویاں خصوصاً گلزار ارم اور ''سحر البیان'' کے لیے یاد کیے جاتے ہیں۔ سحر البیان ان کی آخری مثنوی ہے جسے ان کی زندگی کے تجربات ومشاہدات کا حاصل کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس مثنوی کو کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔ سادہ بیانی' جذبات نگاری اور جزئیات کی عکاسی اس کی اہم خصوصیات ہیں۔ محمد حسین آزاد اپنی مایہ ناز کتاب آب حیات کے دور چہارم میں یوں رقمطراز ہیں:

''میر حسن مرحوم نے اسے لکھا اور ایسی صاف زبان' فصیح محاورے اور میٹھی گفتگو میں اور اس کیفیت کے ساتھ ادا کیا جیسے آبِ رواں۔ اصل واقعہ کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ گیا اور انہیں باتوں کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں جو اس وقت وہاں ہو رہی تھیں۔ باوجود اس کے اصول فن سے بال بھر ادھر یا اُدھر نہ گرے۔ قبول عام نے اسے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں پر رکھا اور آنکھوں نے دل وزبان کے حوالے کیا۔ اس نے خود اس اہل سخن کی تعریف پر قناعت نہ کی بلکہ عوام جو حرف بھی نہ پہچانتے تھے وظیفوں کی طرح حفظ کرنے لگے۔ ارباب نشاط نے محفلوں میں اس کی نغمہ سرائی کر کے لوگوں کو رُلایا۔''

(آب حیات۔ص44-243)

سحر البیان 1784ء میں لکھی گئی۔ دلّی میں میر حسن کی خواجہ میر درد سے قربت رہی اور لکھنؤ میں میر ضیا سے شاعری پر مشورہ لیا کرتے تھے۔

دبستانِ لکھنؤ کی شاعری جن خصوصیات کی وجہ سے جانی جاتی ہے' سحر البیان میں اس کا اثر کم ہی نظر آتا ہے۔ ذو معنویت اور صنعتوں کے کثرتِ استعمال کی بجائے اُس میں سادگی' سلاست اور روانی موجود ہے جو دبستانِ دہلی کا طرۂ امتیاز ہیں۔ البتہ سحر البیان کی مرکزی کردار بدر منیر لکھنؤ کے نوابی

گھرانوں کی نسوانی کردار کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ بےنظیر کا کردار بھی اِسی نوعیت کا ہے۔مثنوی کا اگر فنی تجزیہ کیا جائے تو ان دونوں کرداروں میں حرکت و عمل کا فقدان نظر آتا ہے۔لیکن حقیقت میں یہ لکھنؤ کے ایسے ماحول کے پروردہ کردار ہیں جہاں کے شہزادے شہزادیوں سے عیش وعشرت کے علاوہ مزید کچھ توقع نہیں کی جاسکتی ہے۔ یہ زندگی کے مسائل سے نبرد آزما نہیں ہو سکتے تھے۔معرکے سر کرنا ان کی زندگی کا مقصد نہیں ہوتا تھا۔اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو میر حسن نے اپنے عہد کے لکھنؤ کے کردار کو من وعن پیش کیا ہے۔اور ان کی یہی خوبی انہیں دبستانِ لکھنؤ کے شاعروں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔

جرات اور انشا کے معاصرین میں رنگین بھی ایک اہم شاعر ہیں۔ رنگین کا قیام چند سالوں کے لیے مرزا سلیمان شکوہ کے زمانے میں لکھنؤ میں رہا۔ رنگین بہت ہی ذہین، ذکی وفہیم اور وسیع المطالعہ تھے۔اُنہیں اُردو، عربی، فارسی، ترکی، پنجابی، مرہٹی وغیرہ زبانوں پر دسترس حاصل تھا۔شعروادب کے علاوہ فلسفہ، حکمت اور قرآن وحدیث کا اچھا مطالعہ تھا۔رنگین جب دلّی سے لکھنؤ تشریف لائے تو وہ عہد لکھنو کے عروج کا دور تھا۔ رنگین مزاجاً اسم بامسمیٰ تھے اور اسے مزید تقویت وہاں کے ماحول سے حاصل ہوئی۔ وہ شاعری میں خارجی پہلو کا بیان بڑی جزئیات کے ساتھ کرتے تھے۔صنف ریختی کی مقبولیت میں ان کا بہت اہم رول رہا ہے۔ رنگین مولانا روم سے بہت متاثر تھے اور یہی وجہ ہے کہ رنگین کے مجموعہ کلام میں حکیمانہ وصوفیانہ موضوعات پر جو کچھ لکھا گیا ہے اُس پر مولانا روم کی تحریروں کا اثر نظر آتا ہے۔ رنگین کے دوست احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا جس میں شاعر وادیب، نواب، طبیب، مولوی غرضیکہ مختلف پیشے سے وابستہ لوگ موجود تھے۔ رنگین ان تمام سے بڑی خندہ پیشانی سے ملا کرتے تھے۔رنگین کی غزلوں کا مرکز ومحور عشق تھا اور عشق کے بیان میں وہ کسی حد تک جاسکتے تھے۔انہیں طوائفوں سے بڑی قربت تھی۔انہوں نے اس طبقے کی بہت عمدہ جزئیات نگاری کی ہے۔ چند اشعار مثال کے طور پر دیکھیے :

حوروں کے عوض مجھے الٰہی　　دُنیا میں تو ایک نازنین دے
کب مجھ کو بہشت کی خواہش　　جو کچھ دینا ہے سو یہیں دے

مندرجہ بالا شاعروں کے علاوہ بھی لکھنؤ میں کثیر تعداد میں شاعر وادیب تھے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔لکھنؤ کی سرزمین بڑی زرخیز ہے۔قدیم سے لے کر جدید دور تک وہاں کے شاعر وادیب نے ادب میں اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا احساس دلایا ہے۔وہاں کی زبان، تہذیب وتمدن، لباس اور نشست کے آداب وغیرہ اسے منفرد اور ممتاز مقام عطا کرتے ہیں۔اس کی اپنی ایک ادبی تاریخ رہی ہے جس کے نگارخانے میں جرات، انشا، مصحفی، ناسخ، آتش، نسیم، میر حسن، میر ضمیر، میر خلیق، میر انیس، مرزا دبیر، ہادی رُسوا، چکبست، ثاقب، محشر، آرزو، اثر لکھنوی وغیرہ جیسے شعرا جگمگا رہے ہیں۔

14.6 خلاصہ

اُردو ادب میں دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ان دبستانوں نے اُردو ادب میں بیش بہا اضافے کیے ہیں۔لکھنؤ کی شاعری اپنے عہد اور ماحول کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ یہاں کے شعرا اور دلّی سے ہجرت کر کے آنے والے شاعروں کو بھی یہاں کے نوابین اور امرا کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہاں کے فرمانروا شجاع الدولہ، آصف الدولہ، غازی الدین حیدر اور واجد علی شاہ کھلے دماغ کے مالک تھے۔ان میں سے بیشتر کو فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی۔ غازی الدین حیدر خود بھی شاعری کرتے تھے اور واجد علی شاہ کی تو کئی کتابیں تھیں۔شاعروں کو انعامات واکرام سے سرفراز کرنا اور اُن کی قدر ومنزلت اُن کے مزاج کا خاصا تھا۔ دبستانِ لکھنؤ کی شاعری میں دیگر فنی خصوصیات کے علاوہ لفظی صنعت گری، تصنع وتکلف، صنعتوں کا استعمال، محبوب کے سراپے کا کھل کر بیان وغیرہ جیسی خصوصیات کثرت سے موجود تھیں۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جن سے دبستانِ لکھنؤ کی شاعری عبارت ہے۔ دبستان لکھنؤ میں صنف ریختی کو بھی خوب فروغ حاصل ہوا۔لکھنؤ کے مشہور شعرا میں ناسخ کا نام اہمیت کا حامل ہے۔اُنہوں نے مرزا مظہر جان جاناں کے ساتھ اصلاح زبان کی تحریک چلائی۔اُنہوں نے زبان کی صفائی پر زور دیا۔ ہندی اور سنسکرت کے الفاظ سے گریز کیا۔قواعد کے مطابق زبان میں درستگی، نئی نئی بندشیں اور تراکیب ایجاد کیں۔ دبستان لکھنؤ میں غزلوں کے ساتھ ساتھ مرثیے کو بھی خوب ترقی ملی۔انیس ودبیر نے مرثیہ نگاری کو اوج ثریا تک پہنچایا۔

لکھنؤ کے اہم شاعروں میں جرات، انشا، مصحفی، ناسخ، آتش، نسیم، شوق، رنگین، رشک وغیرہ شامل ہیں۔ ان شعرا کی غزلوں میں دبستانِ لکھنؤ کی شعری خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہے جسے اُردو ادب میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

14.7 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

1۔ دبستانِ لکھنؤ کا سماجی و تہذیبی پس منظر بیان کیجیے۔

2۔ دبستانِ لکھنؤ کی شعری خصوصیات کیا ہیں؟ مثالوں سے سمجھائیے۔

3۔ خواجہ حیدر علی آتش کی شاعری سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

1۔ دبستانِ لکھنؤ کے نسبتاً کم معروف شعرا کا تعارف کرائیے۔

2۔ مصحفی اور اُن کی شاعری کے بارے میں ایک نوٹ تحریر کیجیے۔

3۔ انشاء اللہ خاں انشا کی شعری خصوصیات بیان کیجیے۔

14.8 فرہنگ

الفاظ	معنی
ریختی	وہ نظم جو عورتوں کی زبان میں کہی جائے
فحش	بیہودہ باتیں
ترجیح	فوقیت، برتری
اسم بامسمیٰ	جیسا نام ویسا ہی عمل
صنعت	شاعری کی اصطلاح، مراد فنکاری و کاریگری، پیشہ، ہنر
وسیلہ	ذریعہ
انتشار	گھبراہٹ، تتر بتر ہونا، پریشانی، فکر
مسلمہ	تسلیم شدہ، مانی ہوئی بات
مرہون منت	احسان مند، شکر گزار
موقر	توقیر والا، عزت والا
جزئیات	تفصیل، معمولی سے معمولی بات کی وضاحت
طبع زاد	اپنی ایجاد، اختراع
سعی	کوشش
صناع	کاری گری

14.9 سفارش کردہ کتابیں

1۔	کشاف تنقیدی اصطلاحات	ابوالاعجاز حفیظ صدیقی
2۔	لکھنؤ کا دبستانِ شاعری	ابواللیث صدیقی
3۔	ولی سے آتش تک (کلاسیکی شعر اپر تنقیدی مضامین، جلد اول)	ایم حبیب خاں
4۔	تاریخ ادب اُردو (جلد دوم، حصہ دوم)	جمیل جالبی
5۔	قلندر بخش جرات	جمیل جالبی
6۔	اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین
7۔	لکھنؤ کے شعر و ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر	سید عبدالباری
8۔	اُردو زبان و قواعد	شفیع احمد صدیقی

اکائی 15 شمالی ہند میں اُردو نثر کا ارتقا فورٹ ولیم کالج سے قبل

اکائی کے اجزا

15.0 مقصد

15.1 تمہید

15.2 شمالی ہند میں اُردو نثر کا ارتقا فورٹ ولیم کالج سے قبل

15.3 اٹھارہویں صدی کی اہم نثری تصانیف

15.3.1 کربل کتھا

15.3.2 قصۂ مہر افروز و دلبر

15.3.3 نوطرز مرصع

15.3.4 نوآئین ہندی

15.3.5 عجائب القصص

15.4 متن برائے مطالعہ

15.5 خلاصہ

15.6 نمونۂ امتحانی سوالات

15.7 فرہنگ

15.8 سفارش کردہ کتابیں

15.0 مقاصد

زیرِ نظر اکائی شمالی ہند میں اُردو نثر کا ارتقا فورٹ ولیم کالج سے قبل سے متعلق لکھی گئی ہے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ نظم و نثر کی تعریف و تفہیم کر سکیں۔

☆ اُردو نثر کے ابتدائی نقوش کی وضاحت کر سکیں۔

☆ فضل علی فضلی کی ''کربل کتھا'' سے متعلق سمجھا سکیں۔

☆ قصۂ مہر افروز ودلبر اور نواب عیسوی خاں کے بارے میں معلومات فراہم کرسکیں۔

☆ نوطرز مرصع کی موضوعاتی وفنی خصوصیات پر روشنی ڈال سکیں۔

☆ نوآئینِ ہندی اور عجائب القصص کی تفصیل سے واقف کرا سکیں۔

15.1 تمہید

اُردو زبان و ادب میں نثر اور نظم کا مفہوم بہت وسیع معنوں میں لیا جاتا ہے۔نظم سے مراد تمام شعری اصناف ہیں اور نظم ازخود ایک مقبول صنف سخن ہے۔ اور اسی طرح ہم نثری ادب سے مراد اُن اصناف کو لیتے ہیں جو شعری نہ ہوں۔نثری ادب کی دو شاخیں ہوتی ہیں۔ افسانوی ادب اور غیر افسانوی ادب۔ افسانوی ادب سے مراد وہ اصناف ہیں جن کی بنیاد قصے کہانیوں پر مبنی ہوتی ہیں اور ان کہانیوں میں تصوراتی اور تخیلاتی عناصر کی آمیزش ہوتی ہے۔ یہ دراصل تخلیقی ادب ہوتا ہے۔ غیر افسانوی ادب کا تعلق انسان کے ذاتی تجربات ومشاہدات سے ہوتا ہے جسے وہ ادبی پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ مثلاً سفرنامے' خودنوشت' خاکے' رپورتاژ وغیرہ۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ ہر صنف کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور انہیں تقاضوں کے پیش نظر ادب میں اس صنف کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ نیز اس کا تعین قدر کیا جاتا ہے۔ یہاں اس موضوع پر آپ کو معلومات فراہم کرنا مقصود ہے کہ شمالی ہند میں اُردو نثر کا ارتقا کس طرح ہوا۔ مزید یہ کہ اس دور میں کون کون سے مصنف تھے اور ان کی کون کون سی تصنیفات سامنے آئیں۔

15.2 شمالی ہند میں اُردو نثر کا ارتقا فورٹ ولیم کالج سے قبل

فورٹ ولیم کالج سے قبل اُردو زبان نوخیز تھی۔شمالی ہند میں نثری ادب کی صورت گری ہورہی تھی۔ اس میں عربی اور فارسی زبان کے الفاظ کی آمیزش کثرت سے تھی۔ اس صورتحال میں اُردو دوسری زبانوں سے دامن بچاتے ہوئے نکھرنے سنورنے اور اپنی منفرد شناخت قائم کرنے کی جدوجہد کررہی تھی۔ اُردو کے ترقی پسند ناقد سید احتشام حسین اپنی مایہ ناز کتاب ''اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' میں اُردو کے ابتدائی دور کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''لسانیات کے علما نے دلّی کے آس پاس کی اُردو زبان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ بول چال کے لیے یہ زبان ایک ترقی پذیر شکل میں بہت دنوں سے رائج تھی اور آپس کے تعلقات میں بہت سی ایسی کہاوتیں' ایسے محاورے اور جملے پیدا ہوگئے تھے جو عوام سے اس کے تعلق کا پتہ دیتے ہیں۔'' (ص۔78)

اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں صنف داستان کی مضبوط و مستحکم بنیاد رکھی گئی اور نثری تصنیفات کی مختلف النوع قسم کی تحریریں سامنے آئیں۔ دیباچے' اُردو شاعروں سے متعلق تذکرے' لغات اور ترجمے وغیرہ اُردو نثر کی ابتدائی شکل میں موجود ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ اُردو کا ابتدائی دور تھا جسے اُردو زبان کہا جارہا تھا' اسی آدھی ادھوری زبان میں شاعری کی باقاعدہ ابتدا ہوچکی تھی اور نثر کی شمع نے بھی روشنی دینی شروع کردی تھی۔ جعفر زٹلی جو اس عہد کا بہت ہی معروف شاعر تھا' وہ اپنی مزاحیہ شاعری اور پھکڑ پن کے لیے جانا جاتا ہے۔ اُس کے یہاں نثر کے بھی نمونے ملتے ہیں۔ یہ نثری تحریریں باضابطہ طور پر نہیں ہیں بلکہ ٹکڑوں کی شکل میں ملتی ہیں جن سے اُس عہد کی سیاسی اور معاشی حالات کا پتہ چلتا ہے۔

اٹھارہویں صدی میں اُردو نثر میں بہترین اضافہ ہوا ہے۔ یہ میرؔ وسوداؔ کا دور تھا جسے اُردو شاعری کا عہد زریں کہا جاتا ہے۔ اس وقت اُردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر خواجہ میر دردؔ اور ان کے برادر خورد خواجہ میر اثرؔ بھی موجود تھے۔ میر سوز' انشا' مصحفی' نظیر اکبرآبادی' میر حسن وغیرہ جیسے مایہ ناز شعرا بھی شاعری میں کمالات دِکھا رہے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ لوگ بحیثیت شاعر اپنی شناخت رکھتے تھے۔ یہ نثر نگار نہیں تھے۔ البتہ اس زمانے میں نثر کا ایک بہترین نمونہ سودا کے دیباچے کی شکل میں منظر عام پر آتا ہے جس سے اس عہد اور وہاں کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ مرزا محمد رفیع سوداؔ گرچہ اُردو قصیدے

کے صف اول کے شاعر مانے جاتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اُنہوں نے قصیدے کے فن کو اوج ثریا تک پہنچایا ہے۔ اُنہوں نے ہجو یہ قصیدے لکھ کر ایک نئی طرح کی بنیاد ڈالی۔ سودا نے غزلیں بھی خاصی تعداد میں کہی ہیں۔ مثنویاں بھی لکھی ہیں اور مرثیے لکھ کر بھی اُردو ادب میں بہترین اضافہ کیا ہے۔ اُنہوں نے جب مرثیوں کو مرتب کیا تو اس پر ایک مبسوط دیباچہ بھی تحریر کیا جو کئی بار مجموعے کے ساتھ شائع ہوا۔ اس نثری نگارش کی عبارت مقفیٰ و مسجع ہے۔ سودا نے میر تقی میر کی مثنوی ''شعلہ عشق'' کو نثری پیکر عطا کیا۔ لیکن اب یہ نثری کارنامہ دستیاب نہیں ہے۔ تذکرے اور تاریخ کی کتابوں میں محض ذکر ملتا ہے۔ سودا کے معاصر ناخدائے سخن میر تقی میر جو اُردو غزل کے بے تاج بادشاہ کہلاتے ہیں۔ انہوں نے بھی نثری کارنامے انجام دیے ہیں۔ میرؔ نے نکات الشعرا لکھ کر اُردو شاعروں کی یادوں کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ اس میں شاعروں سے متعلق معلومات فراہم کر کے اُردو ادب کو بیش قیمت تحفہ عطا کیا ہے لیکن اس تذکرے کی زبان فارسی ہے۔ اُردو ادب میں ترجمے کے ذریعے بھی غیر معمولی اضافے ہوئے ہیں۔ ترجمہ بنیادی طور پر ایک زبان کے مواد کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کو کہتے ہیں۔ ترجمے کے ذریعے دوسری زبانوں کے ادب اور اس کی باریکیوں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ دونوں اپنے وقت کے عالم دین تھے اور اسلام کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ ان کے والد متقی' پرہیز گار' صوفی بزرگ تھے۔ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر دونوں ہی اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان کے کام کو آگے بڑھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مذہب کی تبلیغ میں خاص حلقے یا طبقے کی کوئی قید نہیں ہوتی ہے بلکہ اس معاملے میں عوام وخواص ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں سے تبادلۂ خیال کا بہترین ذریعہ آسان اور عام فہم زبان اُردو تھی۔ اُردو زبان کی توسیع وترویج میں صوفیائے کرام کا بھی حصہ رہا ہے۔ اس دور میں بھی مذہبی نوعیت کی کتابیں لکھی گئیں مگر وہ وقت کے ہاتھوں تلف ہو گئیں۔

تصوف اور ترجمے کے حوالے سے ایک اہم نام معین الدین حسین علی کا ہے جنہوں نے فارسی تصنیف کو اُردو میں منتقل کیا۔ جمیل جالبی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''1760-61ء میں معین الدین حسین علی نے تصوف کی فارسی کتاب جامِ جہاں نما کو اپنے الفاظ میں اُردو نثر میں لکھا جس میں تصوف کے دقیق نکات کو آسان زبان میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔''

اسی تسلسل میں مزید فرماتے ہیں کہ جامِ جہاں نما میں دراصل تصوف کے مسائل پر بات کی گئی ہے۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور کی نثر میں غور وفکر کے ساتھ تصوف جیسے سنجیدہ موضوع پر نہ صرف گفتگو کی جا رہی تھی بلکہ رقم طرازی بھی کی جا رہی تھی۔ شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی بھی ایک مترجم کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ اُنہوں نے ''عم پارہ'' کی تفسیر خدائی نعمت کے عنوان سے کیا ہے۔ اس کی اشاعت کئی بار عمل میں آئی اور ''تفسیر مرادیہ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ شاہ مراد اللہ کی یہ تفسیر بڑی ہی سلیس اور رواں زبان میں ہے۔ دراصل ان کا مقصد کم پڑھے لکھے لوگوں اور گھریلو خواتین کو بھی اس سے واقف کرانا تھا۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں رستم علی بجنوری نے ''قصہ واحوال روہیلہ'' کے عنوان سے تاریخ لکھی جس میں 1730ء سے لے کر 1755ء تک رونما ہونے والے روح فرسا واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ اٹھارہویں صدی کی تیسری چوتھی دہائی میں دلّی اُجڑ سی گئی تھی۔ مغل حکومت کی جو بنیاد بابر کے زمانے میں رکھی گئی تھی وہ اورنگ زیب کے دور حکومت تک مزید مستحکم ہوتی رہی لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس میں وہ پائیداری نہ رہی۔ ایک عجیب سی کشمکش کے ساتھ زندگی گزر رہی تھی۔ سچ پوچھیے تو نہ پہلے جیسی دلّی تھی اور نہ داد دینے کا ماحول باقی تھا۔ مورخوں نے ان تمام حالات و واقعات کو کتابوں میں محفوظ کر دیا ہے۔ تاہم رستم علی بجنوری نے روہیلہ کی جو تاریخ رقم کی ہے' اُس میں تمام واقعات کے ساتھ ساتھ انسان کی داخلی کیفیات کو بھی پیش کیا ہے۔ یہ تاریخ دراصل بہت ہی آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ نیز واقعات کو ترتیب وار اور پر اثر بنانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ ''قصہ واحوال

روہیلہ'' میں رستم علی نے انگریزی الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے۔

شمالی ہند میں پہلی باقاعدہ نثری کتاب واقعات کربلا کے بیان پر مشتمل ''کربل کتھا'' ہے۔ یہ فضلی کی تصنیف ہے (جس پر تفصیل سے آگے گفتگو کی جائے گی۔)

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر تک شمالی ہند میں نثری ادب کے فروغ میں دیباچے' تاریخ اور ترجمے نے بہت اہم کردار نبھایا ہے۔ اُردو کی قدیم نثری صنف داستان ہے۔ داستان نویسی کا باقاعدہ آغاز 1635ء میں وجہی کی تصنیف ''سب رس'' سے ہوتا ہے۔ وجہی دکن کا رہنے والا تھا۔ وہ قطب شاہی عہد کا بہت ہی مشہور شاعر و ادیب تھا۔ دربار سے اُس کی گہری وابستگی تھی۔ اور یہیں اس نے عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر یہ داستان قلم بند کی۔ دکن میں داستان نگاری کی ایک صدی سے زیادہ کا وقفہ گزر جانے کے بعد عطا حسین تحسین نے ''نوطرز مرصع'' کے عنوان سے ایک داستان لکھی۔ ''قصہ مہر افروز دلبر'' کے عنوان سے عیسوی خاں بہادر نے داستان لکھی۔ مہر چند کھتری نے ''نوآئین ہندی'' اور شاہ عالم ثانی نے ''عجائب القصص'' لکھ کر داستان نگاری کی صحت مند روایت کی بنا ڈالی۔ ان تمام داستانوں سے متعلق مزید معلومات فراہم کی جائے گی۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے:

1۔ ''اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' کے مصنف کا نام بتایئے۔

2۔ ''نکات الشعرا'' کس زبان میں لکھی گئی ہے؟

3۔ وجہی نے کس کی فرمائش پر ''سب رس'' قلم بند کی؟

15.3 اٹھارہویں صدی کی اہم نثری تصانیف

15.3.1 کربل کتھا

اُردو نثر کے ابتدائی دور کے مصنفین میں فضل علی فضلی کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ فضلی سے متعلق معلومات تاریخ و تذکرے کی کتابوں میں کم ہی ملتی ہے۔ یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ فضلی 1710ء میں پیدا ہوئے ہوں گے اس لیے کہ وہ 1750ء میں حیات تھے۔ اس کے بعد کے حالات کا پتہ نہیں چلتا۔ فضلی کی ترجمہ شدہ تصنیف ''کربل کتھا'' میں چیدہ چیدہ دکنی زبان کے الفاظ اور محاورے ملتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود محققین کی رائے ہے کہ وہ شمال کے رہنے والے تھے۔ فضلی فارسی زبان کے اچھے واقف کار تھے۔ کربل کتھا میں فارسی کے اشعار' الفاظ اور عربی زبان میں عبارتیں ملتی ہیں۔ اس کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔ اول اس زمانے میں اُردو' فارسی آمیز ہوتی تھی۔ دوم اس تصنیف کا پس منظر مذہبی نوعیت کا ہے۔

ملا حسین واعظ کاشفی ایران کا رہنے والا تھا۔ اس کی مادری زبان فارسی تھی اور فارسی میں ہی اُنہوں نے روضۃ الشہدا رقم کی جو تاریخی و مذہبی نوعیت کی کتاب ہے۔ اسے محرم کے مہینے میں پڑھا جاتا تھا۔ روضۃ الشہدا میں حضرت امام حسین کی شہادت کا بیان بہت ہی پر درد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ تاہم فارسی ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کے لیے اس کا سمجھنا آسان نہ تھا۔ فضلی نے اسے اُردو زبان میں منتقل کر کے کارِ نیک کیا ہے اور اس کا نام کربل کتھا رکھا۔ کربل سے مراد کربلا اور کتھا کا مطلب کہانی ہے۔ یعنی کربلا کی کہانی۔ کربل کتھا میں مقدمہ' دیباچہ' بارہ مجلس اور خاتمہ کی پانچ فصلیں ہیں۔

پہلی مجلس میں حضور نبی کریم' ان کی عزیز از جان صاحبزادی حضرت فاطمہ اور دونوں نواسوں حضرت امام حسین اور حسن کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ان سب کی محبت اٹوٹ تھی۔ مصنف نے اسے تمہیدی انداز سے پیش کیا ہے تاکہ پڑھنے والے کا ذہن پوری طرح سے تیار ہوجائے۔ دوسری مجلس میں نبی کریم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ' ان کے خاوند حضرت علی اور ان کے بیٹے حضرت حسن اور حسین کی قربت اور ان کی آپسی محبت کا ذکر کیا گیا ہے۔ کربل کتھا کے اس دوسری مجلس میں حسن اور حسین کے کردار کو اُبھارا گیا ہے۔ حضرت فاطمہ کی وفات کا بیان انتہائی درد آمیز انداز میں موجود ہے۔ ابتدا اس

شعر سے ہوئی ہے کہ:

یہ دوسری مجلس ہے سو اس میں سر بہ سر
خیر النسا کے مرنے کا، یاروں حوال ہے

اس مجلس میں حضرت فاطمہ کی خوبیوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ حضرت فاطمہ کو اپنے شوہر حضرت علی سے بہت محبت تھی۔ وہ ان کا بہت احترام کرتی تھیں۔ حسن اور حسین سے محبت اور اُن کے تئیں فکر کو بھی اُبھارا گیا ہے۔ تیسری مجلس میں حضرت علیؑ چوتھی مجلس میں حضرت حسن اور پانچویں میں حضرت مسلم بن عقیل کی شہادت اور وصال کا بیان ہے۔ چھٹی مجلس کربل کتھا کا بہت ہی پراثر حصہ ہے۔ اس میں حضرت مسلم بن عقیل کے دو فرزند حضرت محمد اور ابراہیم کی شہادت کا بیان پیش کیا گیا ہے۔ حضرت مسلم کے ان دونوں فرزندان کے سر قلم کر کے دریائے فرات میں بہا دیے گئے تھے۔ کربل کتھا کا یہ حصہ بہت اہم ہے۔ ساتویں مجلس میں حضرت امام حسین اور حضرت حُر کی آپسی محبت کو پیش کیا گیا ہے۔ مجلس کے اس حصے میں حُر کی شجاعت، امام حسین سے وفاداری کا بیان ملتا ہے۔ اس مجلس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

یہ مجلس ہے گی ساتویں، تس میں حسین کا
کعبے سے کوفے کوں سفر اور حُر کا حال ہے

آٹھویں مجلس میں حضرت امام قاسم کی شہادت کا بیان ہے۔ کربل کتھا کا یہ حصہ اس لیے بھی بہت پُر اثر اور دردناک ہو گیا ہے کہ حضرت قاسم کا اُسی دن عقد ہوتا ہے اور اسی دن وہ شہید ہو جاتے ہیں۔ یہ سانحہ کوئی اتفاقیہ نہیں ہوا تھا۔ بلکہ یہ حضرت قاسمؑ امام حسین اور نئی نویلی دُلہن وغیرہ سبھوں کو معلوم تھا۔ اُردو مرثیہ گوئیوں نے واقعات کربلا کے اس دن کے منظر پر بہت لکھا ہے۔ نویں اور دسویں مجالس میں بھی حضرت علی اکبر امام حسین کی شہادت کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ گیارہویں مجلس میں شیر خوار علی اصغر کی شہادت کا بیان ہے۔ علی اصغر معصوم چھوٹے بچے تھے۔ انہیں پیاس لگی تھی لیکن دُشمنوں نے تیر چلا دیا تھا جس سے وہ شہید ہو گئے۔ بارہویں مجلس آخری مجلس ہے جس میں حضرت امام حسین کی شہادت کا بیان انتہائی پردرد انداز میں کیا گیا ہے۔ اس شہادت کے ساتھ ہی واقعات کربلا تاریخ کا ایک باب بن جاتا ہے جو آج تک لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں محفوظ ہے۔ اس حصے کا آخری باب بہت ہی روح فرسا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''اے شمر! جانتا ہے کہ آج کون دن ہے؟ کہا؛ جمعہ اور روزِ عاشورا۔ پھر فرمائے؛ پہچانتا ہے کہ کون سی ساعت ہے؟ کہا؛ وقت خطبہ اور نماز پڑھنے کا۔ فرمائے کہ اِس وقت خطیب میرے دادا کی اُمّت کے منبروں پر خطبے پڑھتے اور نعت میرے دادا کی کہتے اور توں مجھ پر ایسا ظلم کرتا؟ رسولِ خدا نے منھ اپنا میری چھاتی پر رکھا اور توں اِس طرح میری چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ وہ بوسے میرے حلق پر دیا اور توں شمشیر یہاں چلاتا۔ میں روحِ زکریا نبی اپنے داہنے طرف اور روحِ یحییٰ بائیں طرف اپنے دیکھتا اور توں میری چھاتی پر چڑھا۔ اے شمر! وقتِ نماز ہے۔ اُٹھ میری چھاتی سے کہ منھ طرف قبلہ کے کروں اور دو رکعت نماز پڑھوں کہ مجھ کوں نماز میں شہید ہونا باپ سے میراث ہے۔ جب کہ میں نماز میں ہوں، جو چاہے سو کر، آہ! تب شمرِ لعین سینۂ بے کینۂ امام پر سے اُٹھا اور حضرت اتنی طاقت رکھتے تھے کہ منھ قبلہ طرف کر کے نماز میں مشغول ہوئے۔ واویلا، شمرِ ملعون روسیاہ صبر نہ کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (کربل کتھا۔ص 85-84)

بارہ مجلسوں کے بعد پانچ فصلیں ہیں۔ اُن میں واقعات کربلا کے بعد کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔

کربل کتھا کی اہمیت ہر دور میں رہی ہے۔ فضلی نے روضۃ الشہدا سے ترجمہ کر کے اسے حیات جاودانی عطا کی۔ جب یہ تصنیف معرض وجود میں

آئی اس وقت یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی۔ البتہ رفتہ رفتہ مرثیے کی شکل میں اس واقعے کو جزئیات کے ساتھ پیش کیا گیا۔

15.3.2 قصہ مہر افروز و دلبر

قصہ مہر افروز ودلبر اُردو کی قدیم داستان ہے۔ اس کے مصنف نواب عیسوی خاں ہیں۔ وہ ہندی زبان میں بھی لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے ''بہاری ست سئی'' کے دوہوں کی شرح ''رس چندرکا'' کے عنوان سے لکھی۔ قصہ مہر افروز دلبر میں بھی عربی فارسی سے زیادہ سنسکرت الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ پوری داستان پر دیومالائی اثرات ملتے ہیں۔ یعنی اس میں ہندوستانی تہذیبی عناصر پر مبنی متعدد کہانیاں اور ذیلی قصے موجود ہیں۔ مسعود حسین خاں کا خیال ہے کہ ''یہ قدما کی زبان کا پہلا ہیولیٰ یا زبان دہلی کا پہلا ادبی نقش ہے' جس پر ایک طرف ہندی شاعری کی چھاپ ملتی ہے' دوسری طرف فارسی داستانوں کے جملوں کا دروبست پایا جاتا ہے۔'' (قصہ مہر افروز ودلبر ص۔22)

مجموعی طور پر اس داستان کی زبان سادہ' سلیس اور عام فہم ہے۔ کہانی دلچسپ اور تجسس سے بھرپور ہے۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو کسی بھی کہانی کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی ہے کہ وہ اپنے قارئین کو اس کی مجموعی فضا میں محو کردے۔ قصہ مہر افروز ودلبر میں قدیم مثنویوں کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔ لیکن بنیادی طور پر یہ ایک طبع زاد داستان ہے۔ کرداروں کی بہتات اور مافوق الفطرت عناصر کے سہارے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ کہانی میں روایتی انداز سے ایک بادشاہ ہے جو لاولد ہے۔ اولاد کی محرومی کے سبب تخت و تاج سے کنارہ کشی اختیار کر کے فقیری کا روپ دھار لیتا ہے اور جنگل کو اپنا ٹھکانا بنالیتا ہے۔ لیکن خدا کا کرنا کچھ ایسا ہوا کہ ایک فقیر کی دعا سے اُس کے یہاں بیٹا پیدا ہوا۔ شہزادے کا نام مہر افروز رکھا گیا اور شاہانہ انداز سے اُس کی پرورش کی گئی اور پھر تربیت کا اہتمام کیا گیا۔ اُسی محل میں وزیر زادہ اندیش بھی رہتا ہے۔ یہ دونوں جنگل جاتے ہیں اور ایک خوبصورت جانور کا تعاقب کرتے ہیں مگر جانور اچانک نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے۔ اور یہ دونوں خود کو پریوں کے دیس میں پاتے ہیں۔ وہ ایک جادوئی دُنیا ہے۔ بقول مسعود حسین خاں ''سنگ مرمر کی چار دیواری' حکا کی' لاجوردی' طلائی کام دروازے پر' پانی کی چدّریں' نشیمنے' چبوترے اور بنگلے' غرض کہ کوہِ قاف میں پہنچ گیا۔'' (قصہ مہر افروز و دلبر۔ص19) مہر افروز وہاں پریوں کے بادشاہ کی بیٹی دلبر سے ملتا ہے اور اس پر عاشق ہوجاتا ہے۔ پھر یکے بعد دیگر کئی معرکے سر کرنے پڑتے ہیں۔ کئی ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں کہ عقل و دماغ ششدر رہ جائے۔ ایک لمبی جدوجہد کے بعد مہر افروز اور دلبر کی ملاقات ہوجاتی ہے۔ اور آخر کار دونوں کی مرادیں بر آتی ہیں۔ داستان کے اختتام پر مصنف نے غیر محسوس طریقے سے قصے سے مربوط کر کے ''نصیحت نامہ'' پیش کیا ہے۔ یہ نصیحت نامہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک ایک حصے میں بادشاہ اور وزیر اپنے اپنے فرزند کو نصیحتیں کرتے ہیں۔ پوری داستان میں چھ ضمنی کہانیاں ہیں۔ یہ داستان ادب میں ایک خاص مقام و مرتبے کی حامل ہے۔ اس کی وجہ شمالی ہندوستان کی قدیم داستان ہونے کے علاوہ اس کا اُردو ہندی زبان کے امتزاج کا بہترین نمونہ ہونا بھی ہے۔ مسعود حسین خاں اس داستان سے متعلق فرماتے ہیں:

> ''قصہ مہر افروز ودلبر کی ادبی حیثیت پلاٹ کی ندرت یا کردار نگاری سے زیادہ اس کے سادہ و ادبی اسلوب میں ہے۔ اُردو کے قدیم ادب میں اس سے زیادہ سہل اور سادہ عبارت نظم و نثر میں آج تک نہیں لکھی گئی۔'' (قصہ مہر افروز ودلبر۔ص20)

پوری داستان میں تجسس اور دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ قصہ مہر افروز ودلبر میں دلّی اور اس کے اطراف و اکناف کی تہذیب و معاشرت' وہاں کے آداب اور ماحول کی جھلکیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ ایک یادگار داستان ہے اور اُردو ادب کی تاریخ میں اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے:

1۔ ''کربل کتھا'' کے مصنف کا نام بتایئے۔

2۔ کیا ''قصہ مہر افروز ودلبر'' طبع زاد داستان ہے؟

3۔ کیا میرؔ و سوداؔ شاعر کے علاوہ نثر نگار بھی تھے؟

4۔ ''کربل کتھا'' میں کتنی مجلسوں کا ذکر ملتا ہے؟

15.3.3 نوطرز مرصع

نوطرز مرصع عطا حسین تحسین کی تصنیف ہے۔ یہ ایک فارسی داستان بعنوان ''قصہ چہار درویش'' کا اُردو ترجمہ ہے۔ نوطرز مرصع کا اصل نام ''انشائے نوطرز مرصع'' ہے۔ اس میں انشا پردازی اور تخیل کی آمیزش ملتی ہے۔ اُس میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش کم ہوتی چلی گئی۔ ایک زمانے تک قصہ چہار درویش کے مصنف امیر خسرو کہلاتے رہے لیکن کتاب کی داخلی شہادتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے بلکہ محمد معصوم اس کے مصنف ہیں۔

عطا حسین تحسین اٹاوہ کے رہنے والے تھے۔ وہ ایک انگریز جنرل اسمتھ کے میر منشی تھے۔ اُنہیں کے ساتھ تحسین نے کلکتے کا سفر بھی کیا۔ اسمتھ اپنے وطن کو لوٹ گیا اور تحسین پٹنہ ہوتے ہوئے فیض آباد پہنچے۔ وہ نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا اور اُن کی خوب طوطی بولتی تھی۔ تحسین کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اپنی تصنیف شجاع الدولہ کے حضور میں پیش کریں لیکن صد افسوس کہ کتاب کی تکمیل سے قبل شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا۔ تحسین نے اُن کے صاحبزادے آصف الدولہ کو اپنی یہ تصنیف پیش کر دی۔

نوطرز کی عبارت کو مرصع اور پر تکلف زبان' فارسی الفاظ کے کثرت استعمال اور صنعتوں کے افراط نے بوجھل بنا دیا ہے۔ کہیں کہیں تو مقفع و مسجع انداز کی عبارت بھی ملتی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ اٹھارہویں صدی میں زبان و ادب کی صورتحال کے پس منظر میں نوطرز مرصع کی زبان مشکل نہیں تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اُردو زبان نکھرتی چلی گئی۔ اِس داستان کی ابتدا پہلے لکھی گئی مثنویوں اور داستانوں کے انداز سے ہوتی ہے۔ ولایت روم کا بادشاہ فرخندہ سیر ہے اور وہ لاولد ہے۔ اولاد کے غم میں وہ سلطنت سے کنارہ کشی کر کے ایک گوشے میں پناہ لے لیتا ہے۔ اس کا وزیر خردمند ہے۔ وزیر نے بادشاہ کو بہت سمجھایا اور خدا پر بھروسہ رکھنے کی ترغیب دی۔ بادشاہ از سر نو سلطنت کی ذمہ داری نبھانے لگتا ہے اور راتوں کو عبادت اور مقابر کی زیارت میں گزارتا ہے۔ ایک رات اُس نے دیکھا کہ دور کہیں ایک چراغ ٹمٹا رہا ہے۔ بادشاہ اُس کا تعاقب کرنے لگا۔ کیا دیکھتا ہے کہ چار درویش آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ بادشاہ چھپ کر اُن کی باتیں سننے لگا۔ پہلے درویش نے اپنی کہانی سنائی جو ملک دمشق سے متعلق تھی۔ دوسرے درویش نے حاتم طائی کی سرگزشت اور ملکہ بصرہ اور شہزادہ نیم روز کا قصہ بیان کیا۔ اس کے بعد تیسرے درویش نے اپنا قصہ بیان کیا اور اتنے میں صبح ہو گئی۔ بادشاہ دربار میں واپس آ گیا اور یہاں اُس نے سبھی درویشوں کو بلایا تا کہ وہ چوتھے درویش سے قصہ سن سکے۔ بادشاہ نے بھی فرخ سیر اور خواجہ سگ پرست کا قصہ سنایا۔ اس دوران خوشخبری ملتی ہے کہ بادشاہ کے یہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کالے بادل کا ایک ٹکڑا آتا ہے اور شہزادے کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ دو دن بعد وہ شہزادہ واپس آتا ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح شروع ہو گیا۔ کافی وقت گزر جانے کے بعد بادشاہ نے چار درویشوں کے مشورے سے ایک خط شہزادے کے ساتھ بھیج دیا۔ اب جبکہ شہزادہ واپس آیا تو بادشاہ کے خط کے جواب میں جناب ملک شہپال بن شاہ رُخ نے اسے آنے کی دعوت دی۔ بادشاہ تین درویشوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔ اور وہاں سب کی مرادیں بر آئیں۔ مجموعی طور پر یہ داستان بھی دیگر داستانوں کی طرح خوشیوں پر ختم ہو جاتی ہے۔ بظاہر داستان میں ایک قصہ ہوتا ہے اور پھر قصے کے اندر کئی چھوٹے چھوٹے قصے ہوتے ہیں۔ یہاں اِس داستان میں پانچ قصے ہیں۔ چار درویشوں کے چار قصے اور ایک بادشاہ کی طرف سے سنایا گیا قصہ۔ مصنف کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے پانچوں قصوں میں ایک منطقی ربط پیدا کر دیا ہے اور اس کا تسلسل کچھ اِس طرح رکھا ہے کہ یہ بظاہر ایک ہی قصہ معلوم ہوتا ہے۔

15.3.4 نوآئینِ ہندی

نوآئینِ ہندی مہر چند کھتری مہر کی تصنیف ہے جو 1793ء میں تحریر کی گئی۔ دراصل مہر کسی انگریز کو اُردو زبان سکھانے پر معمور ہوئے تھے۔اُن کے ذہن میں یہ بات تھی کہ آسان اور عام فہم زبان میں کوئی ایسی کہانی تحریر کی جائے جس سے زبان سکھانے میں سہولت ہو۔ ان کے سامنے تحسین کی تصنیف نوطرز مرصع موجود تھی لیکن اس کی زبان انہیں مشکل لگی۔مہر چند کھتری آسان اور روزمرہ کی زبان میں لکھنا چاہتے تھے۔تاکہ تفہیم وترسیل کا مسئلہ پیش نہ آئے اور خاص و عام اس سے استفادہ کرسکیں۔مہر کھتری نے نوطرز مرصع کے انداز پر اپنی داستان کا نام نوآئینِ ہندی رکھا۔ یہ داستان ملک محمد اور گیتی افروز کے نام سے بھی مشہور ہے۔ ملک محمد کے اطراف پوری کہانی گھومتی نظر آتی ہے۔ داستان مختلف ہے لیکن دلچسپی سے پُر ہے۔مصنف نے واقعہ نگاری پر خصوصی توجہ مرکوز کی ہے۔

15.3.5 عجائب القصص

عجائب القصص شاہ عالم ثانی کی تصنیف ہے جو اٹھارہویں صدی کی آخری دہائی میں لکھی گئی۔ممتاز محقق ڈاکٹر جمیل جالبی اس کی تاریخ تصنیف 1792-93 بتاتے ہیں۔اس کی تصنیف کے وقت شاہ عالم ثانی نابینا تھے۔ عجائب القصص بہت طویل داستان ہے ۔ گیان چند جین ''اُردو کی نثری داستانیں'' میں لکھتے ہیں ''ایک نابینا شخص اتنی طویل داستان کا شیرازہ درست نہیں رکھ سکتا۔''

داستان کی ابتدا حمد' نعت' منقبت کے بعد اصل قصے سے ہوتی ہے۔ ملک ختن کے بادشاہ مظفر شاہ اور اُس کے وزیر کے یہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔فقیروں کی دعاؤں سے دونوں کے یہاں لڑکے تولد ہوئے۔ اسی طرح روم کے بادشاہ اور اس کے وزیر کے یہاں بھی درویشوں کی دعاؤں سے لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ بادشاہ مظفر شاہ کا فرزند شجاع التمش خواب میں روم کے بادشاہ کی بیٹی مہر نگار کو دیکھتا ہے اور اس پر فریفتہ ہوجاتا ہے۔مظفر شاہ اپنے بیٹے کے لیے مہر نگار سے شادی کا پیغام بھیجتا ہے۔ ابتدا میں مہر نگار شادی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن بعد میں وہ بھی شجاع التمش کو خواب میں دیکھ کر دل دے بیٹھتی ہے۔کافی مشکلوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنے کے بعد دونوں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔

شاہ عالم ثانی کی تصنیف عجائب القصص جب منظر عام پر آئی تو اُس وقت اُردو زبان' عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ کی گرفت سے قدرے باہر آچکی تھی۔ اس دور کی اُردو میں سلاست اور روانی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ عجائب القصص بھی زبان کی اِنہیں خصوصیات سے مملو دکھائی دیتی ہے۔ رواں زبان کے علاوہ اس زمانے کے رسوم و رواج' عقائد' تہذیب' آداب واطوار کا عکس بھی اِس میں دکھائی دیتا ہے۔ بقول جمیل جالبی ''عجائب القصص اُردو نثر کی تاریخ کی وہ کڑی ہے جس نے فورٹ ولیم کالج سے پہلے اس کے سفر مستقبل کا رُخ متعین کر دیا۔'' (تاریخ ادب اُردو' جلد دوم' حصہ دوم' ص996)

شمالی ہند میں اِس دور کی آخری تصنیف شاہ حسین حقیقت کی ''جذب عشق'' کی شکل میں سامنے آتی ہے جسے اُنہوں نے فارسی سے اُردو میں 1796-97ء میں منتقل کیا ہے۔ یہ ایک عشقیہ داستان ہے ۔اس داستان کی مقبولیت کم ہے اس لیے کہ یہ زبان و بیان کے اعتبار سے ایک کمزور داستان تصور کی جاتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے:

1۔ ''نوطرز مرصع'' کس تصنیف کا ترجمہ ہے؟

2۔ ''نوآئینِ ہندی'' کس سنہ میں تحریر کی گئی؟

3۔ بادشاہ مظفر شاہ کس ملک کا رہنے والا تھا؟

4۔ شاہ عالم ثانی کی تحریر کردہ کسی ایک تصنیف کا نام بتایئے۔

15.4 متن برائے مطالعہ (نمونۂ متن)

کربل کتھا

آہِ دردناک بھر زارزار رو کہا؛ اے جانِ حسین! اپنے باپ کی وصیّت پر عمل کرے گا اور مجھ لیے مَرے گا۔ پس مجھے بھی تیرے حق میں ایک وصیّت کی ہے چاہیے کہ میں بھی بجالاؤں۔ پھر ہاتھ قاسم کا پکڑ، خیمہ میں سِدھار؛ قاسم کی ماں کوں فرمائے؛ پوشاکِ نو قاسم کو پنھاؤ اور اپنی بہن زینب کوں فرمائے؛ جامہ دانی بھائی حسن کی لاؤ؛ اُس میں سے جامہ قیمتی بھائی حسن کا نکال قاسم حسن کوں پنھائے اور چیرا اپنے ہاتھ سے اُس سر پر باندھا اپنے بھائیوں عون وعباس کوں بُلائے۔ پھر وہ بیٹی اپنی کہ نام زدِ قاسم تھی؛ اس سے نکاح باندھے فرمائے؛ اے قاسم! یہ امانت تیرے باپ کی ہے؛ وہ آج لگ مجھ پاس تھی؛ اب لے۔ یہ کہہ ہاتھ اُس کا قاسم کے ہاتھ دے باہر سِدھارے۔

قاسم ہاتھ دلھن کا پکڑ منھ اُس کا دیکھتا تھا کہ لشکرِ عمرِ سعد سے آواز آئی؛ اے حُسین! کوئی اور رہا ہے تو میدان میں بھیج۔ جوں وہ آواز قاسم کے کان پہنچی؛ ہاتھ دلھن کا چھوڑ؛ چاہا کہ باہر جاوے؛ دلھن نے دامن پکڑ کہا؛ اے قاسم! کیا خیال رکھتا اور کہاں جاتا؟ قاسم نے کہا؛ اے نورِ دیدہ! قصدِ میدان رکھتا۔ دامن چھوڑ کہ تیری دُلھنی اور میری دامادی قیامت پر پڑی۔ پھر دلھن کہی؛ عجب بات فرماتے کہ دُلھنی تیری اور دامادی میری قیامت پر پڑی۔ پس فرد اے قیامت تمھیں کہاں پاؤں اور کس نشان سے پہچانوں؟ قاسم اپنی آستین پھاڑ کہا؛ اِس نشان سے؛ مجھے میرے باپ اور اپنے دادا پاس ڈھونڈیو۔

قصہ مہر افروز و دلبر

بادشاہ کیں ایک وزیر تھا؛ تِس کا نانو تھا جہاں دانش۔ تِس کا ایک بیٹا تھا کہ نیک اندیش اُس کا نانو تھا۔ سو اُس میں اور بادشاہزادے میں بہت اخلاص تھا؛ اور ہمیشہ وہ ساتھ ہی رہتے تھے؛ ایک روز ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ بادشاہزادہ و وزیرزادہ شکار میں اکیلے ہوجاتے ہیں تو ان کے تائیں جانور درخت کے اوپر ایک خوش رنگ بولتا ہوا نظر پڑا کہ ایک ایک پَر کا رنگ اُس کے ہزاروں پرمور کے کوں کِشت دیتا تھا اور آواز اُس کی کوں بلبل کی مثال دیجے؛ تو بلبل تو ہزار داستان ہوتی ہے؛ پر اس کی ایک ایک داستان ہزار ہزار داستان تھیں؛ اور جو اُسے سُرود کہیے تو سُرود ایک سوز رکھتا ہے۔ اُس کی ایک ایک آواز ہزاروں سوز رکھتی تھی۔ شاہزادے کوں دل و جان سے آواز؛ رنگ اُس کا خوش آیا۔ تماشے کے واسطے نزدیک اُس کے گیا۔ وہ جانور وہاں سے اُڑ کر اور جگہ جائے بیٹھا۔ بادشاہزادہ اور اُس کے پیچھیں جاتا ہے۔ از بسکہ بادشاہزادہ محو جو ہوگیا تھا؛

نوطرزِ مُرصّع

آہ حسرت مرے دل کی نہیں برآتی ہے
مفت باتوں میں مری عمر چلی جاتی ہے
قطع اُمید ہے اور یاس نظر آتی ہے
ہائے یہ زندگی کیا کیا مجھے دکھلاتی ہے
اس مصیبت کا بیاں کیجیے کس سے افسوس
درد اس دل کا عیاں کیجیے کس سے افسوس

یہ کہتا خراماں خراماں مضطر و متفکر خفگی طبیعت کی سے سب کار پرداز ان کارگاہِ خلافت کے تئیں؛ جواب مجرے کا فرماکے؛ قدم فراں روائی و جہانداری کا بیچ دامن قناعت کے کھینچ کر ایک گوشہ میں تنہا جا بیٹھا اور ساری حلاوت و مزہ زندگانی کے سے تلخ کام ہو کے ارشاد فرمایا کہ ہرگز کوئی خویش

وبیگانہ سے سوائے خادمانِ درگاہ کے بیچ خلوت سرائے بادشاہی کے باریاب نہ ہواور اضطراب شدتِ رقّتِ طبع کے سے مجنون دل' اندوہ منزل' اُس کے کا بیچ خیال جمال لیلیٰ کامرانی کے پڑھنے' اس بند مخمس کے سے مشتغل تھا ۔

یاالٰہی میں کہوں کس سیتی اپنا احوال
تجھ سوا کون ہے' جس سے میں کہوں دل کا ملال
یارب اس رنج سے اب اس دل شیدا کوں نکال
تیری ہی ذات سے رکھتا ہوں میں ہردم یہ خیال
ساز آباد خدایا دل ِ ویرانہ را

15.5 خلاصہ

اٹھارہویں صدی کے نثری کارناموں کے محاسبے کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس صدی میں نثر کے مختلف نمونے ملتے ہیں اور مختلف النوع قسم کے اسالیب بھی ملتے ہیں ۔اُردو ادب کی تاریخ میں اٹھارہویں صدی بنیادی طور پر شعری اصناف کے لیے جانی جاتی ہے۔ میر' سودا' درد' سوز' انشا' میر حسن وغیرہ ایسے متعدد شاعر ہیں جو اس صدی میں موجود تھے۔لیکن ان میں سے بعض ایسے شاعر ہیں جو نثری کارناموں کے حوالے سے بھی یاد کیے جاتے ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں نثر کے حوالے سے جعفر زٹلی کا نام سرفہرست ہے جن کے نثری نمونوں کے مطالعے سے اس وقت کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ سودا نے بھی مرثیوں کو یکجا کر کے دیباچے کے ساتھ شائع کیا۔ یہ دیباچہ خود ایک عمدہ نثری نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ میر تقی میر نے بھی اُردو شاعروں کے تذکرے لکھے۔اس کی کافی اہمیت ہے لیکن یہ تذکرہ فارسی زبان میں ہے۔اس کے علاوہ ترجمے کے توسط سے بھی نثر میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے قران کے تراجم کیے۔ ادبی نوعیت کی کتابوں میں فضلی کی ''کربل کتھا'' تحسین کی ''نوطرز مرصع'' جیسی نادر تصانیف ترجمے ہی کی مرہون منت ہیں۔ قصہ مہر افروز و دلبر عیسوی خاں بہادر کی داستان ہے۔ اسے شمالی ہند کی قدیم نثری تصنیف تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہری چند مہر کی تصنیف ''نوآئینِ ہندی'' اور شاہ عالم ثانی کی ''عجائب القصص'' بھی اٹھارہویں صدی کی نمائندہ کتابیں ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی کی ابتدا سے آخر تک اُردو نثر اپنا ارتقائی سفر طے کرتی رہی ہے اور اس عہد میں نثر کی صحت مند روایت ملتی ہے۔اسلوب کی سطح پر بھی اس صدی میں بہترین تبدیلی ملتی ہے۔ اُردو پر عربی اور فارسی کے نمایاں اثرات ہونے کے باوجود ایک نکھرا ہوا اسلوب سامنے آتا ہے۔ سلیس اور رواں زبان میں ادب پارے تخلیق کیے گئے جن میں سے کئی اب بھی اُردو ادب کے شاہکار ہیں۔غرضیکہ اس صدی میں اُردو نثر کی مضبوط اور مستحکم داغ بیل ڈالی گئی جس نے فورٹ ولیم کالج کے لکھنے والوں کے لیے راہیں ہموار کر دیں اور جس کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔

15.6 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

1۔ اُردو نثر کی تاریخ میں عطا حسین تحسین کے مقام و مرتبے کا تعین کیجیے۔

2۔ شمالی ہند میں اُردو نثر کے ابتدائی نقوش سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

3۔ ''کربل کتھا'' پر ایک نوٹ لکھیے ۔

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

1۔ نثر کی تعریف کیجیے اور اُردو نثر میں ''نوآئینِ ہندی'' کے مقام کا تعین کیجیے۔

2۔ عجائب القصص کا خلاصہ لکھیے۔

3۔ نواب عیسوی خاں بہادر کی کردار نگاری ''قصہ مہر افروز و دلبر'' کے حوالے سے بیان کیجیے۔

15.7 فرہنگ

الفاظ	معنی
رفاقت	ساتھ، دوستی، محبت
کربل کتھا	کربلا کی کہانی
مختلف النوع	مختلف قسم کی
معاصر	ایک ہی دور کے، ہم عصر
نظم	موزوں کلام، شعر
نثر	وہ عبارت جو منظوم نہ ہو
ملفوظات	ملفوظ کی جمع، جو پڑھنے میں آئے
تذکرے	یادگار، سرگزشت، سوانح عمری
محاورے	وہ کلمہ یا کلام جسے اہل زبان نے لغوی معنی سے الگ کسی خاص مفہوم کے لیے مخصوص کر لیا
کہاوتیں	قول، ضرب المثل
اوجِ ثریا	انتہائی بلندی پر
کثرت	زیادہ
آمیزش	ملاوٹ
نوطرز مرصع	نئے انداز کی سجی ہوئی تحریر
مقفیٰ	جس میں قافیے کا اہتمام کیا گیا ہو
نگارشات	نگارش کی جمع، تحریریں

15.8 سفارش کردہ کتابیں

1۔	کلاسیکی نثر کے اسالیب	آفتاب احمد آفاقی
2۔	اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ	احتشام حسین
3۔	تاریخ ادب اُردو (جلد دوم، حصہ دوم)	جمیل جالبی
4۔	قصہ مہر افروز و دلبر (مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں)	عیسوی خاں بہادر
5۔	کربل کتھا (مرتبہ حنیف نقوی)	فضل علی فضلی
6۔	نوطرز مرصع (ترتیب و تہذیب: پروفیسر ارتضیٰ کریم)	میر محمد حسین عطا خاں تحسین
7۔	تاریخ ادب اُردو	نورالحسن نقوی

چھٹا باب : ادارے، رجحانات اور تحریکات

اکائی 16 فورٹ ولیم کالج

اکائی کے اجزا

16.0 مقصد

16.1 تمہید

16.2 فورٹ ولیم کالج کے قیام کے اغراض و مقاصد

16.3 ڈاکٹر جان گل کرسٹ اور اردو کے دوسرے انگریز پروفیسران

16.4 میر امن دہلوی

16.5 سید حیدر بخش حیدری

16.6 میر شیر علی افسوس

16.7 مرزا علی لطف

16.8 میر بہادر علی حسینی

16.9 مظہر علی خاں ولا

16.10 میر کاظم علی جوان

16.11 نہال چند لاہوری

16.12 خلاصہ

16.13 نمونۂ امتحانی سوالات

16.14 فرہنگ

16.15 سفارش کردہ کتابیں

16.0 مقصد

اس اکائی میں آپ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے مقصد اور فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات کا مطالعہ کریں گے۔ یہ مطالعہ آپ کو فورٹ ولیم کالج

کے قیام کے اغراض و مقاصد اور اس کی ادبی خدمات کو سمجھنے میں معاون ہوگا۔ اس مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے مقصد پر روشنی ڈال سکیں۔

☆ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات کو بیان کر سکیں۔

16.1 تمہید

فورٹ ولیم کالج لارڈ ویلزلی کے زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرس کی اجازت سے کلکتہ میں قائم کیا گیا۔ اس کالج کا بنیادی مقصد انگریز ملازمین کو ہندوستانی زبان (اردو) سکھانا تھا۔ انگریز چاہتے تھے کہ وہ بہت موثر انداز سے ہندوستان میں ان کی مقبوضہ ریاستوں میں حکومت کر سکیں۔ چنانچہ انھوں نے 1800ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں قائم کیا۔ اس کالج میں بہت سے علوم وفنون کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

16.2 فورٹ ولیم کالج کے قیام کے اغراض و مقاصد

فورٹ ولیم کالج کی ابتدا جس زمانے میں ہوئی وہ ہندوستان کی تاریخ کا پر آشوب دور تھا۔ صوبائی بغاوتیں شہنشاہیت کو نقصان پہنچا رہی تھیں اور غیر ملکی طاقتیں اس دور کے سیاسی انتشار سے پورا فائدہ حاصل کرنے کے لیے سرگرم عمل تھیں۔ بنگال' پلاسی کی جنگ 1757ء کے نتیجے میں فرنگی تسلط میں آ گیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جو صرف تجارتی مقصد سے قائم کی گئی تھی اب سیاست کے میدان میں بھی قدم جمانے لگی تھی۔ بکسر کی لڑائی کے بعد انگریز تسلط نہ صرف مشرقی اضلاع پر مستحکم ہوا بلکہ مغربی اور جنوبی ہند تک پہنچ چکا تھا۔ اس تسلط کو برقرار رکھنے' مزید سیاسی اقتدار حاصل کرنے اور حکومت کے کاروبار چلانے کے لیے انگریز افسروں کا دیسی زبانوں سے واقف ہونا ضروری تھا۔ فارسی کا عروج ختم ہو چکا تھا۔ اردو ایک عوامی زبان کی حیثیت سے ملک کے اکثر و بیشتر حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ عوام میں اردو کا چرچا ہونے لگا تو کمپنی بہادر کے حکام نے بھی اردو سیکھنے کی طرف سنجیدگی سے توجہ کی اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں 1800ء میں قائم کیا۔ اس کالج کا مقصد اردو کی بقا یا ترویج واشاعت نہ تھا بلکہ کمپنی کے انگریز ملازمین کو اردو سکھانے کا انتظام کرنا تھا۔ اس وقت ملک کی ابھرتی ہوئی زبان اردو ہی تھی جو ہندوستان کے طول وعرض میں نہ صرف بولی اور سمجھی جاتی تھی بلکہ اس میں تصنیف وتالیف کا کام بھی ہو رہا تھا۔ چنانچہ ارباب مقتدر اس زبان کو سیکھنے اور سمجھنے کے لیے مجبور تھے۔ فورٹ ولیم کالج کا قیام چوں کہ سرکاری طور پر منظّم کاوش تھی اس لیے اس کا اردو نثر کی ترقی ورفتار پر خوش گوار اثر پڑا۔

فورٹ ولیم کالج میں جو کتابیں تیار ہوئیں وہ ایسے لوگوں کے لیے تھیں جو اردو زبان سیکھنا چاہتے ہوں' اسی لیے سادہ اور سلیس زبان میں تیار کی گئیں۔ اردو قواعد کی کتابیں اور لغات بھی تیار کی گئیں۔ اردو میں جو نثری کتابیں تھیں وہ مشکل زبان میں تھیں اور تمام تر مذہبی تھیں۔ تاریخ اور دوسرے علمی موضوعات پر اردو میں کتابیں نہیں تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علمی اور ادبی کاموں کے لیے ایک مدت تک فارسی ہی استعمال کی جاتی تھی اس وجہ سے فورٹ ولیم کالج میں سادہ اور سلیس اردو زبان میں کتابیں لکھوائی گئیں۔

16.3 ڈاکٹر جان گل کرسٹ اور اردو کے دوسرے انگریز پروفیسران

گل کرسٹ کا پورا نام جان بارتھ وک گل کرسٹ (John Barth wick Gilchrist) تھا۔ اسکاٹ لینڈ کے باشندے تھے۔ 1783ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں ڈاکٹر کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور ہندوستان آئے۔ ہندوستان میں دہلی اور لکھنو میں رہ کر انھوں نے اردو اور فارسی سیکھی اور کمپنی کو مطلع کیا کہ اب فارسی کے بجائے اردو کو دفتری زبان بنانا زیادہ مفید ہوگا۔ بعد میں ان کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے 1832ء میں اردو سرکاری زبان قرار دی گئی۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے گل کرسٹ نو وارد انگریز عہدیداروں کو فارسی کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ جب 1800ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں

قائم ہوا تو ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے انھیں کالج کا صدر اور پروفیسر بنایا گیا۔گل کرسٹ 1804ء تک کالج کی خدمات انجام دیتے رہے۔خرابی صحت کی وجہ سے پنشن لے کر اپنے وطن لوٹ گئے۔1818ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے انگلستان میں اورینٹل انسٹیٹیوٹ قائم کیا تو وہ اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے اور اس ادارے کے برخاست ہونے تک کام کرتے رہے۔1814ء میں 88 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

گل کرسٹ نے صرف چار سال تک ہی فورٹ ولیم کالج میں خدمات انجام دیں۔لیکن ان چار سالوں میں انھوں نے فورٹ ولیم کالج میں تمام ہندوستان سے قابل اور لائق ماہرین زبان کو جمع کیا اور ان سے تصنیف و تالیف کا کام اس طرح لیا کہ مختلف موضوعات پر اردو میں نثری کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ فراہم ہوگیا۔اس کے علاوہ اردو سیکھنے کے لیے بنیادی کتابوں کا جتنا ذخیرہ انھوں نے فراہم کیا وہ ان کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ان کی اہم تصانیف یہ ہیں:

1۔ انگریزی ہندوستانی لغت: ہر لفظ کی اصل اس لغت میں بتائی گئی کہ لفظ کس زبان کا ہے یہ لغت 1792ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔

2۔ ہندوستانی علم اللسان: یہ اردو لسانیات کی کتاب ہے۔

3۔ اردو کی صرف ونحو: اردو قواعد کی یہ کتاب فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں شامل تھی۔

4۔ اورینٹل لنگوسٹ (مشرقی زبان دان): اس کتاب میں اردو زبان سیکھنے کا آسان طریقہ پیش کیا گیا ہے۔

5۔ اجنبیوں کے لیے رہنمائے اردو: انگریزوں کو اردو سکھانے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی۔

6۔ بیاض ہندی: فورٹ ولیم کالج کے مولفین کے کارناموں کا انتخاب وغیرہ۔

ڈاکٹر گلکرسٹ کے انگلستان لوٹنے کے بعد کپتان ٹامس روبک اردو کے پروفیسر اور صدر مقرر ہوئے۔ان کا تعلق فوج سے تھا۔انھوں نے کالج کے اہل قلم کو تصنیف و تالیف کی طرف راغب کیا اور کئی کتابیں شائع کیں۔انھوں نے بھی کئی کتابیں لکھیں۔''لغت جہاز رانی'' کے نام سے لغت لکھی اس کے ساتھ ایک مختصر اردو قواعد بھی شامل کی۔ان کی دوسری کتاب ''ترجمان ہندوستان'' ہے۔اس میں بھی قواعد زبان کی تشریح کی گئی ہے۔ان اردو کتابوں کے علاوہ انھوں نے فورٹ ولیم کالج کی تاریخ بھی لکھی۔

کپتان جوزف ٹیلر اردو کے پروفیسر تھے انھوں نے بھی ایک مبسوط اردو انگریزی لغت لکھی۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کا مقصد بیان کیجیے۔

2۔ جان گلکرسٹ کی اردو خدمات کا جائزہ لیجیے۔

16.4 میر امن دہلوی

نام میر امان تھا اور تخلص میر امن۔دہلی کے رہنے والے تھے۔ہمایوں کے عہد میں ان کے آباواجداد ہندوستان آئے۔مغلیہ دربار سے وابستہ رہے۔وظائف اور جاگیریں حاصل کیں۔یہ سلسلہ عالم گیر ثانی تک قائم رہا۔دہلی کی بربادی کے بعد پٹنہ اور اس کے بعد کلکتہ پہنچے جہاں نواب دلاور جنگ بہادر کے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کے اتالیق بنے۔اس زمانے میں فورٹ ولیم کالج میں منشیوں کی ضرورت تھی۔منشی بہادر علی حسینی ان کے دوست تھے ان کے توسط سے وہ کالج میں ملازم ہوگئے۔یہاں انھوں نے دو کتابیں ''باغ و بہار'' اور ''گنج خوبی'' لکھیں۔میر امن نے قصہ چہار درویش کو ''باغ و بہار'' کے نام سے لکھ کر شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کر لی۔اردو میں میر امن سے پہلے میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے قصہ چہار درویش کو ''نوطرز مرصع'' کے نام سے لکھا تھا۔تحسین کا یہ قصہ بہت مشکل زبان میں ہے اور اس کی عبارت مقفیٰ مسجع ہے۔میر محمد عطا حسین خاں تحسین کے علاوہ قصہ چہار

درویش کو بہت سے لوگوں نے لکھا لیکن ''باغ و بہار'' جس ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہے اور قصہ چہار درویش کو جتنی شہرت اور مقبولیت اس کتاب سے حاصل ہوئی وہ کسی اور کتاب سے حاصل نہیں ہوسکی۔ میر امن کی باغ و بہار نے نہ صرف اردو میں شہرت حاصل کی بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہوئے۔

میر امن کی دوسری کتاب ''گنج خوبی'' ہے جو دراصل ملا حسین کاشفی کی مشہور فارسی کتاب ''اخلاق محسنی'' کا اردو ترجمہ ہے۔اس میں اخلاقی حکایتوں کو پیش کر کے نصیحت آموز نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔

16.5 سید حیدر بخش حیدری

میر امن دہلوی کے بعد فورٹ ولیم کالج کے جن مصنفین کو اہمیت اور مقبولیت حاصل ہوئی ان میں حیدر بخش حیدری کا نام بھی شامل ہے۔سید حیدر بخش حیدری دہلی کے رہنے والے تھے لیکن ان کی زندگی کا بیشتر حصہ بنارس میں بسر ہوا۔فورٹ ولیم کالج میں سب سے زیادہ کتابیں لکھیں اور کئی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔1823ء میں بنارس میں ان کا انتقال ہوا۔

اس کی تصانیف یہ ہیں:

1۔ ''قصہ مہر و ماہ'': یہ حیدری کی پہلی تصنیف ہے۔

2۔ قصہ لیلیٰ مجنوں: یہ حضرت امیر خسرو کی فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے۔

3۔ طوطا کہانی: یہ سنسکرت زبان کی ''شکاسب تتی'' پر مبنی ہے۔شکاسب تتی کے معنی ہیں طوطے کی کہی ہوئی ستر کہانیاں

4۔ آرائش محفل: یہ قصہ حاتم طائی پر مبنی ہے۔یہ قصہ بھی فارسی سے ترجمہ کیا گیا۔

5۔ ہفت پیکر: حضرت نظامی گنجوی کی مشہور فارسی مثنوی 'ہفت پیکر' سے متاثر ہوکر اسی طرز پر اردو مثنوی 'ہفت پیکر' ہی کے نام سے لکھی۔

6۔ تاریخ نادری: نادر شاہ کے حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں۔یہ تاریخ بھی فارسی میں لکھی گئی تھی جس کا حیدری نے اردو میں ترجمہ کیا۔

7۔ گل مغفرت: روضۃ الشہدا کا ترجمہ ہے۔

8۔ گلزار دانش: شیخ عنات اللہ کی مشہور فارسی کتاب ''بہار دانش'' کا ترجمہ ہے۔

9۔ گلشن ہند: اردو شعرا کا تذکرہ کے علاوہ ''گلدستہ حیدری'' میں مضامین، دیباچے اور نظمیں ملتی ہیں۔

16.6 میر شیر علی افسوس

حیدر بخش حیدری کی طرح میر شیر علی افسوس بھی فورٹ ولیم کالج کے بہت ہی مشہور و معروف مصنفین میں سے ہیں۔افسوس کے دادا محمد شاہ کے عہد میں عراق سے ہندوستان آئے اور نواب عمدۃ الملک کے ملازم ہوئے۔افسوس دہلی میں 1735ء میں پیدا ہوئے۔نواب عمدۃ الملک کے انتقال کے بعد افسوس کے والد پٹنہ گئے اور بعد میں اودھ پہنچ کر وہاں کی سرکار میں ملازمت کی اس کے بعد حیدر آباد آ گئے اور یہیں انتقال کیا۔میر شیر علی افسوس فورٹ ولیم کالج میں تقرر ہونے سے قبل ہی دلی، پٹنہ اور لکھنؤ کی محفلوں میں خوب نام پیدا کر چکے تھے۔انھوں نے میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، جرأتؔ اور انشاؔ کا زمانہ دیکھا تھا اور ان کے ساتھ مشاعروں میں بھی شریک تھے۔جب فورٹ ولیم کالج میں منشیوں کی ضرورت پیش آئی تو ایک نواب کی سفارش سے فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے۔1805ء میں وفات پائی۔

فورٹ ولیم کالج میں گلکرسٹ کی فرمائش پر انھوں نے فارسی کی دو کتابوں کا ترجمہ کیا۔

1۔ باغ اردو : گلستان سعدی کا ترجمہ ہے۔

2۔ آرائش محفل: منشی سجان نے ہندوستان کی معتبر اور مستند تاریخ خلاصۃ التواریخ کے نام سے فارسی میں لکھی تھی اسی تاریخ کو افسوس نے اردو میں منتقل کیا۔

افسوس ایک اچھے شاعر ہونے کے علاوہ ادیب بھی تھے۔ان کا دیوان بھی ان کی یادگار ہے جو شائع ہو چکا ہے۔

16.7 مرزا علی لطف

مرزا علی نام تھا اور لطف تخلص۔دہلی کے رہنے والے تھے۔دہلی کی بربادی نے دہلی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔وہ لکھنو آئے اس کے بعد پٹنہ گئے اور وہاں سے پھر کلکتہ پہنچ گئے۔گلکرسٹ نے ان سے اردو شاعروں کا ایک تذکرہ لکھنے کی فرمائش کی اور انھوں نے اردو میں تذکرہ ''گلشن ہند'' لکھا جو فارسی تذکرہ ''گلزار ابراہیم'' کا اردو ترجمہ ہے۔تذکرہ کی زبان مشکل اور پیچیدہ ہے۔عبارت مقفیٰ و مسجع ہے لیکن اس تذکرہ کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے بہت سی باتیں ایسی لکھی تھیں جو اس زمانے کے تذکروں میں عام طور پر نہیں ملتیں۔انھوں نے شعرا کے حالات ہی بیان نہیں کیے بلکہ اس دور کے ماحول اور پس منظر کو بھی پیش کیا ہے۔

16.8 میر بہادر علی حسینی

میر بہادر علی حسینی کے حالات پر وہ خفا میں ہیں۔یہ میر امن سے پہلے فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہو گئے تھے۔میر امن ان ہی کے ذریعہ فورٹ ولیم کالج پہنچے۔انھوں نے فورٹ ولیم کالج کے لیے چار کتابیں لکھیں اور دوسری کتابوں کے لکھنے میں ڈاکٹر گل کرسٹ کی مدد کی۔

1۔ نثر بے نظیر : سحر البیان کے قصے کو نثر میں لکھا۔

2۔ اخلاق ہندی : یہ سنسکرت کی کتاب ''ہتو پادیش'' کے فارسی ترجمے کا اردو ترجمہ ہے۔

3۔ تاریخ آسام : فارسی کی تاریخ آسام کا اردو ترجمہ ہے۔

4۔ رسالہ گل کرسٹ : یہ گل کرسٹ کی کتاب ''ہندوستانی صرف ونحو'' کی تلخیص ہے۔

16.9 مظہر علی خاں ولاؔ

مظہر علی خاں نام اور ولاؔ تخلص تھا۔ممنونؔ، مرزا جان طپشؔ اور مصحفی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ ہندی اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔1802ء میں فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوئے اور لگ بھگ سات کتابوں کا ترجمہ کیا لیکن چند کتابیں ہی شائع ہو سکیں۔

1۔ مادھونل کام کندلا : یہ کتاب ہندی سے اردو میں نقل کی گئی ہے۔یہ ایک برہمن مادھونل اور ایک رقاصہ کندلا کی داستان عشق ہے۔

2۔ ترجمہ کریما : سعدی شیرازی کے مشہور پند نامہ ''کریما'' کو ولاؔ نے اردو میں منظوم کیا۔

3۔ ہفت گلشن : ناصر علی خاں واسطی بلگرامی کی فارسی کتاب کو اردو میں منتقل کیا۔اس میں تہذیب و اخلاق کے قاعدے، نصیحت آموز کہانیاں اور حکایتیں بیان کی گئی ہیں۔

4۔ اخلاق ہندی : اس میں اخلاقی حکایات ملتی ہیں۔

5۔ بیتال پچیسی : یہ ولاؔ کا مشہور کارنامہ ہے۔یہ کتاب سنسکرت میں لکھی گئی تھی۔برج بھاشا میں اس کا ترجمہ ہوا۔برج بھاشا سے ولا نے اردو میں منتقل کیا۔

6۔ تاریخ شیر شاہی : یہ شیر شاہ سوری کے عہد کی تاریخ ہے۔

7۔ جہانگیر نامہ : تزک جہانگیر کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے۔

16.10 میر کاظم علی جوانؔ

میر کاظم علی نام اور جوانؔ تخلص تھا۔ فورٹ ولیم کالج سے مشہور منشیوں میں تھے۔ دہلی کے رہنے والے تھے دہلی کی تباہی کے بعد مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے لکھنو پہنچے۔ لکھنو کے ریزیڈنٹ کرنل اسکاٹ نے ان کی علمی قابلیت سے متاثر ہوکر فورٹ ولیم کالج کے لیے سفارش کی۔ کالج سے وابستہ ہونے کے بعد کلکتہ ہی کے ہور ہے اور تمام عمر تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ ان کی تین کتابیں ملتی ہیں۔

1۔ شکنتلا ناٹک : گل کرسٹ کی ایما پر شہرہ آفاق ڈراما شکنتلا کو ہندی سے اردو میں منتقل کیا۔

2۔ بارہ ماسہ یا دستور ہند : سال کے بارہ مہینوں میں ہندو اور مسلمان جو تیوہار یا عید کرتے ہیں ان کی ساری تفصیل جزئیات کے ساتھ اس مثنوی میں پیش کی گئی ہے۔

3۔ تاریخ فرشتہ : اس تاریخ کے ایک بڑے حصے کا ترجمہ جو سلاطین بہمنی کے تعلق سے ہے، جوانؔ نے کیا تھا۔

ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے شعرائے اردو کے کلام کے انتخاب کا کام دوسرے مولفین کے ساتھ انجام دیا اور کئی کتابوں کی ترتیب و اشاعت میں بھی حصہ لیا۔

16.11 نہال چند لاہوری

نہال چند لاہوری فورٹ ولیم کالج کے ایک مشہور منشی تھے۔ ان کے آباواجداد دہلی کے رہنے والے تھے۔ دہلی کی تباہی کے بعد لاہور میں سکونت اختیار کی۔ ایک انگریز کپتان کے وسیلے سے ڈاکٹر گلکرسٹ کے ہاں پہنچے اور فورٹ ولیم کالج کے شعبہ تالیف و ترجمہ میں انھیں ملازم رکھ لیا گیا۔ ان کا صرف ایک ہی کارنامہ ''مذہب عشق'' ملتا ہے۔ تاج الملوک اور بکاولی کے فارسی قصے کو نہال چند لاہوری نے اردو میں منتقل کیا۔ اس قصے کو اس زمانے میں بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی مقبولیت کو دیکھ کر پنڈت دیا شنکر نسیم نے ''گلزار نسیم'' کے نام سے اس کو نظم کیا۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ فورٹ ولیم کالج میں میر امن نے کون سی دو کتابیں لکھیں؟

2۔ سید حیدر بخش حیدری نے فورٹ ولیم کالج میں کیا خدمات انجام دیں؟

3۔ میر شیر علی افسوس کی تصانیف کے نام لکھیے۔

4۔ نثر بے نظیر کے مصنف کون ہیں؟

16.12 خلاصہ

فورٹ ولیم کالج 1800ء میں کلکتہ میں قائم ہوا۔ اس کے قیام کا مقصد نو وارد انگریز عہدے داروں کو ہندوستانی زبان اور یہاں کے طور طریقوں سے روشناس کرنا تھا۔ اس ادارہ سے اردو نثر کو بے حد فائدہ پہنچا۔ اردو نثر میں اس وقت جو کتابیں تھیں ان کی زبان بہت مشکل تھی۔ چند کتابیں جو سادہ نثر میں تھیں وہ مذہبی رسالے تھے جو مذہب اسلام کے مسائل اور عقائد کی توضیح و تشریح کے لیے لکھے گئے تھے۔ اس لیے ڈاکٹر گل کرسٹ نے ملک کے ہر حصے سے ادیبوں کو جمع کر کے کتابوں کو ترجمہ و تالیف کروایا۔ فورٹ ولیم کالج کے اہم مصنفین میں میر امن، سید حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، مرزا علی لطف،

میر بہادر علی حسینی، مظہر علی خاں دلا، میر کاظم علی جوان اور نہال چند لاہوری کے نام قابل ذکر ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اردو نثر کو سادہ، سلیس اور ہر قسم کے مضامین ادا کرنے کے قابل بنایا۔ فورٹ ولیم کالج میں تصنیف و تالیف کی گئی کتابیں یہ ہیں:

گل کرسٹ	:	(1)۔ انگریزی ہندوستانی لغت	(2)۔ ہندوستانی علم اللسان	(3)۔ اردو کی صرف و نحو
		(4)۔ مشرقی زبان دان	(5)۔ اجنبیوں کے لیے رہنمائے اردو	(6)۔ بیاض ہندی
میر امن دہلوی	:	(1)۔ باغ و بہار	(2)۔ گنج خوبی	
سید حیدر بخش حیدری	:	(1)۔ قصہ مہر و ماہ	(2)۔ قصہ لیلیٰ مجنوں (3)۔ طوطا کہانی	(4)۔ آرائش محفل
		(5)۔ ہفت پیکر	(6)۔ تاریخ نادری (7)۔ گل مغفرت	(8)۔ گلزار دانش
		(9)۔ تذکرہ گلشن ہند	(10)۔ آرائش محفل	
میر شیر علی افسوس	:	(1)۔ باغ اردو	(2)۔ آرائش محفل	
مرزا علی لطف	:	تذکرہ گلشن ہند		
میر بہادر علی حسینی	:	(1)۔ نثر بے نظیر	(2) اخلاق ہندی (3) تاریخ آسام	(4) رسالہ گل کرسٹ
مظہر علی خان ولا	:	(1)۔ مادھونل اور کام کندلا	(2)۔ ترجمہ کریما (3)۔ ہفت گلشن	(4)۔ اخلاق ہندی
		(5)۔ بیتال پچیسی	(6)۔ تاریخ شیر شاہی (7)۔ جہانگیر نامہ	
کاظم علی جوان	:	(1)۔ شکنتلا ناٹک	(2)۔ بارہ ماسہ (3)۔ تاریخ فرشتہ	
نہال چند لاہوری	:	مذہب عشق		

16.13 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

1۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر گل کرسٹ کی ادبی خدمات بیان کیجیے۔

2۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات بیان کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

1۔ ڈاکٹر جان گل کرسٹ اور اردو کے دوسرے انگریز پروفیسران کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

2۔ میر امن اور باغ و بہار کی اردو نثر میں کیا اہمیت ہے؟

3۔ سید حیدر بخش حیدری اور میر شیر علی افسوس نے اردو ادب کی کیا خدمات انجام دیں؟

4۔ میر بہادر علی حسینی اور مرزا علی لطف کی ادبی خدمات بیان کیجیے۔

16.14 فرہنگ

الفاظ	معنی
مسلط	قبضہ کرنا

تصانیف	تصنیف کی جمع
تالیف	مختلف کتابوں سے مضامین چن کر پیرائے میں ترتیب دینا
ثقافت	تہذیب، کلچر
تمدن	طرز معاشرت
تدوین	مرتب کرنا

16.15 سفارش کردہ کتابیں

1۔ گل کرسٹ اور اس کا عہد — ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی

2۔ ارباب نثر اردو — سید محمد

3۔ اردو کی نثری داستانیں — ڈاکٹر گیان چند جین

اکائی 17 علی گڑھ تحریک: پس منظر، سرسید اور ان کے رفقا کی ادبی خدمات

اکائی کے اجزا

17.0 مقصد

17.1 تمہید

17.2 پس منظر

17.3 سرسید احمد خاں کی خدمات

17.3.1 سماجی خدمات

17.3.2 تعلیمی خدمات

17.3.3 ادبی خدمات

17.4 سرسید کے رفقا کی ادبی خدمات

17.4.1 الطاف حسین حالی

17.4.2 علامہ شبلی نعمانی

17.4.3 ڈپٹی نذیر احمد

17.4.4 نواب محسن الملک

17.4.5 دیگر رفقا

17.5 خلاصہ

17.6 نمونۂ امتحانی سوالات

17.7 فرہنگ

17.8 سفارش کردہ کتابیں

17.0 مقصد

اس اکائی میں آپ علی گڑھ تحریک، اس کے پس منظر، سرسید اور ان کے رفقا کی ادبی خدمات کا مطالعہ کریں گے۔ اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ علی گڑھ تحریک کے پس منظر کو سمجھ سکیں۔

☆ علی گڑھ تحریک کے مقصد کو سمجھ سکیں۔

☆ سرسید اور ان کے رفقا کی ادبی خدمات سے واقف ہو سکیں۔

17.1 تمہید

انسانی زندگی مسلسل حرکت میں ہے پھر بھی زندگی کے متعدد پہلو ایسے ہیں جس میں نقل در نقل اور رواج در رواج عمل کرتے رہنے سے جمود کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔اس جمود کو توڑنے کے لیے افراد یا جماعتیں منظر عام پر آتی رہتی ہیں' ان کے اس کام کو تحریک کہتے ہیں۔دنیا میں فنون لطیفہ اور ادب کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ادب میں بھی جمود اور سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔انیسویں صدی میں انقلاب 1857ء کا واقعہ اردو ادب کے لیے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔کیوں کہ ہمارا ادب گذشتہ سے پیوستہ رہتے ہوئے نئی توانائی اور جدید اصناف کے ساتھ سفر کرتا ہے۔اس کو وقت کے تقاضے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے اور با مقصد بنانے میں سرسید یا علی گڑھ تحریک کا بڑا اہم کردار ہے،اس کا تفصیلی جائزہ آپ اس اکائی میں پڑھیں گے۔

17.2 پس منظر

1757ء کی جنگ پلاسی کے بعد ہندوستان جدید دور میں داخل ہوتا ہے۔یہ پہلا موقعہ تھا جب یوروپی تجارتی قوم نے ہندوستان کی سیاست میں ریشہ دوانیوں کا فائدہ حاصل کر کے، اپنا استبدادی پنجہ گاڑ دیا۔بنگال کی بے شمار دولت ہاتھ لگنے کے بعد انگریزوں کی نیت خراب ہوگئی۔پھر 1764ء کی بکسر کی لڑائی میں مغل، اودھ اور بنگال کی متحدہ افواج کو انگریزوں نے شکست دے کر اپنی فوجی برتری کو ثابت کر دیا۔ہندوستان کی دیگر ریاستوں کو بھی رفتہ رفتہ انگریزوں نے شکست دے کر یا کمزور کر کے لوٹنا کھسوٹنا شروع کر دیا۔آخر یہ ظلم و بربریت کب تک؟ ہندوستانیوں کے ذہنوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکنے لگی۔چنانچہ جنگ پلاسی کے ٹھیک سو سال بعد 1857ء میں انگریزوں کے خلاف پورے ہندوستان میں جنگ لڑ کر انھیں بے دخل کرنے کی آخری کوشش کی گئی لیکن یہ کوشش دیر پا ثابت نہ ہوئی جس کی کئی وجوہات ہیں مثلاً اتحاد و اتفاق کی کمی، بہتر اور منظّم فوج کا نہ ہونا، انگریزوں کے مقابلے میں ناقص ہتھیار اور اسلحہ، ترسیل و رابطہ کی عدم موجوگی، انگریزی خفیہ محکمہ کی چابکدستی اور خود ہندوستانیوں کے ذریعہ مخبری اور غداری کرنا وغیرہ وغیرہ ایسے حقائق تھے جس کی بنا پر چند مہینوں میں انگریزوں نے پورے انقلاب کو کچل ڈالا اور صدیوں سے قائم مغل شہنشاہیت کے آخری ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو بھی ہمیشہ کے لیے گل کر دیا۔

انقلاب 1857ء ہندوستانی تاریخ کے سب سے اہم واقعات میں سے ایک ہے' جس نے ایک نئے ہندوستان کو جنم دیا۔انگریزوں اور پہلے کی دیگر فاتح قوموں میں ایک بنیادی فرق یہ تھا کہ موخر الذکر نے ہندوستان کو غلام نہیں بنایا بلکہ وہ خود اس کے غلام ہو گئے جب کہ اس کے برعکس انگریزوں نے ہندوستان کو غلام بنایا۔نسلی تفوق، علمی برتری اور عسکری قوت کا زعم ان میں موجود تھا نتیجتاً ہندوستانی عوام ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو کر احساس کمتری کا شکار ہوگئی۔انھیں اس مصیبت سے نکالنے کے لیے بہت سارے مصلح قوم اٹھ کھڑے ہوئے جنھوں نے مختلف انداز سے سیاسی، سماجی، تعلیمی اور مذہبی اصلاحی تحریکات کے ذریعہ مخلصانہ خدمات انجام دیں۔ایسے ہی ایک مصلح قوم کا نام سرسید احمد خان ہے جن کی تحریک علی گڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔

انیسویں صدی کی ان تحریکات کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ایک کی بنیاد انگریزوں سے مفاہمت پر ہے جو مغربی علوم، سائنسی طرز فکر، منطقی استدلال اور عقلیت پرستی کی روشنی میں تجدیدی کام کرنا چاہتا تھا تا کہ کھویا ہوا وقار بحال ہو سکے ساتھ ہی انگریزوں کے ذہنوں میں ہندوستانیوں کے تئیں جو شکوک و شبہات ہیں اس کا ازالہ بھی ہو جائے۔دوسری طرح کی تحریکات کی بنیاد انگریزوں سے نفرت پر ہے جو مغربی ثقافتی یلغار کے سامنے اپنی مشرقی روایات، تشخص، تہذیب و ثقافت کو مٹنے دینا نہیں چاہتا۔اس نے عقلیت کے بجائے عقائد اور تجدید کے بجائے احیا پر زور دیا۔اول الذکر میں

برہموسماج، پرارتھنا سماج اور علی گڑھ تحریک وغیرہ جب کہ دوسری طرح کی تحریکات میں آریہ سماج، رام کرشن مشن اور دیوبند تحریک وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

1857ء کے انقلاب میں چوں کہ مسلمانوں کا بڑا اہم رول رہا اور انگریز اس بات سے بخوبی واقف تھے اس لیے انھیں ہر پہلو سے نظر انداز کرنا ضروری سمجھا۔ سرسید نے اپنی انتھک کوششوں سے ایک طرف انگریزوں کے ذہنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف مختلف انجمنوں اور علی گڑھ کالج کے قیام، تصنیف، تالیف، مضامین، صحافت اور تقریروں کے ذریعہ مسلمانوں کے تعلیمی، سیاسی اور سماجی انحطاط کو دور کرنے کا بھی بیڑا اٹھایا۔ علی گڑھ تحریک نے ہندوستانی مسلمانوں کے تنزل کے سد باب کے ساتھ ساتھ اردو ادب پر بھی بڑے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں جس کا ذکر آئندہ اکائی میں کیا جائے گا۔ اس اکائی میں سرسید اور ان کے رفقا کی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں۔

17.3 سرسید احمد خاں کی خدمات

17.3.1 سماجی خدمات

یکم اپریل 1869ء کو سرسید انگلینڈ روانہ ہوئے۔ گرچہ اس سے پہلے اپنی تصنیفات اور سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھے گئے اخلاقی اور معاشرتی مضامین کے ذریعہ انھوں نے اصلاح کا کام شروع کر دیا تھا۔ مگر اکتوبر 1870ء میں انگلینڈ سے واپس ہوئے تو ان کے ذہن میں سماجی اصلاح اور تعلیمی تصور کا ایک واضح خاکہ موجود تھا۔ انھوں نے ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ'' قائم کر کے تعلیمی مشن کو عملی جامہ پہنا یا بلکہ ''تہذیب الاخلاق'' پرچہ جاری کر کے سماجی اصلاح کا کام انجام دیا۔

تہذیب الاخلاق جسے ''محمڈن سوشل رفارمر'' بھی کہتے تھے' کا مقصد یہ تھا کہ قوم میں جدید زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت بیدار ہو جائے نیز ان تمام خرابیوں کو دور کیا جائے جو سماج کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق کی ایک اشاعت میں سماجی اصلاح سے متعلق 29 نکات پر مشتمل ایک پروگرام پیش کیا تھا جن میں چند نکات درج ذیل ہیں:۔

سب سے پہلے ''آزادیٔ رائے'' کو سرسید ضرور سمجھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ انسان کو آزادانہ رائے دینے کا حق ہو تو دنیا کی آدھی برائیاں ختم ہو جائیں گی۔ ''دین اور دنیا'' کی تفریق کو وہ غیر ضروری سمجھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ بدبختی سے دنیا دین کو غارت کر دیتی ہے اسی طرح خوش بختی سے دنیا دین کو سنوار بھی دیتی ہے۔ دین اور دنیا کے بارے میں سرسید کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ایک ہاتھ میں قرآن دوسرے میں جدید علوم اور سر پر لا الہ الا اللہ کا تاج ہو۔ سرسید قوم میں ''خود اعتمادی'' پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کا مفہوم ان کے نزدیک یہ تھا کہ دوسروں کے دستِ نگر نہ ہوں اور اپنے مسائل آپ حل کرنا سیکھیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ''اپنی مدد آپ'' کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ اپنی مدد آپ سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص اپنی ترقی کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق خود کسی بیرونی امداد کا انتظار کیے بغیر کوشش کیے۔

یہی جذبہ ترقی کی بنیاد ہے۔ ''ناامیدی اور مایوسی'' کو وہ قوم کے لیے انتہائی مضر سمجھتے تھے۔ سرسید نے اپنے مشن میں بار بار ناکام ہونے کے باوجود اپنا کام جاری رکھا اور آخر ایک دن اپنی منزل کو پالیا۔ اپنے مضمون ''امید کی خوشی'' میں بڑی خوب صورتی سے انہوں نے مثالوں کے ذریعہ اس بات کو سمجھایا ہے۔ ''رسم و رواج'' کی پابندی کو سرسید نے بندر کی نقل سے تشبیہ دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نقل کے بجائے عقل سے کام لے کر اچھی رسموں کو اختیار کرے اور بری رسموں کو رد کرے۔ کاہلی اور سستی کسی کے نزدیک بھی اچھی چیز نہیں ہے۔ مگر سرسید نے ''کاہلی و سستی'' کو جسمانی محنت کے بجائے قلبی اور عقلی محنت کی کمی کو سمجھا تھا۔ دوسرے لفظوں میں دل، دماغ اور عقل کو قوم کے مفید کاموں میں استعمال کرے۔ ''خوشامد'' سرسید کے نزدیک دل کی بیماریوں میں سب سے زیادہ مہلک ہے۔ اس کی وجہ سے انسان خود غرضی اور مطلب پرستی کا شکار ہو جاتا ہے۔ ''ریاکاری'' کو انہوں نے تہذیب اور معاشرت کا دشمن بتایا ہے۔ ریاکاری ظاہر و باطن کو الگ کرتی ہے۔ ریاکار آدمی آسانی سے اپنے دوست کو دھوکہ دے سکتا ہے۔ ''بحث و تکرار'' بھی سرسید کے نزدیک ایک

اچھی چیز نہیں۔ اس سے دلوں میں کدورت پیدا ہوجاتی ہے اور ''تعصب'' کو سرسید بدترین خصلتوں میں سے ایک خصلت بتاتے ہیں۔ یہ نیکیوں کو برباد اور خوبیوں کو تباہ کردیتی ہے۔ عدل وانصاف اس کی وجہ سے جاتا رہتا ہے۔

ان چند انتہائی اہم اور قابلِ غور معاشرتی خرابیوں کی طرف سرسید نے توجہ مبذول کرائی ہے جن کو دور کرکے قوم ترقی کرسکتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ برائیاں ہمارے سماج میں پنپ رہی تھیں اور پنپ رہی ہیں جس کو سرسید نے محسوس کرکے بلاخوف لکھا' بتایا اور دور کرنے کی حتی المقدور کوشش کی۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ 1857ء کے واقعہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

2۔ سرسید کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

3۔ سرسید نے جن سماجی برائیوں کی نشان دہی کی ہے ان میں آپ کے نزدیک کون کون سی زیادہ متاثر کن اور معاشرے کو خراب کرنے والی ہیں؟

17.3.2 تعلیمی خدمات

سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ ہندوستانی مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کرنا ہے۔ وہ قوم کے سارے امراض کا علاج مغربی تعلیم میں تلاش کرتے ہیں۔ 1857ء کے بعد ملک کے حالات تیزی سے بدل گئے۔ اندازِ فکر' رہن سہن' تعلیمی نظام اور نصاب کے علاوہ ہر چیز پر اس کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ اب اگر ملازمتوں کو حاصل کرنا ہے' سماج میں بہتر زندگی گذارنا ہے' حکومت میں اپنی رسائی حاصل کرنا ہے' تجارت' صنعت وحرفت کے شعبوں میں ترقی کرنا ہے تو جدید تعلیم سے منہ موڑ نہیں سکتے۔ لیکن مسلمانوں کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ صدیوں تک حکومت ان کے پاس تھی ان کے علوم اور زبان کو دیگر اقوام سیکھ اور پڑھ رہے تھے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اپنی زبان اور علوم کو ترک کرکے دوسرے علوم اور زبان کو سیکھنا پڑ رہا تھا۔ اس کے لیے اتنی جلدی سے یہ آمادہ نہیں تھے۔ سرسید نے وقت کے تقاضہ کو سمجھا اور لاکھ مخالفتوں کے باوجود اپنے مشن میں لگے رہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اب مسلمانوں کو بھی جدید علوم پڑھنے پڑیں گے۔ ابتدا میں سرسید ہندو اور مسلمانوں کی تعلیم کے لیے یکساں کوشش کرتے رہے مگر راجہ رام موہن رائے نے بہت پہلے ہی ہندوؤں میں بیداری پیدا کردی تھی اور ان کے سامنے مسلمانوں کی طرح کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا۔ وہ پہلے عربی اور فارسی پڑھتے تھے اب انگریزی پڑھنے میں انہیں کیوں کر جھجک محسوس ہوگی۔ البتہ سرسید نے اپنے تعلیمی ادارے کے دروازے غیر مسلموں پر بھی اسی طرح کھلے رکھے جس طرح مسلمانوں پر۔

سرسید اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ مسلمان انگریزی سیکھنے پر راضی نہیں ہوں گے۔ اس لیے وہ جدید علوم کی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرانا چاہتے تھے۔ گرچہ دہلی کالج کی ''ورناکلرٹرانسلیشن سوسائٹی'' نے یہ کام انجام دیا تھا لیکن بے وقت کالج بند ہوجانے سے یہ کام ادھورا رہ گیا تھا۔ اس مقصد کے تحت سرسید نے غازی پور میں اپنے قیام کے دوران 9 جنوری 1869ء کو ''سائنٹفک سوسائٹی'' قائم کی بعد میں ان کے تبادلہ کے ساتھ یہ سوسائٹی بھی علی گڑھ منتقل ہوگئی۔ اس سوسائٹی نے تقریباً چالیس کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرایا ہے۔

آغاز میں سرسید مادری زبان یعنی اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دینا چاہتے تھے اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جو پہلے گذر چکی یعنی مسلمان انگریزی کی طرف مائل نہیں ہورہے تھے۔ دوسری وجہ انہوں نے یہ بیان کی کہ غیر ملکی زبان میں تعلیم حاصل کی جائے تو دوگنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ ایک تو اصل مضمون پر دوسرے زبان سیکھنے پر مزید یہ کہ یہ علم دیرپا نہیں ہوتا اس لیے ان کے ذہن میں ایک ورناکلر یونیورسٹی کا خاکہ موجود تھا۔ مگر برطانیہ کے سفر سے لوٹنے کے بعد ان کی فکر میں بڑی تبدیلی آجاتی ہے اور وہ اردو کے بجائے انگریزی کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر اپنانے کی پرزور دعوت دیتے ہیں۔ اپنے اس موقف کی تائید میں وہ کہتے ہیں کہ ''تمام علوم کو اردو میں منتقل نہیں کیا جاسکتا جب کہ جدید علوم کو حاصل کرنا ناگزیر ہوگیا ہے دوسرے یہ کہ حکمرانوں کی زبان انگریزی ہے۔ تیسرے یہ کہ راجہ رام موہن رائے کی قیادت میں برادرانِ وطن انگریزی زبان کی طرف پوری طرح متوجہ ہوگئے ہیں اور وہ مسلمانوں سے آگے بڑھ

چکے ہیں''۔ بہرحال سرسید نے برطانیہ سے لوٹ کر دو بڑے کام انجام دیے۔ ایک مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کے لیے تہذیب الاخلاق پرچہ کا اجرا' دوسرے تعلیمی پس ماندگی دور کرنے کے لیے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام۔

24 مئی 1875 کو مدرسۃ العلوم علی گڑھ یعنی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام عمل میں آیا۔ سرسید کا قائم کردہ یہ کالج آج ہمارے سامنے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں موجود ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنے میں اس یونیورسٹی کا بڑا اہم کردار ہے جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ حالاں کہ ان کے اس تعلیمی مشن میں رکاوٹیں بھی پیدا کی گئیں۔ مولوی امداد علی اور مولوی علی بخش کٹر مخالفین میں تھے۔ شبلی نعمانی نے بھی بعض چیزوں میں سرسید کی مخالفت کی۔ اکبرالہ آبادی شروع میں اپنی شاعری کے ذریعہ سرسید پر چوٹیں کسیں مگر بعد میں مداح ہوگئے۔ سرسید کا ساتھ دینے والوں میں الطاف حسین حالی' ڈپٹی نذیر احمد' منشی ذکاء اللہ' محسن الملک' وقار الملک' مولوی سمیع اللہ وغیرہ کے نام لیے جاتے ہیں۔ سرسید کے ان رفقا نے بھی تعلیمی اور ادبی خدمات انجام دی ہیں۔

سرسید تعلیم کو سبھی کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ مگر تعلیم حاصل کرنے والوں کو وہ چھ حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے کے لیے تعلیم کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جو تجارت یا صنعت وحرفت کو ذریعۂ معاش بنانا چاہتے ہیں۔ تیسری طرح کے لوگوں میں زمین دار اور جاگیردار آتے ہیں (یہ آزادی سے قبل کا طبقہ ہے)۔ چوتھی قسم میں ایسے لوگ آتے ہیں جو مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل کر کے تصنیف وتالیف کا مشغلہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ پانچواں طبقہ علم دین حاصل کرنے والوں کا ہے۔ چھٹا گروہ عام لوگوں کا ہے جو تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر کے اپنے روزمرہ کے کاموں میں معمول کے مطابق لگا رہنا چاہتا ہے۔ اگر ان تمام پر غور کیا جائے تو سرسید کے قائم کردہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں پہلی قسم کے لوگ یعنی سرکاری ملازمتوں کے خواہش مند ہی متوجہ ہوئے۔ یہاں کے طلبا نے ملازمت ہی کو ترجیح دی اور کالج کے ارباب حل وعقد کا مقصد بھی یہی تھا کہ ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کو اطمینان بخش بنایا جائے۔

عورتوں کی تعلیم کی طرف سرسید نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اس کے مخالف تھے بلکہ ان کا کہنا تھا کہ مرد جب تک تعلیم یافتہ نہ ہوں عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی جاسکتی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مسلمان اپنی لڑکیوں کو اسکولوں میں بھیجنے پر آمادہ نہیں تھے۔ جہاں تک ابتدائی تعلیم کی بات ہے اس کا خاکہ بھی سرسید کے ذہن میں تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پورے ملک میں ابتدائی تعلیم کے ادارے قائم ہوں اس مقصد کے لیے انہوں نے 1886ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ بہرحال سرسید کی پیہم کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مسلمان بالآخر تعلیم کی طرف متوجہ ہوگئے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ سرسید نے تعلیم کے لیے کون کون سے اقدامات کیے؟

2۔ سرسید کے تعلیمی تصور کو بیان کیجیے۔

3۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام کے پس منظر بتائیے۔

17.3.3 ادبی خدمات

سرسید بے انتہا مصروف انسان تھے پھر بھی انہوں نے تصنیف وتالیف کے لیے وقت نکالا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ تصنیف وتالیف میں جیسا میرا جی لگتا ہے ویسا کسی اور کام میں نہیں لگتا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سیاسی' سماجی اور تعلیمی خدمات انجام دیتے ہوئے لکھنے پڑھنے کے مشغلہ کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ایک بڑی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ سرسید کے تمام کاموں سے کچھ نہ کچھ اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر اردو زبان وادب کی جو خدمات انہوں نے انجام دیں ان کا اعتراف دوست دشمن سبھی کرتے ہیں۔

سرسید نے کم عمری میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا اور یہ سلسلہ وفات کے نو دن پہلے تک چلتا رہا۔ آخری مضمون انہوں نے تہذیب الاخلاق میں اردو کی حمایت میں لکھا تھا جب کہ آغاز اپنے بڑے بھائی کے اخبار ''سید الاخبار'' سے کیا۔ ان کی پہلی کتاب 'رسالہ القلوب بذکر محبوب'' ہے۔ انہوں نے تقریباً ہر موضوع پر قلم اٹھایا۔ تاریخ کی تین اہم کتابوں ''آئین اکبری'' ''تاریخ فیروز شاہی'' اور ''توزک جہانگیری'' کو مرتب کیا۔ دہلی کی عمارتوں کا تفصیلی جائزہ ''آثار الضادید'' میں لیا ہے۔ انقلاب 1857ء کے تعلق سے ''تاریخ سرکشی بجنور'' اور ''اسباب بغاوت ہند'' تحریر کی۔ مذہب پر کئی کتابیں لکھیں۔ ان میں ''تفسیر قرآن'' ''تفسیر انجیل'' (تبئین الکلام) ''خطبات احمدیہ'' ''ابطال غلامی اور ''احکام طعام اہل کتاب'' وغیرہ اہم ہیں۔ کل ملا کر چالیس سے زائد کتابیں سرسید نے تحریر کیں۔ جہاں تک ادب کی بات ہے اس پر باضابطہ کتاب تو نہیں لکھی البتہ اخبار سائنٹفک سوسائٹی (بعد کو علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ) اور تہذیب الاخلاق میں شائع ان کے انشائیوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو زبان' اسلوب اور نثر کو خود سرسید اور ان کی تحریک نے کس قدر متاثر کیا ہے۔ انہوں نے آسان اور سادہ نثر نگاری کو فروغ دیا۔ گرچہ فورٹ ولیم کالج اور خطوطِ غالب کے ذریعہ اس کی داغ بیل پڑ چکی تھی مگر ابھی یہ رجحان عام نہیں ہوا تھا۔ سرسید اور علی گڑھ تحریک نے اردو ادب کی یہ بڑی خدمت کی کہ پُر تکلف نثر کو ترک کر کے سلیس و سادہ نثر کو ترقی دی۔ دوسرا کام یہ کیا کہ تحریر کو بامقصد اور افادیت کا حامل بنایا۔ تہذیب الاخلاق میں سرسید کے جو ادبی مضامین یا انشائیے شائع ہوئے ان میں سے چند یہ ہیں: بحث و تکرار' امید کی خوشی' گزرا ہوا زمانہ' جاڑہ' تعلیم' رسم و رواج کی پابندی' آزادیٔ رائے' سمجھ' دنیا بہ امید قائم ہے' اخلاق' ریاکاری' خوشامد' اپنی مدد آپ وغیرہ۔

سرسید نے اپنے ان تمام مضامین میں انشا پردازی کا کمال دکھایا ہے۔ فطرت کی سچی تصویر کشی' درد انگیزی' اثر پذیری' حقیقت نگاری' افادیت پسندی وغیرہ ان کی تحریروں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ایک بڑا وصف ان کی تحریروں کا یہ بھی ہے کہ علمی اصطلاحات' الفاظ اور تعلیمات کو بڑی سادگی' صفائی اور دل آویزی سے ادا کیا ہے۔ ان کی تحریر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

''مہذب آدمیوں کی مجلس میں بھی آپس میں اسی طرح تکرار ہوتی ہے پہلے صاحب سلامت کر کر آپس میں مل بیٹھتے ہیں پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہوتی ہے۔ ایک کوئی بات سمجھتا ہے دوسرا بولتا ہے واہ یوں نہیں کہتا کہ واہ تم کیا جانو؟ وہ بولتا ہے تم کیا جانو؟ دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے۔ تیوری چڑھ جاتی ہے۔ آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں' باچھیں چڑھ جاتی ہیں۔ لپادگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کر چھڑا دیا تو غراتے ہوئے ایک ادھر چلا گیا اور ایک اُدھر۔'' (بحث و تکرار)

اسے پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ آسان الفاظ میں انسانی فطرت کی کتنی سچی تصویر کھینچی ہے۔ یہ اثر ان کی تحریروں میں جا بجا ملتا ہے۔ شوخی و ظرافت کی جھلکیاں بھی کہیں کہیں نظر آ جاتی ہیں۔

شاعری سے سرسید کی طبیعت کو مناسبت نہیں تھی۔ البتہ ان نقائص کی نشاندہی کی ہے جو ہماری شاعری میں راہ پا گئے۔ شاعروں کو مفید مشورے بھی دیے۔ انجمنِ پنجاب لاہور کی زیر نگرانی جب نئی طرز کی شاعری کو رواج دیا گیا تو محمد حسین آزاد کو جو اس انجمن کے روح رواں تھے' سرسید نے مبارک باد دی۔ سرسید کی یہ بڑی تمنا تھی کہ شاعری سے قوم کو بیدار کرنے کا کام لیا جائے چنانچہ الطاف حسین حالؔی سے انہوں نے مسدس' مدوجزر اسلام لکھوائی جو آج تک اپنی اثر انگیزی' مضمون آفرینی' سادگی اور خلوص کی وجہ سے اتنی ہی مقبول ہے جتنی کہ پہلے تھی۔ مجموعی طور سے دیکھا جائے تو سرسید کی کوششوں سے ادب کی دنیا میں انقلاب برپا ہو گیا اور کچھ ہی دنوں میں نثر و نظم کا ایسا سرمایہ فراہم ہو گیا جس پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ سرسید کی چند اہم کتابوں کے نام بتائیے؟

2۔ سرسید سے اردو ادب کو کیا فائدہ پہنچا؟

3۔ آپ نے سرسید کے کتنے مضامین پڑھے ہیں کسی ایک کا خلاصہ لکھیے؟

17.4 سرسید کے رفقا کی ادبی خدمات

17.4.1 الطاف حسین حالؔی

حالؔی کا وطن پانی پت (ہریانہ) ہے۔ 1854ء میں جس وقت ان کی عمر سترہ سال تھی، دہلی آئے اور ادبی شخصیتوں سے ملنے کا موقع ملا۔ خصوصاً غالبؔ سے وہ بڑے متاثر ہوئے اور ان سے گہرا رشتہ وابستہ ہوگیا۔ 1857ء کی بغاوت میں وہ دہلی سے چلے گئے پھر 1863ء میں دہلی واپس ہوگئے۔ اس سفر میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ملاقات ہوئی۔ بغاوت کے بعد وہ دہلی زیادہ دنوں نہ رہ سکے اور لاہور چلے گئے۔ اسی زمانے میں انجمنِ پنجاب لاہور نے اردو شاعری کو ایک نیا رخ عطا کیا۔ یہ اس سے وابستہ ہوگئے۔ سکریٹری بھی بنائے گئے۔ انہوں نے انجمن کے لیے چار نظمیں ''برکھارُت'' ''نشاطِ امید'' ''مناظرہ رحم وانصاف'' اور ''حبِ وطن'' لکھیں جو بہت پسند کی گئیں۔ چند سال لاہور رہ کر وہ پھر دہلی چلے آئے۔

دہلی آکر اردو نثر نگاری کی طرف توجہ دی کیوں کہ اب وہ سرسید کی صحبت میں آگئے تھے۔ ان کی نثر میں سرسید کی چھاپ بھی ہے اور انفرادیت بھی۔ مثلاً سادگی، منطقی استدلال اور بے تکلف اظہار وغیرہ سرسید کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ سادگی میں لطافت، منطقیت میں شاعرانہ انداز، تمثیلی پیرایہ، فطری اور بول چال کا لہجہ، عربی اور فارسی الفاظ سے احتراز مگر بعض جگہ انگریزی کا بے جا استعمال حالؔی کی نثر نگاری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ حالؔی کی نثر نگاری کو دیکھنا ہے تو ان کی سوانحی تصانیف کو پڑھنا چاہیے۔ اردو میں سوانح نگاری کو سرسید تحریک نے ہی جلا بخشی۔ حالؔی نے تین اہم سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ خود سرسید کی سوانح ''حیاتِ جاوید'' نام سے لکھی۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ سرسید کی زندگی کے کسی پہلو پر لکھی جانے والی کوئی تحریر اس کے استفادے سے مستغنی نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح غالبؔ کی سوانح ''یادگارِ غالب'' کے عنوان سے تحریر کی۔ یہ بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ 'حیاتِ جاوید''۔ تیسری کتاب ''حیاتِ سعدی'' ہے جو کہ فارسی کے مشہور شاعر شیخ سعدی علیہ الرحمہ کی سوانح عمری ہے۔

سرسید نے حالؔی سے قوم کو بیدار کرنے کے لیے ایک نظم لکھنے کی خواہش کی چنانچہ مد و جزر اسلام (اسلام کا عروج و زوال) کے نام سے ایک طویل نظم لکھی۔ یہ نظم بعد میں ''مسدس حالؔی'' نام سے مشہور ہوئی۔ نظم میں حالؔی نے سب سے پہلے اسلام کے عروج و زوال پر روشنی ڈالی۔ پھر مسلم قوم کی جہالت اور تعلیم کی کمی پر اظہار خیال کیا ہے۔ ایک سچی اور دل سوز آواز کو لوگوں نے سنا۔ سرسید اس نظم کو پڑھ کر سر دھنتے تھے۔ زبان سادہ، سلیس اور دل نشیں ہے۔ روانی اس نظم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ 1879ء میں یہ نظم شائع ہوئی۔ ہندوستان میں خواتین کی حالتِ زار کو بھی حالؔی نے سمجھا۔ راشد الخیری کو دنیا مصورِ غم کے نام سے جانتی ہے۔ حالی نے بھی عورتوں کے دکھ درد، بیوگی و بے چارگی کو سمجھنے اور اپنی نظموں میں ان حالات کو پیش کرنے میں جو تصویر کشی کی ہے، وہ مصورِ غم سے کسی طرح کم نہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے 1874ء میں ''مناجاتِ بیوہ'' اور 1906ء میں ''چپ کی داد'' نام سے طویل نظمیں لکھیں۔ حالؔی اس معاملہ میں سرسید سے بھی آگے بڑھے ہوئے تھے چنانچہ ''تعلیم نسواں'' کے بارے میں ان کا ایک واضح تصور تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد کی طرح انہوں نے بھی خواتین کے لیے ناول ''مجالس النسا'' تحریر کی۔

اردو تنقید کی تاریخ میں الطاف حسین حالؔی کا بڑا مقام ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو میں بحیثیت فن، تنقید کی ابتدا حالؔی کے مقدمہ شعر و شاعری سے ہوتی ہے۔ 1893ء میں انہوں نے یہ فکر انگیز مقدمہ اپنے مجموعہ کلام کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس کے شائع ہوتے ہی پوری ادبی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ اردو تنقید کو اس سے نئی راہ ملی۔ اس طرح حالؔی پہلے شخص ہیں جنہوں نے شعر کو کسوٹی پر پرکھا اور تنقیدی مسائل سے بحث کی۔ بحیثیت مجموعی سرسید کے اہم رفیق حالؔی سے اردو ادب کو بے انتہا فائدہ پہنچا۔ ان پر آپ تفصیل سے مطالعہ کرسکتے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ الطاف حسین حالؔی کی چند کتابوں کے نام بتائیے۔

2۔ مقدمہ شعروشاعری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ واضح کیجیے۔

3۔ انجمن پنجاب لاہور کی تاریخی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

17.4.2 علامہ شبلی نعمانی

شبلی نعمانی (1857-1914) اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی اور فلسفہ وغیرہ کی تعلیم اپنے وقت کے علما سے حاصل کی۔ 1872ء میں وہ علی گڑھ کالج میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے آئے۔ یہاں پر سرسید کے کتب خانے سے بھرپور استفادہ کیا اور ان ہی کی توجہ سے سوانح نگاری کی طرف راغب ہوئے۔ حالاں کہ اس وقت تک وہ نظمیں لکھتے تھے۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران پروفیسر آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی۔ آرنلڈ سے اتنا گہرا تعلق تھا کہ ان کے ہمراہ مصر، شام و دیگر اسلامی ممالک کا سفر کیا۔ سرسید کے آخری دور میں کچھ اختلافات کی بنا پر شبلی علی گڑھ سے علاحدہ ہوگئے۔ 1897ء میں وہ وہاں سے اپنے وطن اعظم گڑھ آگئے اور ایک نیشنل اسکول کی بنیاد رکھی۔ کچھ عرصہ وہ حیدرآباد میں رہے جہاں انھیں تصنیف و تالیف کا اچھا موقعہ ملا۔ لکھنؤ میں جب دارالعلوم ندوۃ العلما قائم ہوا تو شبلی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ وہاں رہ کر مولانا عبدالماجد دریابادی اور علامہ سید سلیمان ندوی جیسے صاحبِ طرز ادیبوں کی تربیت کرتے رہے۔ آخر میں پھر اعظم گڑھ آگئے اور ایک تحقیقی ادارہ ''دارالمصنفین'' نام سے قائم کیا جو آج تک اپنا کام کر رہا ہے۔

سرسید کے رفقا میں علامہ شبلی بڑی عبقریت کی حامل شخصیت تھی۔ علم الکلام اور فلسفہ میں کامل دست رس رکھتے تھے۔ سوانح نگاری، تاریخ نویسی، ادب، انشا اور شاعری کے ساتھ اردو تنقید میں بھی ان کا ایک بلند مقام ہے۔ ''سیرۃ النبی''، ''المامون''، ''الفاروق''، ''الغزالی''، ''سیرۃ النعمان'' اور ''سوانح مولانا روم'' ان کی سوانح عمریاں ہیں جب کہ ''شعرالعجم'' اور ''موازنہ انیس و دبیر'' سے ان کی تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مختصر کلیات بھی شائع ہوا ہے جس میں مثنوی، مسدس، قصیدے اور اخلاقی و سیاسی نظمیں ملتی ہیں۔ برطانوی سامراج کے واقعات پر بڑی ولولہ انگیز نظمیں لکھی ہیں جنھیں پڑھ کر شبلی خود بھی روتے تھے اور دوسروں کو بھی رلاتے تھے۔

شبلی کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں قوت اور جوش بیان کے ساتھ ساتھ ایجاز و اختصار بھی ہے۔ چوں کہ شبلی جمالیاتی تنقیدی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے نثر میں شاعرانہ فضا پیدا کرنے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ وہ برمحل اشعار کا استعمال کر کے معانی و مطالب کو دل کش انداز میں ادا کر دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ ان کی نثر کی سادگی میں فن کاری کی ایک خاص شان پائی جاتی ہے۔ ادب کے طالب علم کو شبلی کی موازنۂ انیسؔ و دبیر اور شعرالعجم کی چوتھی جلد ضرور پڑھنی چاہیے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ شبلیؔ کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

2۔ اردو ادب کو شبلی سے کیا فائدہ پہنچا، نشان دہی کیجیے؟

17.4.3 ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد کا وطن بجنور ہے۔ بچپن میں دہلی آگئے اور قدیم دہلی کالج سے تعلیم حاصل کی۔ انگریزی حکومت کی ملازمت کی اس لیے ان کی حمایت کرتے رہے۔ انہوں نے کبھی کچھ وقت حیدرآباد میں گذارا، بقیہ زندگی دہلی میں رہ کر تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔ ''شمس العلما'' کے خطاب

سے نوازے گئے۔

سرسید سے ان کے روابط تھے۔عموماً تقاریر کے لیے سرسید انہیں اپنے ساتھ رکھتے تھے کیوں کہ آواز بلند اور بھاری بھرکم تھی۔ بڑے بڑے اجتماعات میں تقریر کرتے تو سناٹا چھا جاتا۔ان کی تقریروں کے مجموعے خطبات نذیر احمد کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ جسے پڑھ کر ان کے وسیع علم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔قرآن پاک کی تفسیر بھی انہوں نے لکھی۔قانون کی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے جن میں ''تعزیراتِ ہند'' اور ''قانونِ شہادت'' مشہور ہیں۔نذیر احمد کی اصل شہرت ان کے ناولوں سے ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار کہا جاتا ہے۔حالاں کہ بحیثیت ناول انہوں نے نہیں لکھا۔ان کے سامنے پہلے سے ناول کا خاکہ یا نمونہ اردو میں موجود نہیں تھا۔ظاہر ہے ان کے ناول فکری اور فنی اعتبار سے کمزور ہیں البتہ ناول کے عناصر ترکیبی ہونے کی بنا پر ان کی تصانیف کو ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد نے کل سات ناول لکھے۔ پہلا ناول ''مرأۃ العروس'' 1869ء میں لکھا جو کہ اپنی لڑکی کی تعلیم و تربیت اور ذہن سازی کے لیے لکھا تھا۔لیکن ایک انگریز کلکٹر کی فرمائش پر اسے شائع کیا جو مقبول ہوگیا۔ دوسرا ناول ''بنات النعش'' بھی اسی مقصد سے لکھا۔تیسرا ناول ''توبۃ النصوح'' سب سے زیادہ مشہور اور دلچسپ ہے۔اس کو پڑھ کر دلی کے اجڑتے ہوئے مسلم خاندانوں کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔اس ناول کا ایک زندہ جاوید کردار ''مرزا ظاہر دار بیگ'' ہے۔ان کے دیگر ناولوں کے نام ''ابن الوقت'' ''فسانۂ مبتلا'' ''ایامیٰ'' اور ''رویائے صادقہ'' ہیں۔

نذیر احمد کے متعلق عموماً یہ رائے ظاہر کی جاتی ہے کہ فن کے اعتبار سے ان کے ناول' ناول کے بجائے خطبات نظر آتے ہیں جس میں اصلاح معاشرت کی بات کہی گئی ہے۔مگر اعتراض کرنے والے اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس وقت سماجی مسائل مسلمانوں کے درمیان سب سے اہم مسئلہ بنا ہوا تھا اور سرسید تحریک کے زیر اثر نذیر احمد بھی ناولوں کے ذریعہ لوگوں کو نئی راہ دکھانا چاہتے تھے۔اس لحاظ سے ان میں ترقی یافتہ ناولوں کی تمام خوبیاں تلاش کرنا بے کار ہے۔مگر انیسویں صدی کے ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت کی بہترین تصویریں ان ناولوں میں ملتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر ناول کے نہ جانے کتنے ایڈیشن نکل چکے ہیں بلکہ دیگر کئی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔نذیر احمد زبان کے بادشاہ ہیں۔دلی کی عام بول چال' محاورے' کنایے کے ساتھ ساتھ سنجیدہ علمی زبان کا استعمال بڑی مہارت سے کرتے ہیں۔کبھی کبھی عربی کے نامانوس لفظ اور بے جا محاورے لکھ دیتے ہیں۔ دورخی زبان ہونے کے باوجود یہ لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور بقول سید عبداللہ نذیر احمد کا منفرد اسلوبِ بیان دلوں پر اپنا سکہ جماتا چلا جاتا ہے۔ یہ خاص رنگ سرسید کے رفقا میں سے کسی کو حاصل نہ ہوا۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ نذیر احمد کے ناولوں کے نام لکھیے۔

2۔ نذیر احمد کا کوئی ایک ناول پڑھیے اور اس کے بارے میں اپنے تاثرات لکھیے۔

17.4.4 نواب محسن الملک

نواب محسن الملک کا سرسید کے خاص رفقا میں شمار ہوتا ہے۔اٹاوہ (اتر پردیش) کے رہنے والے تھے۔انگریزی حکومت میں معمولی ملازمت کرتے ہوئے ڈپٹی کلکٹر تک پہنچے۔اٹاوہ میں ملازمت کے دوران سرسید سے ملاقات' تعارف اور پھر زندگی بھر گہری دوستی و رفاقت قائم ہوگئی۔ کچھ عرصہ حیدرآباد میں رہے۔1893ء میں علی گڑھ آگئے اور سرسید کے سچے معاون بن کر رہے۔سائنٹفک سوسائٹی کے ممبر اور سرسید کے انتقال کے بعد 1899ء میں کالج کے سکریٹری بنائے گئے۔

نواب محسن الملک فکری اعتبار سے اپنے رفقا میں سرسید کے زیادہ قریب تھے اور ان کی کتابیں بھی دراصل ان ہی خیالات کی ترجمان ہیں۔اس

لیے تمام کتابیں مذہبی اور تہذیبی موضوعات پر ہیں۔ ''تہذیب الاخلاق'' پرچہ میں سرسید کے بعد سب سے زیادہ مضامین انہوں نے لکھے۔ ان کے ذریعہ محسن الملک کی ادبی رجحان کی شناخت کی جاسکتی ہے۔ ان کا اندازِ بیان سادہ اور شیریں ہے۔ تمثیل سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کا ایک مضمون تعلیم وتربیت ہے۔ نمونہ کے طور پر اس کا ایک اقتباس دیکھیے۔

> ''ایک روز خیال نے مجھے عالمِ مثال تک پہنچایا..... جب میں عالمِ مثال (وہاں) سے لوٹا اور لوگوں سے یہ قصہ کہا تو وہ سب ایک ایک لفظ کی حقیقت مجھ سے پوچھنے لگے ہیں۔ صرف یہ کہہ کہ باغ ہرا بھرا میں نے مغرب میں دیکھا ہے وہ علوم وفنون جدیدہ کا باغ ہے۔ جس کے پھل پھول اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ پر ہمارا اپنا دل بہلانے والا کوئی وہاں نہیں جس کی ویرانی اور خزاں کی کیفیت ہمارے سامنے ہے وہ پتھر جو سرچشمہ پر آ گیا ہے۔ جہالت ہے، وہ ندی نالے گندے پانی کے رسم رواج کی پابندی ''سیلی'' نما تعصب، علم نما نادانی، جھوٹا زہر، جھوٹی شیخی، جاہلانہ تقلید، عامیانہ علامی، ضرر انگیز حرارت، وحشیانہ تعلیم وتربیت ہے۔ جس کا نتیجہ مسخ انسانیت ہے جو کہ ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جس کا علاج اب ہم سوائے دعا کے کچھ نہیں جانتے۔''

یہ پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ فکر کے ساتھ ساتھ کہنے کا انداز بھی بالکل سرسید جیسا ہے اور مقصدیت غالب ہے۔ لیکن ایسی عمدہ تصویر کشی کی ہے کہ محسن الملک کے اندر کہانی لکھنے کی پوری صلاحیت نظر آتی ہے ان کے دیگر مضامین ''تدبیر وامید'' اور ''عزت'' وغیرہ اہم ہیں جس میں ادبیت بھرپور نمایاں ہے۔ محسن الملک کا مقام اردو ادب میں گرچہ وہ نہیں ہے جو حالؔی اور شبلؔی کا ہے مگر ادب کو نئی جہت اور جدت ادا کرنے میں وہ ان کی صف میں شامل ہوجاتے ہیں۔

17.4.5 دیگر رفقا

سرسید کے دیگر رفقا بھی ہیں جنہوں نے بہت کچھ لکھا مثلاً منشی ذکاءاللہ اور مولوی چراغ علی وغیرہ مگر ان کے موضوعات ادب سے ہٹ کر ہیں۔ منشی ذکاءاللہ مشہور ریاضی داں اور تاریخ نگار تھے۔ یہ بھی ڈپٹی نذیر احمد کی طرح دہلی کالج کے پڑھے ہوئے تھے۔ ڈیڑھ سو سے زائد کتابیں انہوں نے لکھی ہیں۔ تاریخ اور ریاضی سے ہٹ کر مضامین تہذیب الاخلاق میں لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ سرسید کی مجوزہ ورناکلر یونیورسٹی کے معاون ومؤید تھے۔ اردو ذریعہ تعلیم کے حامی منشی ذکاءاللہ نے اپنی زندگی میں محتاط اندازے کے مطابق پچاس ہزار صفحات لکھے ہیں۔ ان میں بعض کتابیں کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔ اگر انہوں نے ادب کو بھی اپنا موضوع بنایا ہوتا تو یقیناً اردو کے نامور ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا۔ چراغ علی نے علمی اور مذہبی کتابیں لکھی ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان پر انہیں زبردست عبور حاصل تھا۔ متعدد کتابیں انگریزی میں بھی ہیں۔ یہ بھی محسن الملک کی طرح فکری اعتبار سے سرسید سے پوری طرح ہم آہنگ تھے۔ اپنی کتابوں میں سرسید کے مذہبی افکار کی ترجمانی کی ہے۔

اردو کے ایک اور بڑے ادیب ہیں جن کا تعلق براہ راست سرسید تحریک سے نہ تھا مگر ادبی اور فکری پہلو سے اس تحریک کا ساتھ دیتے نظر آتے ہیں۔ یہ ہیں مولوی محمد حسین آزاؔد۔ انہوں نے نظم اور نثر دونوں میں خدمات انجام دیں۔ ''انجمنِ پنجاب لاہور'' کے روح رواں یہی تھے۔ اردو شاعری کو فطری اور موضوعاتی بنانے میں اس انجمن کا بڑا ہاتھ ہے۔ حالؔی بھی اس سے وابستہ تھے۔ محمد حسین آزاد کی مشہور کتابوں میں قصصِ ہند، آبِ حیات، نیرنگِ خیال، دربارِ اکبری، سخندانِ فارس، کلام نظم آزاد وغیرہ ہیں۔ آبِ حیات کو زیادہ مقبولیت نصیب ہوئی۔ اردو شعرا کا تذکرہ پہلی مرتبہ اس میں سماجی پس منظر، تاریخی ارتقا اور ادبی شعور کا لحاظ کرتے ہوئے کیا گیا ہے۔

17.5 خلاصہ

ہندوستان کی تاریخ میں 1857ء کی بڑی اہمیت ہے کیوں کہ اس سال ہندوستان کے تمام طبقوں اور قوموں نے مل کر ایک ساتھ انگریزوں کو

ملک سے بھگانے کی آخری کوشش کی جو کہ ناکام ہوئی مگر اس کے بعد ہندوستان کی صدیوں پرانی روایات' سیاست' تعلیم' معاشرت' مذہب اور تہذیب و ثقافت سب کچھ متاثر ہوئیں۔ قدیم و جدید کی کشمکش کھل کر سامنے آ گئی اور یہ کشاکش ہر میدان میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ عمل اور ردعمل دیکھنے کو ملتا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالنے کی بات ہے۔ اب ہر میدان میں پسپا ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ رہنمایانِ قوم نے اصلاحی کوششیں تیز کر دیں۔ ان میں سب سے نمایاں نام یقیناً سرسید کا ہے جنھوں نے اپنے ساتھ بہترین اور باصلاحیت افراد کو لے کر قومی' ملی' تعلیمی اور ادبی خدمات انجام دیں۔ سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قائم کرنا ہے۔ یہ کالج آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں موجود ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنے میں اس یونیورسٹی نے بڑا کام کیا۔ سرسید نے دوسرا بڑا کام تہذیب الاخلاق پرچہ کے ذریعہ معاشرتی اصلاح کا کیا۔ اس میں مسلسل مضامین لکھ کر اور اہلِ قلم حضرات سے لکھوا کر ذہنی اور فکری جمود کو توڑنے کی کوشش کی۔ اس کے لیے انہوں نے ایک پرچہ میں 29 نکات کا پروگرام دیا۔ تیسرا کام یہ کیا کہ سرسید نے اردو ادب کو ایک رجحان اور تخلیقی ادب سے مالا مال کر دیا۔ اپنے مضامین کے ذریعہ موضوع' اسلوب' فکر اور فن تمام چیزوں میں ایک بڑی تبدیلی پیدا کی۔ ادب کے لیے یہ ایک بڑی خدمت ہے۔ شاعری سے دلچسپی نہیں تھی البتہ نثر نگاری میں سرسید کی بڑی خدمات ہیں۔

سرسید کے رفقا نے وقت کے تقاضے کو سمجھتے ہوئے اردو ادب کی ہر اصناف میں جو جو کام کیے ہیں وہ ہمیشہ اہمیت کے حامل رہیں گے۔ الطاف حسین حالؔی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ اردو نظم کو انہوں نے ایک نئی سمت دی اور مسدس حالؔی لکھ کر قوم کو بیدار کیا۔ مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعہ اردو تنقید کی بنیاد رکھی۔ سرسید' غالب اور شیخ سعدی کی سوانح عمریاں لکھیں۔ شبلی نعمانی علی گڑھ کالج میں استاد تھے۔ سرسید کو قریب سے دیکھنے اور ان کے کتاب خانے سے استفادے کا موقعہ ملا۔ زبردست عالم تھے۔ علم الکلام اور فلسفہ کے علاوہ تنقید سوانح نگاری' مضامین' مقالات' تنقید اور شاعری میں کامل دست رس تھی۔ مختلف شخصیات کی متعدد سوانح عمریاں لکھیں۔ سیرۃ النبی بڑی تحقیقی اور مدلل کتاب ہے۔ شعر العجم میں اپنے تنقیدی نظریات پیش کیے۔ سیاسی اور اخلاقی نظمیں بھی کہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد ناولوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ انھیں اردو کے پہلے ناول نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ کل سات ناول لکھے۔ پہلا ناول مراۃ العروس ہے۔ توبۃ النصوح اور ابن الوقت اپنے نفس مضمون کی وجہ سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ نذیر احمد بڑے اچھے خطیب بھی تھے۔ دہلی کی ٹکسالی اور بامحاورہ زبان لکھتے اور بولتے تھے۔ قرآن پاک کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ سرسید کے دور رفقا ایسے تھے جو فکری اعتبار سے ان کی ترجمانی کر رہے تھے۔ ایک محسن الملک دوسرے چراغ علی۔ ان دونوں نے ادبی سے زیادہ مذہبی میدان میں کام انجام دیا ہے۔

اس طرح اگر دیکھا جائے تو سرسید تحریک نے اردو ادب کو جتنا مالا مال کیا ہے شاید ہی کسی اور تحریک نے کیا۔ اس تحریک کی سب سے بڑی اہمیت اس لیے ہے کہ اس نے تاریخ ساز افراد ادب کو دیے۔ چنانچہ ان تاریخ ساز افراد کے تاریخی کارنامے کبھی فراموش نہیں کیے جاسکتے ہیں۔

17.6 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

1۔ علی گڑھ تحریک کا پس منظر بیان کیجیے۔

2۔ سرسید کی تعلیمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

3۔ حالؔی و شبلی میں سے کسی ایک کے ادبی مقام کی نشان دہی کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

1۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کا تعارف کرائیے۔

2۔ سرسید کے ادبی رفقا کی خدمات بتائیے۔

3۔ اردو ادب میں علی گڑھ تحریک کی اہمیت کیوں ہے؟ بیان کیجیے۔

17.7 فرہنگ

الفاظ	معنی
ریشہ دوانیاں	سازش، جوڑ توڑ
استبداد	ظلم و جور
مؤخرالذکر	آخر میں کہی گئی بات
عسکری	فوجی
زعم	غرور، تکبر
استدلال	دلیل، ثبوت
ثقافت	تہذیب، رہن سہن
استطاعت	طاقت، قدرت
بیرونی	باہری
مہلک	ہلاک کرنے والی
خصلت	عادت
حتی المقدور	جہاں تک ہو سکے، ممکن حد تک
فراموش	بھلانا
پیہم	مسلسل
فروغ	ترقی دینا
افادیت	فائدہ پہنچنا
تلمیحات	اشعار میں کسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کرنا
استفادہ	فائدہ اٹھانا
اختصار	مختصر کرنا
مجوزہ	تجویز کی ہوئی چیز
صدیوں	سینکڑوں
کشاکش	رسّہ کشی، کھینچا تانی
رفقا	ساتھ رہنے والے افراد
حامل	بوجھ اٹھانے والا، کسی چیز کو لے جانے والا

17.8 سفارش کردہ کتابیں

1۔	حیاتِ جاوید	الطاف حسین حالؔی
2۔	سید احمد خاں	خلیق احمد نظامی
3۔	سرسید اور ان کے نام ور رفقا	سید عبداللہ
4۔	میرامن سے عبدالحق تک	سید عبداللہ
5۔	مطالعہ سرسید احمد خاں	عبدالحق
6۔	سرسید اور ہندوستانی مسلمان	نورالحسن نقوی
7۔	الطاف حسین حالؔی	صالحہ عابد حسین
8۔	حیاتِ شبلیؔ	سید سلیمان ندوی
9۔	بیسویں صدی میں اردو ناول	یوسف سرمست
10۔	سرسید احمد خاں اور ان کا عہد	ثریا حسین

اکائی 18 اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات

اکائی کے اجزا

18.0 مقصد

18.1 تمہید

18.2 سرسید سے قبل اردو کی ادبی صورت حال

18.3 سرسید کا اثر اردو ادب پر

18.3.1 فکری اثرات

18.3.2 عملی اثرات

18.4 اصنافِ ادب پر اثرات

18.4.1 تاریخ نگاری

18.4.2 سوانح نگاری

18.4.3 ناول نگاری

18.4.4 مضمون نگاری و مقالہ نگاری

18.4.5 اردو شاعری

18.4.6 اردو تنقید نگاری

18.4.7 اردو صحافت

18.5 خلاصہ

18.6 نمونۂ امتحانی سوالات

18.7 فرہنگ

18.8 سفارش کردہ کتابیں

18.0 مقصد

اس اکائی میں آپ اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات کا مطالعہ کریں گے۔ اس مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ اردو اصناف ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

☆ اردو شاعری، ناول، تنقید اور صحافت پر اس کے اثرات کی نشاندہی کر سکیں۔

18.1 تمہید

اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ یہ اثرات اتنے وسیع اور دوررس ہیں کہ ڈیڑھ سو سال گزر جانے کے بعد بھی تازہ دم لگتے ہیں۔ اردو ادب کا وہ کون سا گوشہ ہے جو اس کے اثر سے چھوٹ گیا ہو۔ علی گڑھ تحریک سے قبل اردو کی شناخت شاعری سے تھی۔ نثری ادب پر توجہ اس تحریک نے دی۔ سوانح نگاری، تاریخ نویسی، مضمون نگاری، مقالہ نگاری اور ناول نگاری میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس کے اصول مرتب ہوئے۔ تنقید کی ابتدا ہوئی، صحافت کو فروغ بخشا، ردِعمل کے طور پر طنز و مزاح کی بنیاد پڑ گئی اور رومانوی تحریک نے اپنے بال و پر نکالے۔ ادب کا سائنٹفک و جمالیاتی پہلو سامنے آیا۔ غرض رنگا رنگی کا ایک حسین نمونہ ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس اکائی میں ان تمام اثرات کا جائزہ لیا جائے گا جس کے نتیجہ میں آپ آسانی سے یہ سمجھ جائیں گے کہ علی گڑھ تحریک کے اردو ادب پر کیا احسانات ہیں۔

18.2 سرسید سے قبل اردو کی ادبی صورت حال

برصغیر ہندو پاک میں سرسید سے قبل اردو ادب (شاعری کو چھوڑ کر) کا دائرہ تصوف، مذہب، تاریخ اور تذکرہ نویسی تک محدود تھا۔ مذہبیات میں بھی منقولات اور روایات سے ہی مواد فراہم کیا جاتا تھا۔ مذہب کے صرف ان پہلوؤں پر زور دیا جاتا تھا جو اثباتی زندگی کے بجائے فانی زندگی کی طرف متوجہ کرے۔ یہ ضرور ہے کہ تحریک ولی اللہی نے اقتصادیات اور سیاسیات کے بڑے کارآمد اصول پیش کیے۔ مگر ان کی آواز پر اس وقت توجہ نہیں دی گئی۔ تاریخ بھی سرسری واقعہ نگاری کا دوسرا نام تھا۔ اردو میں تذکرہ نگاری کا بڑا رواج تھا۔ بعض کامیاب تذکرے بھی لکھے گئے۔ مگر تنقیدی اصول سے وہ خالی تھے۔ اردو شاعری میں غزل، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ کی بڑی مستحکم روایت چلی آ رہی تھی مگر یہ شاعری فطری اور افادی کے بجائے صرف شاعرانہ تخیل و کمالات کی محض مظہر تھی اور جہاں تک اردو کی ادبی نثر کا تعلق ہے وہ بھی تصنع، تکلف اور مسجع و مقفیٰ عبارت آرائی پر قلم توڑنے کو ادیب اپنی شان سمجھتا تھا۔ زندگی کے حقائق اور کائنات کے مسائل کی ترجمانی بننے کی صلاحیت اردو نثر میں موجود نہیں تھی۔ فورٹ ولیم کالج کی سلیس نثر، قدیم دہلی کالج کی علمی نثر اور مرزا غالب کی شخصی ادبی نثر نے کچھ کام کیا مگر اس کا دائرہ اثر محدود تھا۔ وہ تو سرسید کی ذات تھی جس نے اردو زبان و ادب کے تنگ دامنی کی شکایت کو دور کر کے نہ صرف اصنافِ ادب میں اضافہ کیا بلکہ ہر زاویہ سے اردو ادب کو متاثر کیا۔

18.3 سرسید کا اثر اردو ادب پر

18.3.1 فکری اثرات

ہمارے اردو ادب میں سرسید ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے تقلید کے بجائے آزادئ رائے کی بنیاد ڈالی جس میں عقل، نیچر، تہذیب اور مادی ترقی

کواہمیت دی گئی۔ سرسید کی فکر کے یہ عناصر ترکیبی حقیقت نگاری' اجتماعیت' عقلیت اور مادیت وغیرہ وہ رجحانات ہیں جن سے اردو کا سارا ادب متاثر ہوا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ترقی پسند تحریک اپنی بیشتر خصوصیات کی بنا پر سرسید کی مادیت' عقلیت اور حقائق نگاری کی ترقی یافتہ شکل معلوم ہوتی ہے۔

سرسید کا یہ فکری رویہ اردو ادب میں تقریباً ہر جگہ موجود ہے۔ مذہبی تصنیفات ہوں کہ تاریخ نگاری یا سوانح نویسی' مضامین مقالے' تنقید اور شاعری' سبھی اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اس تحریک کے زیر اثر لوگ تقلیدی کم اور تحقیقی زیادہ ثابت ہوئے۔ سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھنے اور پرکھنے کا میلان پیدا ہوا۔ یہیں سے سائنٹفک تنقید نگاری کی بھی بنیاد پڑتی ہے۔

18.3.2 عملی اثرات

جیسا کہ کہا جاچکا ہے کہ سرسید سے قبل اردو ادب دنیا کے عمدہ ادب کی صف میں شامل ہونے کے لائق نہیں تھا۔ بلکہ تخلیقی اور صنفی اعتبار سے ادھورا ادب تھا۔ سرسید کی کوششوں سے اردو کے نثری اصناف پر توجہ دی گئی اور شاعری کے رخ کو بدلا گیا۔ ناول' سوانح' خاکہ' مضامین' مقالے' تاریخ نگاری اور تنقید نگاری کا ایک طرح سے آغاز ہوا۔ جدید نظم نگاری کا چرچا ہوا۔ شاعری کے موضوعات بدلے گئے۔ سرسید نے اپنی بیش قیمت تصانیف کے ذریعہ دیگر مصنفوں اور ادیبوں کو وہ خیالات دیے جس سے ادب کی توانا روایت قائم ہوئی۔ ایسا ادب جس میں حقیقت' مقصدیت اور افادیت کا پہلو نمایاں ہو اور جو معاشرے کے لیے سودمند ہو۔ انھوں نے تہذیب الاخلاق پرچہ اسی مقصد سے جاری کیا تھا۔ اس رسالہ میں شائع بیشتر مضامین کے ذریعہ سرسید کی فکر کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اردو ادب کو کیا دینا چاہتے ہیں۔ اور ایسا ہوا بھی۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ سرسید سے قبل اردو ادب کا جائزہ لیجیے؟

2۔ سرسید نے ادب کو کس زاویہ سے دیکھا؟

18.4 اصنافِ ادب پر اثرات

18.4.1 تاریخ نگاری

سرسید کو تاریخ نگاری سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اور یہ ذوق موروثی تھا کیونکہ ان کے اسلاف کا تعلق قلعۂ معلّٰی سے تھا۔ اس بنا پر انہوں نے قدیم تاریخی کتابوں کی تصحیح و اشاعت پر توجہ دی۔ آئین اکبری' تزک جہانگیری اور تاریخ فیروز شاہی کو شائع کرایا۔ دہلی کی یادگاروں اور عمارتوں پر بڑی جانفشانی سے آثار الصنادید نام سے کتاب لکھی۔ اور اس وقت معنی خیز جملہ کہا کہ ''بزرگوں کے قابل یادگار کاموں کو یاد رکھنا اچھا اور برا دونوں طرح کا پھل دیتا ہے۔'' انہوں نے اردو تاریخ نگاری کو متاثر کیا چنانچہ ان کے رفقا میں دو بڑے مورخ شبلی اور منشی ذکا اللہ کو تاریخ لکھنے کا فن بتایا۔ علی گڑھ تحریک نے ہی تاریخ کو اجتماعیت کی روشنی میں پیش کرنے پر اور واقعات کے تاریخی اسباب تلاش کرنے پر زور دیا۔ دوسری اہم بات جس کی طرف توجہ دلائی وہ یہ کہ تاریخ لکھنے کا اپنا اسلوب ہونا چاہیے جو سادگی پر مبنی ہو۔ ہر فن کا اسلوب اور طرز بیان جداگانہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ناول میں تاریخ اور تاریخ لکھتے وقت ناول والا اندازِ بیاں دونوں پر غلط تاثر چھوڑتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ تاریخ کا ایک مادی وجود ہوتا ہے اگر یہ کٹ جائے تو حقیقت افسانے میں بدل جائے گی اور تاریخ' تاریخ نہ رہ کر علم الاساطیر کا درجہ حاصل کرلے گی۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ابن خلدون نے فلسفۂ تاریخ کی بحث میں اس اصول کو واضح کیا ہے مگر یہ

احساس جاتا رہا جس کی بازیافت علی گڑھ تحریک نے کی۔محسن الملک نے تہذیب الاخلاق میں مقدمہ ابن خلدون پر دو تبصرے لکھ کر اس کو مزید واضح کیا تھا۔شبلی، جنہیں اس تحریک نے فن تاریخ کا شعور عطا کیا' اپنے وطن اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی۔اس ادارہ سے وابستہ افراد نے تاریخ پر بیش قیمت کتابیں تحریر کیں۔چنانچہ دارالمصنفین کے کارنامے بھی بالواسطہ علی گڑھ تحریک کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔

18.4.2 سوانح نگاری

سرسید کے رفقائے خاص شبلی اور حالی نے سوانح نگاری کی صنف کو وہ ترقی دی کہ شاید ہی کوئی اسے فراموش کر سکے مگر یہ بات ذہن میں رہے کہ سرسید کو سوانح سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی کیوں کہ وہ شخصیت سے زیادہ قومی مسائل اور تحریکوں پر توجہ دیتے تھے۔سرسید روایات کی اتباع کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔اس لحاظ سے ان کے اندر ایک انقلابی ذہن اور سخت گیر طبیعت کارفرما تھی۔جب کہ سوانح نگاری کے لیے کچھ نہ کچھ عقیدت ضروری ہے۔اس کے باوجود اردو کی سوانح عمری سرسید کی تحریروں سے متاثر رہی۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس دور کی سوانح نگاری قومی ترقی کے مقصد سے فروغ پاتی رہی اور قومی ترقی ہی سرسید کی تحریک کا بنیادی عنصر ہے۔اب مولانا حالی کو دیکھیے ان کی سوانح عمریاں سادہ اور ادبی ہیں مگر قومی خدمت کا جذبہ پوری طرح موجود ہے۔قوم کے لیے انہوں نے ظرافت' خوش طبعی اور زندہ دلی کے عمدہ نمونے پیش کیے۔شبلی کا مرتبہ سوانح نگار کی حیثیت سے حالی سے بڑھا ہوا ہے۔مسلمانوں کی عہد ساز شخصیتوں کی سوانح لکھ کر شبلی نے قوم کو اسے مشعل راہ بنانے کی اپیل کی ہے۔حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل زندگی سیرت النبی کے نام سے قلم بند کرنا شروع کیا مگر زندگی نے وفا نہ کی اور اس کو سید سلیمان ندوی نے تکمیل تک پہنچایا۔

سوانح نگاری میں بھی علی گڑھ تحریک کا دیا ہوا اصول یعنی قومی ترقی اور اصلاح پیش نظر تھا۔اسی کے زیر اثر عبدالحلیم شرر اور عبدالرزاق کانپوری نے بھی سوانح کی صنف میں اضافہ کیا۔بہر حال سرسید نے اردو سوانح نگاری کو کچھ دیا ہو یا نہ دیا ہو مگر انداز نظر تو ضرور دیا۔اس کے سبب اردو سوانح نگاری ادب کی دوسری اصناف کی مانند اپنی شناخت قائم کر سکی۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ آثارالصنادید کی کتاب کس موضوع پر ہے؟

2۔ سرسید نے کس تاریخی کتاب کو مرتب کیا؟

3۔ حالی اور شبلی کی سوانح نگاری کی خصوصیات بتائیے؟

18.4.3 ناول نگاری

اردو ادب کو ناول سے روشناس کرانے کا سہرا بھی علی گڑھ تحریک کے سر جاتا ہے۔اصلاحی نقطہ نظر کو تمثیلی پیرایہ میں لکھنے کا رجحان نذیر احمد کے یہاں فن کا درجہ پایا گیا ہے اور اردو ناول نگاری کے آغاز کا سبب بن گیا۔وہ تمام باتیں جو سرسید بے ڈھب ناصحانہ انداز میں کہتے ہیں نذیر احمد نے انہیں کرداروں کے ذریعہ ادا کروایا اور ان میں زندگی کی حقیقی رمق پیدا کر دی۔اگر چہ زندگی کی یہ تصویریں یک رخی ہیں یعنی کردار سادہ و سپاٹ ہیں لیکن نذیر احمد کے سامنے صرف داستان کا تخیلی اسلوب و کردار ہی تھا۔اس لیے نذیر احمد کی ان خامیوں کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔عبدالحلیم شرر' پنڈت رتن ناتھ سرشار پھر آگے مرزا ہادی رسوا نے ناول کے فن کو عروج بخشا۔

18.4.4 مضمون نگاری و مقالہ نگاری

علی گڑھ تحریک کا ایک فیضان یہ بھی ہے کہ اس نے مضمون نگاری کی ہمت افزائی اور اس کے اولین نمونے اس تحریک نے ہی فراہم کیے۔ ''تہذیب الاخلاق'' نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لندن میں قیام کے دوران سرسید وہاں اسٹیل اور ایڈیشن کے رسائل ''سپیکٹیٹر'' اور ''ٹیٹلر'' سے متعارف بلکہ متاثر ہوئے چنانچہ ہندوستان واپسی پر ''تہذیب الاخلاق'' کا خاکہ وہ لے کر آئے۔ تہذیب الاخلاق میں سرسید کے بعد سب سے زیادہ مضامین محسن الملک کے ملتے ہیں۔ ان حضرات نے زندگی کے تمام مسائل کو اپنا موضوع بنایا اور فرحت بخش و سنجیدہ انداز میں پیش کیا۔ سرسید کے بعض مضامین میں انگریزی ''ایسے'' Essay کے عناصر بھی ملتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد رومانی نثر کو عروج حاصل ہوا تو مہدی افادی، سجاد حیدر یلدرم، وحیدالدین سلیم، عنایت اللہ دہلوی، مقتدیٰ خاں شیروانی محفوظ علی بدایونی اور میر ناصر علی نے مضمون نگاری کو فروغ دیا۔ مضمون کے ساتھ ساتھ تحقیقی مقالات لکھنے کا رواج بھی عام ہوا۔ شبلی، سرسید اور نذیر احمد نے بڑے سنجیدہ اور تحقیقی مقالے لکھے۔

18.4.5 اردو شاعری

اردو شاعری کی پہچان اب تک غزلوں سے تھی۔ نظم نگاری اس وقت تک پورے طور پر ابھر کر سامنے نہیں آئی جب تک سرسید نے اس کی طرف توجہ نہیں دلائی۔ بعد میں مولوی محمد حسین آزاد کی کاوشوں سے ''انجمن پنجاب لاہور'' نے نظم نگاری کی باضابطہ تحریک چلائی۔ سرسید ہر چیز کو اجتماعی اور افادی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ شاعری کے بارے میں بھی ان کا خیال تھا کہ مروجہ شاعری میں فطری جذبات کی کمی ہے۔ اسی لیے محمد حسین آزاد کی مثنوی ''خوابِ امن'' اور حالی کی نظم ''برکھارت'' کی خوب تعریف کی۔ سرسید شاعری میں ردیف و قافیہ کے التزام کو بھی غیر ضروری سمجھتے تھے۔ اس تحریک کا اثر عبدالحلیم شرر کے یہاں پوری طرح عیاں ہے۔ انہوں نے رسالہ ''دلگداز'' میں متعدد ایسی نظمیں شائع کیں جن میں مروجہ قواعد و ضوابط سے انحراف ہے۔

سرسید کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مولوی الطاف حسین حالی سے ''مسدس مدوجزر اسلام'' لکھوائی۔ اس نظم نے مسلم معاشرہ کی اصلاح میں غیر معمولی کام انجام دیا۔ اس کے تعلق سے مولوی عبدالحق نے ایک دلچسپ واقعہ تحریر کیا ہے کہ پنجاب کے ایک دور افتادہ گاؤں میں کسی شادی میں شرکت کی غرض سے ان کا جانا ہوا۔ اس تقریب میں انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ایک شخص مسدس مولانا حالی پڑھتا جاتا ہے اور خود بھی رو رہا ہے دوسروں کو بھی رلا رہا ہے۔ مسدس کی سادگی، سلاست، روانی، قوم کو بیدار کرنے والا مضمون اور شاعر کا خلوص آج بھی دلوں کو گرماتا اور لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ شبلی کی قومی اور سیاسی شاعری میں بھی یقیناً سرسید کا ذہن کارفرما ہے۔ بعد کے اکثر قومی شاعروں نے انہیں بنیادوں پر شاعری کر کے نام کمایا۔ شروع میں اکبر الہ آبادی نے علی گڑھ تحریک کی پرزور مخالفت کی اور اس کے لیے شاعری کو وسیلہ بنایا۔ ایک طرح سے ان کے ذہن اور شاعری دونوں کو علی گڑھ تحریک ہی سے جلا اور روشنی حاصل ہوئی۔ ''مخزن'' میں لکھنے والے اکثر شاعروں کے کلام میں اس تحریک کا اثر نظر آتا ہے اور آگے چل کر اقبال نے سرسید کی سخت کلاسیکیت کے خلاف رومانوی احتجاج کا جھنڈا بلند کیا۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ اردو کے پہلے ناول نگار کون ہیں ان کے ناولوں کی کیا خصوصیات ہیں؟

2۔ اردو مضمون نگاری کے آغاز میں سرسید تحریک کا کون سا رسالہ ہے؟

3۔ اردو شاعری کو اس تحریک نے کس طرح متاثر کیا؟

18.4.6 اردو تنقید نگاری

اردو ادب میں اب تک جانچنے اور پرکھنے کا کوئی متعین اصول نہیں تھا۔ اس تحریک نے پہلی مرتبہ ادب کی ماہیت، ساخت، مقصد اور قاری کی اہمیت کے سلسلے میں آواز بلند کی۔ پہلی مرتبہ ادب میں قاری کے وجود کو تسلیم کیا گیا۔ سرسید کے تنقیدی نظریات ان کے متعدد مضامین میں بکھرے ہوئے ہیں۔ انہوں نے باضابطہ تنقید کی کوئی کتاب نہیں لکھی البتہ ان کے رفقا میں سے حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر اردو تنقید کی بنیاد رکھی۔ شبلی نے بھی ''شعرالعجم'' کے ذریعہ تنقید کو فروغ بخشا۔ علی گڑھ تحریک نے تنقید کے جس نظریے کو فروغ دیا اس میں طرز ادا کے بجائے مرکزی موضوع اور بنیادی مضمون کو اہمیت حاصل ہے۔ یعنی بات کا مفہوم الفاظ میں گم ہونے کے بجائے قاری تک آسانی سے پہنچ جائے۔ اس طرح اس تحریک نے قاری کی اساسی اہمیت کو اجاگر کیا۔ یہ بھی دھیان میں رہے کہ سرسید نے مضمون کے ساتھ انشا کے بنیادی تقاضوں کو بھی مدِ نظر رکھا ہے۔ جسے شبلی اور نذیر احمد نے خوب صورتی سے برتا ہے۔

موجودہ دور میں تنقیدی ادب کا مطالعہ گہرا اور وسیع ہو چکا ہے۔ اس کے مختلف دبستان قائم ہو چکے ہیں مگر شعر و ادب کے تعلق سے علی گڑھ تحریک نے جو کچھ نظریات اور خیالات دیے آج بھی اس کی اہمیت مسلم ہے۔ اور یہی کیا کم ہے کہ تنقیدی شعور کی داغ بیل اسی نے ڈالی۔ تقابلی مطالعہ کا راستہ بھی شبلی نے ''موازنہ انیس و دبیر'' لکھ کر دکھایا۔

18.4.7 اردو صحافت

اردو صحافت نگاری کا آغاز سرسید کے بچپن میں ہو چکا تھا مگر سرسید کے زمانے میں اخباروں کا پیشہ کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ سرسید کے بھائی سید محمد خان دہلی سے ''سیدالاخبار'' نکالتے تھے۔ سرسید نے اپنی صحافتی زندگی کی ابتدا اسی اخبار سے کی۔ غازی پور میں جب انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تو اس کے نام سے اخبار سائنٹفک سوسائٹی بھی جاری کیا۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اس کی بدلی ہوئی شکل تھی۔ ''تہذیب الاخلاق'' کو بھی صحافتی خدمات میں شمار کیا جاسکتا ہے اگرچہ اس میں سنجیدہ اور علمی مضامین ہوتے تھے۔

سرسید کی صحافت میں دو باتیں توجہ کے قابل ہیں۔ ایک اخبار کی دیدہ زیبی، کاغذ کی عمدگی، حروف کی خوب صورتی وغیرہ جو انہوں نے یورپ کے اخباروں سے لی تھی۔ دوسرے اخبارات میں بے خوف آزادیٔ رائے جس میں تعمیری پہلو نمایاں ہوتا تھا۔ یہ وہ چیز تھی جو بعد میں ذرائع ابلاغ سے رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئی۔ بعد میں ملک کے حالات بدل گئے۔ تحریک آزادی جڑ پکڑ چکی تھی تو ''الہلال'' ''البلاغ'' ''زمیندار'' ''دبدبہ سکندری'' وغیرہ اخباروں نے اردو کی صحافتی دنیا کو مالا مال کیا۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ اردو تنقید کی کون سی کتاب حالی نے لکھی ہے؟

2۔ شعرالعجم کے مصنف کا نام بتایئے؟

3۔ سائنٹفک سوسائٹی کہاں قائم ہوئی؟

18.5 خلاصہ

علی گڑھ تحریک اردو نشاۃ ثانیہ کی تحریک تھی اس سے پہلے صرف زبان کی ساخت و پرداخت پر زور دیا جاتا تھا۔ اس نے لفظ کے حسن کو اجاگر

کرنے کے بجائے روح اور معنی کو اہمیت دی۔علی گڑھ تحریک سے قبل اردو ادب کا بیشتر تخلیقی ادب صرف شاعری کے اصناف کا احاطہ کرتا تھا۔علی گڑھ تحریک نے نثر کی اصناف کو بھی فروغ بخشا۔اس نے مشرق و مغرب کے فکری سرچشموں کو ملا کر اردو ادب کو مغرب کے برابر لانے کی کوشش کی۔اس طرح سرسید نے جدید مغربی خیالات کو قبول کرنے کے لیے ذہن کو آمادہ کیا۔اردو میں کئی اصناف سے متعارف اسی تحریک نے کرایا اور پہلے سے موجود اصناف کی اصلاح کی۔اس کا تصور بالکل واضح تھا۔ابہام نام کی کوئی چیز نہ تھی۔اردو ادب کو اس نے مالا مال کر دیا۔ادب کا کون سا وہ شعبہ ہے جو اس سے متاثر نہیں ہے۔بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اردو کی بعد کی تمام تحریکیں علی گڑھ تحریک کا عکس لیے ہوئے ہیں۔اردو کیا کسی اور زبان کی شاید ہی کوئی ایسی تحریک ہو جس نے ادب اور زندگی دونوں کو اتنا متاثر کیا ہو جتنا کہ علی گڑھ تحریک نے کیا۔

18.6 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

1۔ اردو ادب پر سرسید کے فکری اور عملی اثرات کا جائزہ لیجیے۔

2۔ مختلف اصناف ادب پر علی گڑھ تحریک کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ بیان کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

1۔ سرسید سے قبل اردو کی ادبی صورتحال کیا تھی؟

2۔ اردو شاعری کو علی گڑھ تحریک نے کس طرح متاثر کیا؟

3۔ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اردو تنقید میں کیا تبدیلی رونما ہوئی؟

18.7 فرہنگ

الفاظ	معنی	الفاظ	معنی
مظہر	عکس	توانا	مستحکم
افادیت	سودمند، فائدہ مند	موروثی	خاندانی
بازیافت	تلاش	واضح	کھلا ہوا
وابستہ	منسلک	اتباع	کسی کے طریقہ کو اپنانا
تمثیل	مثالیں	مروّجہ	رائج شدہ
التزام	ضرور برتا گیا	ماہیت	شکل وصورت
داغ بیل	بنیاد	ابہام	غیر واضح

18.8 سفارش کردہ کتابیں

1۔	اردو ادب کی تحریکیں	انور سدید
2۔	سرسید اور ان کے نامور رفقا	سید عبداللہ
3۔	سید احمد خان	خلیق احمد نظامی
4۔	مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالؔی
5۔	افاداتِ سلیم	وحید الدین سلیم
6۔	مقالاتِ سرسید	
7۔	مقالاتِ شبلی	

اکائی 19 ترقی پسند تحریک: پس منظر

اکائی کے اجزا

19.0 مقصد

19.1 تمہید

19.2 ترقی پسند تحریک کیا ہے؟

19.3 ترقی پسند تحریک کا پس منظر

19.4 ترقی پسند تحریک کا آغاز وارتقا

19.5 خلاصہ

19.6 نمونۂ امتحانی سوالات

19.7 فرہنگ

19.8 سفارش کردہ کتابیں

19.0 مقصد

اس اکائی میں آپ ترقی پسند تحریک کے بارے میں مطالعہ کریں گے۔ یہ مطالعہ آپ کو ترقی پسند تحریک سے متعارف کرائے گا اور ساتھ ہی اس کے پس منظر اور آغاز وارتقا سے متعلق معلومات فراہم کرے گا۔ اس مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

- ☆ ترقی پسند تحریک سے اپنی واقفیت کا اظہار کر سکیں۔
- ☆ اس کے پس منظر کے بارے میں بیان کر سکیں۔
- ☆ اس کے آغاز وارتقا کے تعلق سے گفتگو کر سکیں۔

19.1 تمہید

اردو ادب میں جو چند ادبی تحریکیں رونما ہوئی ہیں ان میں سب سے کامیاب تحریک ترقی پسند تحریک سمجھی جاتی ہے جس نے ادب کو زندگی کے حقائق سے قریب کیا۔ 1936ء میں اس تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اردو کے معروف شاعروں، ادیبوں نے اس تحریک کی سرپرستی کی۔ اس اکائی میں ہم یہ

جاننے کی کوشش کریں گے کہ آخر یہ تحریک کیا ہے؟ اس تحریک کا پس منظر کیا ہے؟ اور اس کا آغاز وارتقا کے مراحل کیا رہے ہیں؟

19.2 ترقی پسند تحریک کیا ہے؟

تحریک عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ''کسی بات کو شروع کرنے'' کے ہیں۔ اصطلاحاً کسی مقصد کے حصول کے لیے جب افراد کا گروہ کوشش کرتا ہے تو اسے تحریک کہتے ہیں، خواہ اسے کسی بھی حد تک کامیابی حاصل ہو۔ ترقی پسند تحریک بھی ظاہر ہے کہ ایک تحریک ہے اور اس تحریک کے مخصوص مقاصد میں غریبوں کو ان کا حق دلانا، عدم مساوات کے خلاف آواز بلند کرنا، انسان دوستی اور آزادیٔ ہند کی کوشش شامل تھی۔ گویا ادب کو گل و بلبل اور کنگھی چوٹی سے بالاتر کر کے اسے مقصدیت سے ہم آہنگ کرنا تھا۔ ترقی پسند تحریک کی بنیاد لندن میں رکھی گئی۔ 1930ء میں لندن میں چند ہندوستانی طالب علموں نے اپنے ملک کے سیاسی وسماجی حالات کے تناظر میں انسانیت کی خدمت کا خواب دیکھا اور انفرادی طور پر سعی وجستجو کرنے کے بجائے اجتماعی طور پر تمام زبانوں کے تخلیق کاروں کو ہمراہ لے کر ہندوستانیوں کو پستی، غلامی، مظلومی اور استحصال سے آزاد کرانے کا عزم کیا۔ اس تحریک سے متعلق اور اس کے نظریوں سے اتفاق رکھنے والے ادیبوں نے اپنی اپنی زبان کے ادب میں ترقی پسند خیالات کی تبلیغ وتشہیر کی اور اس طرح اس تحریک نے پورے ہندوستان میں اور ہندوستان کی بیشتر زبانوں میں اپنے وجود کا احساس دلایا۔ دراصل ترقی پسند تحریک کا بنیادی مقصد ادب کے وسیلے سے ''انسانیت کا نشاۃ ثانیہ'' تھا۔ اس تحریک کا باقاعدہ آغاز اپریل 1936ء میں لکھنؤ میں منعقدہ اس کانفرنس سے ہوتا ہے جس کی صدارت شہرہ آفاق ادیب منشی پریم چند نے کی تھی۔ اردو کے معروف ادیبوں اور شاعروں نے اس تحریک کی سرپرستی کی جن میں منشی پریم چند، مولوی عبدالحق، مولانا حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، سید سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، ملک راج آنند، عزیز احمد وغیرہ شامل تھے۔ اس کانفرنس کے بعد ہی اس تحریک نے اپنی منظّم صورت اختیار کی اور مختلف زبان کے ادیبوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل ڈالی۔ یہ تحریک اس دور میں اس حد تک اثر انداز ہوئی کہ پرانے اور تجربہ کار قلم کاروں کے ساتھ ساتھ ہر نیا لکھنے والا اس تحریک سے خود کو وابستہ کرنے میں فخر محسوس کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے بعد یعنی بیسویں صدی کی چوتھی پانچویں دہائی میں ترقی پسندی نے فیشن کی صورت اختیار کر لی تھی لیکن 1950ء کے بعد تحریک میں ایک طرح کا جمود آ گیا جو کہ آزادی ہند اور تقسیم ہند کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ تحریک میں ازسرنو زندگی پیدا کرنے کی کوشش بھی کی گئی لیکن اسے عروج نو حاصل نہ ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جدیدیت سر اُبھارنے لگی تھی۔ جدیدیت کی تحریک کو بھی اُردو ادب کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ تحریک کے لغوی معنی کیا ہیں؟

2۔ ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز کب ہوا؟

3۔ ترقی پسند تحریک کی لکھنؤ جلسے کی صدارت کس نے کی تھی؟

19.3 ترقی پسند تحریک کا پس منظر

ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز سے قطع نظر اگر ہم غور کریں تو محسوس ہوگا کہ اس تحریک کا خمیر بہت پہلے سے تیار ہو رہا تھا۔ لندن میں ہندوستان کے کافی طلبہ تعلیم کی غرض سے مقیم تھے۔ ان طلبہ کا گرچہ ہندوستان کے مختلف خطوں سے تعلق تھا اور ان کی مادری زبانیں بھی مختلف تھیں لیکن نظریاتی طور پر ان میں ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔ ہندوستان میں غریبوں اور مجبوروں پر ہونے والے مظالم کی خبریں ان تک پہنچتی رہتی تھیں اور ان میں

برطانوی حکومت اور سرمایہ دار طبقہ کے خلاف غم وغصہ بڑھتا جاتا تھا۔لہٰذا ہندوستانی نوجوانوں نے جن میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گھوش، محمد دین تاثیر اور پرمود سین گپتا وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ''انڈین پروگریسیو رائٹرس اسوسی ایشن'' قائم کی۔پھر اس کا اعلان نامہ تیار کیا گیا جس میں کہا گیا کہ'' ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے نئے ادب کو ہماری موجوہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہیے اور وہ ہے ہماری روٹی کا' بدحالی کا' ہماری سماجی پستی کا اور سیاسی غلامی کا سوال'' (یعقوب یاور' ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری ص۔55-54)

اس کے علاوہ اسی اسوسی ایشن نے ایسی تجاویز بھی پیش کیں جن کی بنیاد پر ادیبوں کو اور اس اسوسی ایشن کو آگے کی کارروائی کرنی تھی۔مثلاً ''ہندوستان کے مختلف لسانی صوبوں میں ادیبوں کی انجمنیں قائم کرنا' ان انجمنوں کے درمیان جلسوں اور پمفلٹوں وغیرہ کے ذریعے ربط وتعاون پیدا کرنا۔صوبوں کی' مرکز کی اور لندن کی انجمنوں کے درمیان تعلق پیدا کرنا' ترقی پسند ادب کی تخلیق اور ترجمہ کرنا جو صحتمند اور توانا ہو' جس سے ہم تہذیبی پسماندگی کو مٹا سکیں اور ہندوستانی آزادی اور سماجی ترقی کی طرف بڑھ سکیں'' وغیرہ۔اس گروپ نے اپنی پہلی باقاعدہ میٹنگ لندن کے ایک چینی ریستوران ''نان کنگ ریستوران'' میں کی جس میں ملک راج آنند کو صدر منتخب کیا گیا۔یہ لوگ پیرس میں منعقدہ World congress of the writers for the defence of culture سے بھی کافی متاثر ہوئے۔اس کانفرنس میں میکسم گورکی' ویلڈ وفرینک' آندرے مارلو' برتول بریخت' ای ایم فاسٹر' لوئی آراگان' بورس پاسترنک اور رومین رولاں جیسے ممتاز ادیبوں نے شرکت کی تھی اور انہوں نے جو تجاویز منظور کی تھیں ان میں انسانیت کی بالادستی اور مظالم کی سرکوبی کے عزائم کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔پوری دنیا کے ادیبوں کو متحد کرنے کی یہ ایک بہت بڑی اور کامیاب کوشش تھی۔اس کانگریس سے انڈین پروگریسیو رائٹرس اسوسی ایشن کے ارکان کو اپنے مقاصد کو تیزی سے عملی جامہ پہنانے کی ترغیب ملی اور انہوں نے اپنی کوشش لندن کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی شروع کردی۔اُنہوں نے اپنے ''اعلان نامے'' کو ہندوستان کے اہم ادیبوں تک پہنچایا۔پریم چند نے اس کی زبردست حمایت کرتے ہوئے اسے اپنے رسالے ''ہنس'' میں شائع کر دیا۔مجموعی طور پر پورے ملک میں اس اعلان نامے کا خیر مقدم کیا گیا۔1935ء کے آخر میں سجاد ظہیر ہندوستان واپس آگئے۔انہوں نے مختلف علاقوں اور مختلف زبانوں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں سے رابطہ قائم کیا۔اس سے پہلے ''انگارے'' کے افسانوں نے ماحول کو کافی گرم کر دیا تھا جس کے مصنفین میں سجاد ظہیر' احمد علی' محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں شامل تھے۔ان میں سے موخرالذکر تین ادیبوں نے ہندوستان میں ترقی پسند نظریات کی تبلیغ سجاد ظہیر کی آمد سے پہلے ہی شروع کردی تھی۔اندرون ہندوستان اور لندن میں کی گئی تمام جدوجہد کا نقطہ عروج اپریل 1936ء میں لکھنؤ میں منعقدہ ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کی صورت میں سامنے آیا۔

اِس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک کا خمیر دو عوامل سے تیار ہوا۔اول تو لندن میں زیر تعلیم ہندوستانی نوجوانوں کی فکر اور دوم ہندوستان میں ''انگارے'' کی اشاعت۔یہ دو ایسے عوامل تھے جس نے ترقی پسند تحریک کی راہیں ہموار کیں۔اِن کے علاوہ یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ ہندوستان میں بیداری کی تحریکیں ایک زمانے سے جاری تھیں۔شاہ محدث دہلوی کی تحریک' وہابی تحریک' راجہ رام موہن رائے کی تحریک اور پھر سرسید کی علی گڑھ تحریک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اِسی درمیان آزادی کی تحریک بھی شروع ہوگئی اور نہ صرف اندرون ہندوستان بلکہ پوری دُنیا سے اس کی حمایت کی جانے لگی۔دراصل ہندوستانی عوام میں ایک نئی صبح کی تلاش کی جستجو تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔گرچہ ہندوستان میں انگریزوں نے ایسے کئی کام کیے جو ہندوستانیوں کے حق میں تھے اور سماجی سطح پر اُن کی اصلاح ہوئی۔اُنہوں نے مقامی حکومتوں کے تسلط کو کمزور کرایا' ستی اور اُس طرح کی اندھی عقیدت والی کئی رسومات کا خاتمہ کیا' جوٹ کے مل اور سوت کا کارخانے لگائے جہاں ہزاروں مزدوروں کو روزی روٹی کا سہارا ملنے لگا مگر غلامی سے نجات کا لاوا پکتا گیا اور وہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ قومی بیداری کا جذبہ تیز ہوتا چلا گیا۔ہندوستان کی تحریک آزادی میں شروع ہی سے دو طرح کے نظریے کام کر رہے تھے۔ایک گرم رویہ تھا

اور دوسرا نرم۔ گرم رویے والوں کا ماننا تھا کہ آزادی کسی بھی طرح سے حاصل کر لینی ہے۔ اس کے لیے خون دینا بھی پڑ سکتا ہے اور خون بہانا بھی پڑ سکتا ہے۔ اس گروپ کے مشہور نام آربندو گھوش، بپن چندر پال، لالہ لاجپت رائے اور بال گنگا دھر تلک وغیرہ تھے۔ نرم رویے والوں کا خیال تھا کہ آزادی ستیہ گرہ اور بھوک ہڑتال وغیرہ کے ذریعہ یعنی امن وامان سے تحریک چلاتے ہوئے حاصل کی جائے۔ اس کا سب سے مضبوط طریقہ بات چیت اور افہام و تفہیم کو قرار دیا گیا۔ گاندھی جی اس میں پیش پیش تھے۔ بہرحال دونوں ہی نظریوں کا مقصد حصول آزادی تھا لہٰذا پورے ملک میں آزادی کی تمنا جاگ اُٹھی اور گاؤں گاؤں، قریوں قریوں سے آزادی کی مانگ ہونے لگی۔ کہیں ہندوستانی جھنڈے لگا دیے جاتے تو کہیں برطانی جھنڈے جلا دیے جاتے۔ کہیں نعرے لگائے جاتے تو کہیں قومی گیت گائے جاتے۔ غرضیکہ پورا ملک عملی یا نظری طور پر تحریک آزادی میں شریک ہو گیا تھا۔ ہندوستان میں پہلی جنگ عظیم 1914ء کا بھی اثر ہوا۔ اِس تعلق سے ایک مضمون لکھنے پر بال گنگا دھر تلک کو چھ سال کی جیل ہوگئی۔ ملک کے سوت کارخانوں میں ہڑتالیں ہونے لگیں۔ اسی دوران جلیانوالہ باغ کا واقعہ پیش آ گیا جو ہندوستانیوں کو بہت گراں گزرا۔ جنرل ڈائر نے ہزاروں نہتے ہندوستانیوں پر گولی چلوا دی۔ 1917ء میں انقلاب روس نے بھی ہندوستانیوں کے جذبے کو مہمیز کیا اور لوگ ایک آزاد ملک کا خواب دیکھنے لگے۔ قومی اور عالمی دونوں ہی سطحوں پر یہ دور شکست و ریخت اور کش مکش کا دور تھا۔ ہندوستان کا ہر طبقہ اس سے متاثر تھا۔ دانشور طبقہ اور ادیب حضرات بھی اس کا اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ اور پھر جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ لندن میں موجود ہندوستانی طلبہ نے میٹنگ کی اور بتدریج اُس آگ نے پورے ہندوستان کے ادیبوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند تحریک کا مطالعہ اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ اس کی محرک وہ قوتیں ہیں جنھوں نے اُردو بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کو بھی کافی حد تک متاثر کیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کا اثر دنیا کی چھوٹی بڑی تمام زبانوں پر پڑا ہے۔ تاریخ کے کسی زمانے میں کم ایسی عالمگیر قوتیں برسرِ کار آئی ہوں گی جن سے انسانی سرگرمی اور کارکردگی اتنی متاثر ہوئی ہو جتنی کہ اس ترقی پسند تحریک سے جو بحیثیت مجموعی اشترا کی نقطۂ نظر کی تائید اور ترجمانی کرتی ہے۔
>
> اُردو ہندوستان کی سب سے نوعمر زبانوں میں ہے، اس اعتبار سے اس کا ترقی پسند ہونا فطری ہے لیکن اس کا ربط اور رشتہ بڑی قدیم اور وقیع زبانوں اور روایات سے بھی ہے اس لیے یہ قدیم کی بھی اتنی ہی گرفت میں ہے۔ ایسی زبان پر ایک ایسی عالمگیر تحریک کا کیا اثر ہوگا اور اس کے کیا نتائج ہوں بڑا اہم مطالعہ ہے۔''
>
> (تعارف، اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک از ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی)

ہندوستانی تناظر میں دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تحریک بیک وقت ادبی اور سماجی دونوں سطحوں پر کام کر رہی تھی۔ ادیبوں نے ادب کی ادبیت کو ہمیشہ اولیت دی ہے تاہم پہلے ادیب حضرات ادب کے ذریعے اخلاقی اصلاح کی کوشش کرتے تھے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر قلمکاروں نے سماجی انصاف اور مساوات کے پیغام کو بھی عام کرنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی اپنی معروف کتاب اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک کے ''مقدمہ'' کا آغاز اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''علی گڑھ تحریک کے بعد ترقی پسند ادبی تحریک دوسری شعوری تحریک تھی جس کے زیر اثر ہمارے ادب کو بعض بڑی تبدیلیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ جن لوگوں نے اُردو ادب کے مختلف شعبوں کا توجہ سے مطالعہ کیا ہے اور زمانۂ حال کے ادبی رجحانات کو اپنی تحقیق وتنقید کا موضوع بنایا ہے، ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ ہماری زبان میں شعر وادب کا ایک متعدبہ

ذخیرہ اس تحریک کی پیداوار ہے۔ ترقی پسند مصنفین کے نام سے ہمارے ملک میں جو تحریک 1935ء میں شروع ہوئی اس کی یہ خصوصیت نظر میں رکھنے کی ہے کہ یہ پہلی ادبی تحریک تھی جس نے نہ صرف یہ کہ پورے ملک کے ادیبوں کو ایک نظریاتی رشتے میں منسلک کرنے کی کوشش کی بلکہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی اتحاد و اشتراک کا ایک وسیلہ بن گئی۔ اُردو زبان میں اس تحریک کے نظریاتی ارتقا اور اس کے ادبی سرمائے کے تحقیقی و تنقیدی مطالعے کو اپنا موضوع بنانا اُردو ادب کے ایک اہم دور کی تاریخ مرتب کرنا ہے۔''

ترقی پسند تحریک کے پس منظر کے بیان کے دوران آپ کو ''انگارے'' کے بارے میں بھی علم ہوا۔ آیئے ہم یہ جانتے ہیں کہ ''انگارے'' میں وہ کیا بات تھی کہ اُس نے اُس عہد کے ادب میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ لوگوں نے اُسے ایک انتہائی بے خوف آواز قرار دیا اور اُس نے بعد کے اُردو فکشن کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ ''انگارے'' کی اشاعت 1932ء میں ہندوستان کے شہر لکھنؤ میں عمل میں آئی۔ اس میں چار افسانہ نگاروں کی 9 کہانیاں شامل تھیں۔ پانچ کہانیاں سجاد ظہیر کی، دو احمد علی کی، ایک رشید جہاں اور ایک محمود الظفر کی۔ آخر میں رشید جہاں کا ایک ڈرامہ بھی شامل کتاب تھا یعنی کتاب دس تخلیقات پر مشتمل تھی جس کے محرک، مرتب اور ناشر خود سجاد ظہیر تھے۔ ممتاز ترقی پسند ادیب پروفیسر قمر رئیس نے اپنے مضمون ''اُردو افسانہ میں انگارے کی روایت'' (مشمولہ تلاش و توازن) میں لکھا ہے کہ:

''اگر یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ ''انگارے'' کی اشاعت ہی ترقی پسند تحریک کی بشارت اور اس کا پہلا غیر رسمی اعلان نامہ تھی۔ بوسیدہ عقیدوں، فرسودہ اداروں، سماج دشمن طاقتوں اور مجہول سماجی و اخلاقی قوانین کے خلاف اس کی بغاوت ایک نئی انقلابی فکر کے طلوع کا پیغام تھی۔ امیروں، حاکموں اور اہل اقتدار کے مقابلے میں زیردستوں، ناداروں، مجبوروں اور محکوموں کی حمایت ادب میں ایک ایسے دور کی آمد کا اعلان تھی جب تخلیقی ادب کی بنیاد طبقاتی شعور اور اشتراکی انسان دوستی پر رکھی جانی تھی۔ موضوع، مواد اور فن کے نئے تجربے تخلیقی اظہار کے ان بے شمار نئے سانچوں کی جستجو کی علامت تھے جسے ترقی پسند افسانہ نگاروں کے ہاتھوں نقطہ کمال تک پہنچنا تھا۔''

قمر رئیس نے انگارے کو ترقی پسند تحریک کی بشارت قرار دیا ہے یعنی اس مجموعے نے تحریک کے لیے پس منظر اور ماحول تیار کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ''انگارے'' کی زبان، بے باکانہ انداز، مواد، حاکم طبقے پر راست حملے اور مذہب کے تعلق سے کھل کر بات کرنے کے سبب اِس پر کافی اعتراضات کیے گئے۔ اس کے خلاف بے شمار مضامین لکھے گئے اور اسے ضبط کر لینے کی مانگ کی گئی۔ نتیجے کے طور پر اگلے ہی سال کتاب پر حکومت کی طرف سے پابندی لگا دی گئی۔ جہاں جہاں کتاب پہنچی تھی، حتی الامکان وہاں سے اُٹھا لی گئی اور جہاں اس کا اسٹاک تھا وہاں اُسے نذر آتش کر دیا گیا۔

اُمید ہے کہ اب آپ ترقی پسند تحریک کے پس منظر سے واقف ہو چکے ہوں گے۔ اب آگے آپ سے اس تحریک کے آغاز و ارتقا کے تعلق سے باتیں ہوں گی۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے:

1۔ ''اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' کے مصنف کا نام بتایئے؟

2۔ ''انگارے'' کی اشاعت کب اور کہاں عمل میں آئی؟

3۔ روس میں انقلاب کب آیا؟

4۔ پہلی جنگ عظیم کب ہوئی؟

19.4 ترقی پسند تحریک کا آغاز وارتقا

ترقی پسند تحریک کا با قاعدہ آغاز اپریل 1936ء کی اس کانفرنس سے ہوتا ہے جس کی صدارت پریم چند نے کی تھی۔ پریم چند نے اپنے صدارتی خطبے میں ادب کی غرض وغایت بیان کی' ادیبوں کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور اس جلسے کو'' ادب کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ'' قرار دیا۔اس خطبے میں انہوں نے کہا کہ:

> '' ہم اپنے آپ کو ہندوستانی تہذیب کی بہترین روایات کا وارث سمجھتے ہیں اور ان روایات کو اپناتے ہوئے ہم اپنے ملک میں ہر طرح کی رجعت پسندی کے خلاف جدوجہد کریں گے اور ہر ایسے جذبے کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہترین زندگی کی راہ دکھائے۔''

انہوں نے ادیبوں اور فنکاروں کے لیے حسن و جمال کی بدلتی ہوئی معنویت' بدلتے ہوئے حالات اور عصری حسیت کے تناظر میں ادب کی تعریف بھی پیش کی ہے۔اس کانفرنس میں شرکت کرنے والوں میں پریم چند کے علاوہ چودھری محمد علی ردولوی' سید سجاد ظہیر' احمد علی' فراق گورکھپوری' محمود الظفر' حسرت موہانی' جوش ملیح آبادی' ساغر نظامی اور بنگال' مہاراشٹر' گجرات اور مدراس وغیرہ کے نمائندے شامل تھے۔اسی کانفرنس میں سجاد ظہیر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری منتخب کیے گئے۔

لکھنؤ کانفرنس کی خاطر خواہ کامیابی کے بعد مختلف شہروں میں انجمن کی کانفرنسیں منعقد ہوئیں اور اس کی شاخوں کا قیام عمل میں آیا۔دہلی' ممبئی' کلکتہ' بھیمڑی' حیدرآباد' الہ آباد' لکھنؤ' جے پور' رانچی وغیرہ میں بتدریج کانفرنسیں اور سمینار ہوتے رہے۔بے شمار شاعر وادیب اس تحریک سے وابستہ ہوئے۔اور اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے بے لوث خدمات انجام دیں۔جس کے سبب اس تحریک نے تنظیمی وعلمی سطح پر ارتقائی منازل طے کیں اور بیسویں صدی کی سب سے کامیاب تحریک بن گئی۔

لیکن جس طرح دن کے بعد رات اور شام کے بعد صبح ہونا فطری امر ہے اسی طرح عروج کے بعد زوال بھی لازمی ہے۔اس تحریک کا آغاز ہوا' عروج ہوا۔اس نے نسلوں کو متاثر کیا۔ادب کی فضا پر آسمان کی طرح سایہ فگن ہوگئی اور پھر رفتہ رفتہ تحلیل ہوگئی۔یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ 1947ء کے بعد جو تحریکیں' جو ادارے تعطل اور انتشار کے شکار ہوئے ان میں ترقی پسند تحریک بھی کافی اہم ہے۔اس تحریک کے روح رواں سید سجاد ظہیر ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔بعض ادیب وشاعر نہیں رہے اور اسی طرح چھٹے دہے میں ہی نظریاتی اعتبار سے اس تحریک میں بکھراؤ کے آثار نظر آنے لگے۔1948ء کے بعد رندوے کی قیادت میں کمیونسٹ پارٹی جس دارو گیر کا شکار ہوئی اس کی وجہ سے بہت سے ادیب انجمن ترقی پسند مصنفین سے الگ ہوگئے۔آزادی کے بعد خود ترقی پسند مصنفین نے ایک نئے قرارداد کے ذریعے غیر کمیونسٹ ادیبوں پر انجمن کے دروازے بند کر دیے۔انجمن اور تحریک کو نقصان پہنچانے میں اس واقعہ نے سب سے اہم رول ادا کیا۔اس تحریک کو پروپگنڈہ اور نعرے کا نام بھی دیا گیا۔بعض ادیب وشاعروں نے جب یہ محسوس کیا کہ یہ تحریک پروپگنڈہ بن گئی ہے اور اس سے ادب مجروح ہو رہا ہے تو انہوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔اس طرح آٹھویں دہائی کے آتے آتے ترقی پسند تحریک تحلیل ہو چکی تھی اور جدیدیت پوری طرح سے سر ابھار چکی تھی۔واضح رہے کہ یہاں تحلیل کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ تحلیل ہونے والے

مادے کا وجود گرچہ بظاہر ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کی کوئی نہ کوئی صورت اور اس کی اثر انگیزی باقی رہتی ہے۔ یہ تحریک آج بھی زندہ ہے اور اس سے نظریاتی طور پر وابستہ ادیبوں کی خاصی تعداد بھی موجود ہے۔ یوں بھی انسان دوستی کا نظریہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ مظلوم و بے کس کی حمایت کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ ظالموں اور استحصال کرنے والوں کے خلاف آواز ہمیشہ اُٹھتی رہے گی۔ شاعر اور ادیب ہمارے سماج کا سب سے حساس طبقہ ہے۔ معاشرے میں ہونے والی کوئی ناانصافی اُنہیں پریشان کر دیتی ہے اور اپنی پریشانی اور بے چینی کا اظہار اپنی تحریروں کے ذریعے کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ گرچہ آج ترقی پسند تحریک کی پہلے جیسی باقاعدہ شکل باقی نہیں ہے لیکن اُس کے پیغامات کو پھیلانے والے ادیب ہر دور میں موجود رہیں گے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ ''ہم اپنے آپ کو ہندوستانی تہذیب کی بہترین روایات کا وارث سمجھتے ہیں۔'' کس نے کہا؟

2۔ ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس میں شرکت کرنے والے کسی دو ادیبوں کے نام بتائیے۔

3۔ کیا ترقی پسند تحریک کی کانفرنس بھیمڑی میں بھی منعقد ہوئی تھی؟

19.5 خلاصہ

ترقی پسند تحریک کی بنیاد لندن میں رکھی گئی۔ یہ 1930ء کی بات ہے۔ اس وقت ہندوستان کے چند نوجوان تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے لندن گئے ہوئے تھے۔ ان نوجوانوں میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، محمد دین تاثیر، پرمود سین گپتا، جیوتی گھوش تھے۔ انہوں نے پہلی بار ملک کے سیاسی و سماجی حالات کے تناظر میں انسانیت کی خدمت کا خواب دیکھا اور انفرادی طور پر سعی و جستجو کرنے کے بجائے اجتماعی طور پر اور تمام زبانوں کے تخلیق کاروں کو ہمراہ لے کر ہندوستانیوں کو پستی غلامی، مظلومی اور استحصال سے آزاد کرانے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے کوشش کی۔ اس گروہ نے انڈین پروگریسیو رائٹرز ایسوسی ایشن بنائی، بعد میں مینی فیسٹو بنایا اور ہندوستان میں باقاعدہ ماحول تیار کیا۔ اِس ماحول کا خمیر عالمی سطح پر ہونے والی شکست و ریخت سے بھی تیار ہوا جن میں انقلاب روس اور پہلی جنگ عظیم شامل ہیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کی ظلم و زیادتی اور ملک کی تحریک آزادی نے بھی ترقی پسند ذہن کو فروغ دیا۔ 1932ء میں سجاد ظہیر کے شائع کردہ دس تخلیقات پر مشتمل اُس مجموعے نے بھی ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھ دی تھی جس کا نام ''انگارے'' تھا۔ اُس میں شامل 9 افسانے اور ایک ڈرامے نے ادیبوں کی ذہن سازی کی۔ البتہ اپریل 1936ء میں اس تحریک کا باقاعدہ آغاز ایک یادگار اور تاریخی کانفرنس سے ہوا جس میں پریم چند نے صدارتی خطبہ دیا۔ اس کانفرنس کے بعد ہی اس تحریک نے اپنی منظّم صورت اختیار کی اور معروف شاعروں، ادیبوں نے اس کی سرپرستی کی۔ ان میں پریم چند، مولوی عبدالحق، حسرت موہانی، جوش، فراق، فیض، سجاد ظہیر، محمد حسن، قمر رئیس وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

الہٰ آباد، حیدرآباد، لکھنؤ، جے پور رانچی وغیرہ میں بتدریج کانفرنسیں اور سمینار ہوتے رہے۔ اور اس طرح اس تحریک نے تنظیمی و علمی سطح پر ارتقائی منازل طے کیں اور بیسویں صدی کی سب سے کامیاب تحریک بن گئی۔ لیکن 1947 کے بعد یہ تحریک تعطل اور انتشار کی شکار ہوگئی اور آٹھویں دہائی کے آتے آتے یہ تحریک تحلیل ہو چکی تھی۔ البتہ تحریک کے اثرات اور اُس کے پیغامات اب بھی باقی ہیں اور مختلف شعرا و ادبا کے توسط سے اُن کا اظہار ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

19.6 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

1۔ تحریک کی تعریف کیجیے اور بتائیے کہ ترقی پسند تحریک کیا ہے؟

2۔ ترقی پسند تحریک کا پس منظر بیان کیجیے۔

3۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

1۔ ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

2۔ آزادیٔ ہند کے بعد ترقی پسند تحریک کا محاسبہ کیجیے۔

3۔ ''انگارے'' کا تعارف کرائیے اور ترقی پسند تحریک پر اس کے اثرات کے تعلق سے گفتگو کیجیے۔

19.7 فرہنگ

الفاظ	معنی
تحریک	کسی بات کو شروع کرنا
تحلیل	اپنی شکل کھو دینا، گھل جانا
محاسبہ	حساب، تجزیہ
زوال	پستی
عروج	بلندی
حق	سچ
حقائق	حق کی جمع
اجتماعی	مل جل کر
عدم	نہیں
مساوات	برابری
منظّم	انتظام کے ساتھ، باقاعدہ
ازسرنو	نئے سرے سے
تخلیق	خلق کی گئی، پیدا کی گئی
سعی	کوشش
جستجو	تلاش

خمیر	مزاج، فطرت
توانا	طاقتور، مضبوط

19.8 سفارش کردہ کتابیں

1۔ اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمٰن اعظمی

2۔ تلاش وتوازن — قمر رئیس

3۔ نیاز حیدر، شخصیت اور شاعری — ظفر الدین

4۔ ترقی پسند تحریک اور اُردو شاعری — یعقوب یاور

اکائی20 اُردوادب پرترقی پسندتحریک کے اثرات

اکائی کے اجزا

20.0 مقصد

20.1 تمہید

20.2 اُردوادب پرترقی پسندتحریک کے اثرات

20.3 ترقی پسندتحریک سے متاثر شعرا

20.4 ترقی پسندتحریک سے متاثر ادبا

20.5 خلاصہ

20.6 نمونۂ امتحانی سوالات

20.7 فرہنگ

20.8 سفارش کردہ کتابیں

20.0 مقصد

اس اکائی میں آپ اُردوادب پرترقی پسندتحریک کے اثرات کا مطالعہ کریں گے۔ یہ مطالعہ آپ کوترقی پسندتحریک کے زیر اثر لکھنے والے کئی شعرا اورادیبوں سے متعلق معلومات فراہم کرے گا۔اس مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ

☆ اُردوادب پرترقی پسندتحریک کے اثرات سے اپنی واقفیت کا اظہار کرسکیں۔

☆ اس سے متاثر شعرا کے بارے میں بیان کرسکیں۔

☆ اس سے متاثر نثر نگاروں کے تعلق سے گفتگو کرسکیں۔

20.1 تمہید

اردوادب کوجن چندادبی تحریکوں نے متاثر کیا ہے ان میں سب سے کامیاب تحریک ترقی پسندتحریک سمجھی جاتی ہے جس نے ادب کوزندگی سے جوڑنے کی کوشش کی۔اس تحریک نے ادیبوں کو اِس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ ادب کومحض تفریح کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ اس سے سماجی ومعاشرتی اصلاح کا

کام کریں۔ اس سے وابستہ شاعروں اور ادیبوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے سماج کو جگانے کا کام کیا اور جہاں جہاں ظلم و زیادتی اور استحصال نظر آیا اُس کے خلاف آواز اُٹھائی۔ اس تحریک نے پورے عہد کو متاثر کیا اور ہندوستان میں صرف اُردو ہی نہیں بلکہ یہاں کی بیشتر زبانوں کے ادیب اس سے متاثر ہوئے اور سبھی زبانوں میں ترقی پسند ادب تخلیق کیا گیا۔

اس اکائی میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ اس تحریک کے اُردو ادب پر کیا اثرات مرتب ہوئے ؟ اس سے متاثر اہم شعرا کون تھے اور اُنہوں نے کس طرح کی شاعری کی؟ ترقی پسند ادیبوں نے کس طرح کے افسانے اور ناول لکھے؟ غرضیکہ ترقی پسند شعرا اور ادبا سے آپ کو پوری طرح واقف کرانے کی کوشش کی جائے گی۔

20.2 اُردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات

آپ تحریک کے معنی و مفہوم سے واقف ہیں اور ترقی پسند تحریک کیا ہے یہ بھی جانتے ہیں۔ اس تحریک کے ادب پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہمیں اس پر غور کرنا ہے۔ آپ جانتے ہوں گے کہ ادب اپنے عہد کا آئینہ ہوتا ہے اور شاعر و ادیب معاشرے کے سب سے زیادہ حساس افراد ہوتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعر و ادیب کے ذریعے جو ادب وجود میں آیا اس پر اس عہد، اس تحریک اور تحریک سے وابستہ نظریے کے واضح اثرات تھے۔ اس تحریک سے متعلق اور اس نظریے سے اتفاق رکھنے والے ادیبوں نے اپنی اپنی زبان کے ادب میں ترقی پسند خیالات کی تبلیغ اور تشہیر کی اور اس طرح اس تحریک نے پورے ہندوستان میں اور ہندوستان کی بیشتر زبانوں میں اپنے وجود کا احساس دلایا۔ پریم چند نے لکھنو میں اپنے خطبے میں کہا تھا کہ:

> ''ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھر پور اظہار کریں.....
> ایسے ادبی رجحانات کو نشو ونما پانے سے روکیں جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں.....
> ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت اور ہنگامہ اور بے چینی پیدا کردے۔ سلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔''

اس کی پیروی نظم و نثر دونوں میں ملتی ہے۔ ایک طرف پریم چند، منٹو، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور عصمت چغتائی وغیرہ فکشن میں اپنے کمالات دکھا رہے تھے تو دوسری طرف فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، اسرار الحق مجاز، معین احسن جذبی، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی اور نیاز حیدر وغیرہ اپنی شاعری کے ذریعے اس تحریک کے رگ و ریشے میں گرم لہو دوڑا رہے تھے۔ اختر حسین رائے پوری، خلیل الرحمٰن اعظمی، احتشام حسین، علی سردار جعفری، ممتاز حسین، مجنوں گورکھپوری اور پروفیسر قمر رئیس وغیرہ ایسے ناقدین ہیں جن کے تنقیدی افکار اس تحریک کے مقاصد سے ہم آہنگ رہے ہیں۔ اس تحریک کے نظریے کے حامیوں نے آزادی سے قبل اپنا رول ادا کیا اور آزادیٔ ہندوستان کے بعد اپنی ذمہ داری ایک الگ طرح سے نبھائی۔ دونوں صورتوں میں اس کا مقصد انسان دوستی کے جذبے کا فروغ، سامراجی قوتوں کے شکنجے سے نجات، عدم مساوات کے خلاف احتجاج اور مزدوروں، کسانوں اور محنت کشوں کو ان کے حقوق دلانے کی جدوجہد تھا۔ بلا شبہ اس جدوجہد میں بڑی قوت تھی اور یہی وجہ ہے کہ یہ تحریک بیسویں صدی کی سب سے مقبول اور موثر ادبی تحریک بن گئی۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے:

1۔ ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس کا صدارتی خطبہ کس نے دیا؟

2۔ کیا منٹو اور عصمت ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے؟

3۔ کیا ترقی پسند تحریک کے منشور میں ''انسان دوستی کے جذبے کا فروغ'' شامل ہے؟

20.3 ترقی پسند تحریک سے متاثر شعرا

ترقی پسند تحریک کے علم بردار شاعروں میں فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، اسرار الحق مجاز، معین احسن جذبی، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، مجروح سلطانپوری، اختر الایمان، کیفی اعظمی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ فیض احمد فیض کو ترقی پسند شعرا میں اہم مقام حاصل ہے۔ فیض غزل کی کلاسیکی روایت سے بھی مستفید ہوئے اور انقلابی فکر سے بھی استفادہ کیا۔ دونوں کو ہم آہنگ کر کے ایک نئی کیفیت پیدا کی۔ انہوں نے ''انقلابیت کی خاطر تغزل اور تغزل کی خاطر انقلابیت کو کبھی قربان نہیں کیا۔'' ن۔م۔ راشد نے فیض کے پہلے مجموعہ کلام کے تعلق سے کہا کہ'' یہ ایک ایسے شاعر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے۔''

یہ رنگیں ریزے ہیں شاید ان شوخ بلوریں سپنوں کے
تم مست جوانی میں جن سے خلوت کو سجایا کرتے تھے
ناداری، دفتر، بھوک اور غم ان سپنوں سے ٹکراتے رہے
بے رحم تھا چومکھ پتھراؤ یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے

(فیض۔شیشوں کا مسیحا)

فیض غیر منقسم ہندوستان میں 1911ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے جو تقسیم ہند کے بعد پاکستان کا حصہ بن گیا۔ فیض نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور معلم کے عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ کئی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ انگریزی، فارسی، اُردو، عربی زبان پر اُنہیں قدرت تھی۔ اُنہوں نے مولوی میر حسن جیسے مثالی استاد سے تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ وہی میر حسن ہیں جو ڈاکٹر سر محمد اقبال کے بھی استاد تھے۔ وہ امرتسر کے ایم اے او کالج میں انگریزی کے لکچرر ہوئے۔ 1940ء میں لاہور چلے گئے اور وہاں ہیلی کالج سے وابستہ ہوگئے۔ اُنہوں نے شاعری کی ابتدا کالج کے زمانے سے ہی کر دی تھی۔ کالج کے میگزین میں ان کی کئی نظمیں شائع ہوئیں۔ وہ نظمیں اُن کے پہلے مجموعے میں شامل ہیں۔ موضوعاتی سطح پر ان کی ابتدائی نظمیں رومانی تھیں۔ ترقی پسند تحریک کے دورِ آغاز سے ہی فیض اس میں دلچسپی لینے لگے اور عملی طور پر اس تحریک کی ترقی کے لیے کوششیں کیں۔ تحریک سے وابستگی کے بعد فیض کی شاعری کا موضوع رومانی کے بجائے اشتراکی بن گیا۔ انہیں عشق و محبت کی بجائے معاشرے کے مسائل اور کمزور طبقے کے لوگوں کے دِگرگوں حالات زیادہ اہم محسوس ہوئے۔ اس احساس کی ترجمانی اُن کی نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ'' سے ہوتی ہے۔ نظم کا پہلا بند ملاحظہ کیجیے:

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے

تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دُنیا میں رکھا کیا ہے
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مخدوم محی الدین کا شمار صف اول کے ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ حیدرآباد کے قریب میدک میں 1908ء میں پیدا ہوئے۔ اُنہوں نے حیدرآباد میں تعلیم حاصل کی تھی۔ یہاں کے ایک کالج میں اُنہیں لکچرشپ بھی ملی لیکن اُنہوں نے جلد ہی ملازمت کو خیرباد کہہ دیا اور تنظیمی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے۔

مخدوم بہت ہی ذہین اور کھلے ذہن کے انسان تھے۔ اُنہیں بچپن سے ہی مطالعے کا شوق تھا۔ دورانِ طالب علمی اُنہوں نے مارکسزم کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس کے قائل ہوتے چلے گئے۔ ان کی نوجوانی کے زمانے میں ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ تحریک سے نظریاتی ہم آہنگی کے سبب مخدوم اِس سے وابستہ ہوگئے۔ اُنہوں نے حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم کی۔

مخدوم کی ابتدائی دنوں کی شاعری میں جمالیاتی اور خوشگوار احساس موجود ہے۔ اُنہوں نے عشقیہ اور رومانی نظمیں پورے جوش و جذبے کے ساتھ لکھی ہیں۔ محبت کی چھاؤں، نالہ حبیب، انتظار، سجدہ، نورس وغیرہ اسی کیفیت کے اظہار کی مثالیں ہیں۔ اُن کی عشقیہ نظم ''طور'' کا ایک بند ملاحظہ کیجیے:

دلوں میں اژدہام آرزو لب بند رہتے تھے
نظر سے گفتگو ہوتی تھی دم اُلفت کا بھرتے تھے
نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

وقت کے ساتھ ساتھ مخدوم کے ذہن اور موضوعات میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ ان کی نظمیں رومان سے انقلاب کی طرف کوچ کرنے لگیں۔ انہوں نے اپنے نظریے کو عام کرنے اور عوام تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے انقلابی نظموں کا سہارا لیا جو پورے جوش و خروش کے ساتھ جلسوں اور جلوسوں میں پڑھی اور گائی جاتی تھیں۔ آتش کدہ، قمر، سپاہی وغیرہ اُن کی ایسی ہی نظمیں ہیں:

گر رہا ہے سیاہی کا ڈیرا
ہو رہا ہے مری جاں سویرا
او وطن چھوڑ کر جانے والے
کھل گیا انقلابی پھریرا
جانے والے سپاہی سے پوچھو

وہ کہاں جا رہا ہے (نظم سپاہی)

مخدوم نے عام روش کے مطابق ابتدائی دنوں میں رومانی شاعری کی لیکن جلد ہی انقلابی شاعری کرنے لگے۔مخدوم بنیادی طور پر سیاسی آدمی تھے۔ملازمت ترک کر کے کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔''اعتدال اور سنجیدگی'' مخدوم کے کلام کی خصوصیت ہے۔ان کی نظموں کے موضوعات میں عموماً مزدور کی زبوں حالی' نچلے اور دبے کچلے طبقے پر مظالم و بربریت اور ان کا استحصال وغیرہ شامل ہوتا ہے۔اُن کا پہلا مجموعہ ''سرخ سویرا'' اور دوسرا مجموعہ ''گل تر'' ہے۔ان کا کلیات ''بساط رقص'' کے عنوان سے 1966ء میں شائع ہوا۔1969ء میں یہ انقلابی شاعر ہندوستان کی راجدھانی دلّی میں انتقال کر گیا۔اُن کا ایک بہت ہی مشہور شعر ہے جو آپ کو بھی یاد ہونا چاہیے:

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

علی سردار جعفری بلرام پور کے زمیندار خاندان کے چشم و چراغ تھے۔گھر کا ماحول علمی و ادبی تھا۔وہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ گئے۔ زمیندار گھرانے سے نکل کر انہیں یونیورسٹی کی آب و ہوا سے واسطہ پڑا اور اُنہیں وہاں کا مخصوص ماحول ملا۔اُس زمانے میں علی گڑھ کا ماحول ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعر و ادیب کے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھا۔سردار جعفری پر بھی اس کا راست اثر پڑا۔انہیں علم کے ساتھ ساتھ آزادی' شعور اور دُنیا کو دیکھنے سمجھنے کا فہم و ادراک حاصل ہوا۔وہ مسلک کے اعتبار سے شیعہ تھے۔انیس کے مراثی کا مطالعہ اور اسے محرم کے مہینے میں سننے سنانے میں اُنہیں خصوصی دلچسپی تھی۔مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں انہیں ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔سردار جعفری کی شاعری میں طمطراق اور گھن گرج ملتا ہے۔ان کی تقریر کی طرح نظموں میں بھی بے باکانہ خطابیہ انداز ملتا ہے۔وہ خود لکھتے ہیں کہ ''آنکھ کھلی تو علم اور تعزیے دیکھے۔'' سردار جعفری افسانہ نگار' ڈراما نویس اور ہدایت کار بھی تھے لیکن ان سب سے زیادہ ان کی شاعری مشہور ہوئی۔

سردار جعفری ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دنوں سے ہی اس سے وابستہ ہو گئے تھے۔پریم چند نے تحریک کے باقاعدہ آغاز پر جو صدارتی خطبہ دیا تھا اُس سے متاثر ہو کر سردار جعفری نے دو نظمیں ''سرمایہ دار لڑکیاں'' اور ''دیہاتی لڑکیاں'' لکھیں۔یہ دونوں نظمیں اُن کے پہلے مجموعے ''پرواز'' میں شامل ہیں۔ان نظموں سے ان کا منشا واضح ہو جاتا ہے۔وہ صنعتوں' ذومعنویت' پیچیدگی اور صناعی کی بجائے راست بات کرنے کے قائل تھے۔ان کے یہاں سختی اور جارحانہ رویہ نہیں ملتا ہے۔بلکہ وہ اپنی بات دلائل سے ثابت کرنے کے قائل تھے۔جن باتوں پر ان کا یقین ہو جاتا تھا وہ انہیں بلا جھجک اور قطعیت سے کہتے تھے۔وہ ایک بہترین مقرر تھے۔ان کا خطیبانہ انداز لوگوں کو بہت پسند آتا تھا۔جعفری کا یہی لہجہ' یہی ڈکشن اور انداز اُن کی نظموں میں بھی ملتا ہے۔اُنہوں نے تخلیقی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا۔بعد میں شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ان کا شمار اس تحریک کے قافلہ سالاروں میں کیا جاتا ہے۔انہوں نے ''ہنگامی اور موضوعاتی'' شاعری کی۔تنقیدی مضامین بھی لکھے جسے ادبی دنیا میں کافی سراہا گیا۔سردار جعفری' جوش ملیح آبادی سے کافی متاثر تھے۔اس لیے ان کی نظموں میں جوش کا رنگ ملتا ہے۔نئی دنیا کو سلام' ایشیا جاگ اٹھا' اور زنداں نامہ' ان کی اہم نظمیں ہیں۔یہاں اُن کے بعض اشعار دیے جا رہے ہیں' توجہ سے پڑھیے:

ان ہاتھوں کی تعظیم کرو ان ہاتھوں کی تکریم کرو
دنیا کے چلانے والے ہیں ان ہاتھوں کو تسلیم کرو

عالم ہستی کا دل دادہ ہوں میں
پھر یہ کیوں مرنے پہ آمادہ ہوں میں
آہ اے ناداں خیالی دیوتاؤں کو نہ پوج
ذہن میں بنتے ہیں جو ایسے خداؤں کو نہ پوج
آسمانوں کی بلندی کو بلا کا ناز تھا
پست ہمت جس سے ذوق رفعت پرواز تھا

اُن کی مشہور نظم ''بغاوت'' کا ایک شعر دیکھیے جو سردارؔ کے فکر کی بھرپور ترجمانی کر رہا ہے:

بغاوت میرا مذہب ہے بغاوت دیوتا میرا
بغاوت میرا پیغمبر' بغاوت ہے خدا میرا

اُن کی ایک اور مشہور نظم ''ایشیا جاگ اُٹھا'' سے ایک اقتباس دیکھیے:

ناگہاں شور ہوا
لوشبِ تار قیامت کی سحر آ پہنچی
انگلیاں جاگ اُٹھیں
بربط و طاؤس نے انگڑائی لی
اور مطرب کی ہتھیلی سے شعاعیں پھوٹیں
کھل گئے ساز میں نغموں کے مہکتے ہوئے پھول
لوگ چلّائے کہ فریاد کے دن بیت گئے
راہزن ہار گئے
راہرو جیت گئے

اسرارالحق مجاز ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے بلند و بالا مقام کے حامل ہیں۔ان کا نام اسرارالحق اور مجاز تخلص ہے۔ان کا آبائی وطن اُتر پردیش کا ضلع بارہ بنکی ہے۔اُنہوں نے ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی اور بی اے کی ڈگری کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔اس وقت تک ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی اس تحریک سے ذہنی ہم آہنگی رکھنے والے لوگ موجود تھے۔اسی ماحول کے اثر سے مجاز کے ذہن میں پختگی اور دل و دماغ میں وسعت پیدا ہوئی۔اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجاز نے بی اے کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس تحریک سے متعلق تربیت بھی حاصل کی۔

مجاز نے جس زمانے میں شاعری کی ابتدا کی اس وقت ہندوستان دوہری غلامی سے دوچار تھا۔طبقاتی کشمکش' فرسودہ روایات اور انسانیت کا فقدان وغیرہ معاشرے کا عام مسئلہ بنا ہوا تھا۔مجاز کو ترقی پسند تحریک میں ان تمام مسائل کے روشن امکانات نظر آئے۔ان کی نظموں میں پُر زور طریقے سے ان نظریات کی وکالت ملتی ہے۔ان کا پہلا شعری مجموعہ ''آہنگ'' ہے جس نے مجاز کی شہرت میں چار چاند لگا دیے۔اس مجموعے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا تعارف ترقی پسند تحریک کے روح رواں سجاد ظہیر نے تحریر کیا ہے۔اس کے دوسرے ایڈیشن پر فیض احمد فیض نے دیباچہ

لکھا۔فیض لکھتے ہیں:

''مجاز کی غنائیت عام غنائی شعرا سے مختلف ہے۔ عام غنائی شعرا محض عنفوان شباب کے دو چار محدود ذاتی تجربات کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ان تجربات کی تحریک' ان کی شدت اور قوت نموختم ہو جاتی ہے۔۔۔۔مجاز کی غنائیت زیادہ وسیع' زیادہ گہرے' زیادہ مستقل مسائل سے متصل ہے۔'' (فیض احمد فیض۔دیباچہ آہنگ)

مجاز انقلابی اور رومانوی شاعری کی وجہ سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔مجاز نے جوش و جذبہ اور عقیدت و محبت سے لبریز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ترانہ بھی قلم بند کیا ہے۔ یہ ترانہ اس یونیورسٹی کی عظمت کا پتہ دیتا ہے جسے وہاں کے طالب علم خواہ وہ دُنیا کے کسی بھی خطے میں موجود ہوں' بڑے ذوق وشوق سے گاتے اور گنگناتے ہیں۔اور اِسی بہانے اپنی درسگاہ کے ساتھ ساتھ مجاز کو بھی یاد کرتے ہیں۔1955ء میں مجاز کا انتقال ہو گیا۔

مجاز کا شمار ترقی پسند تحریک کے اولین دور کے شاعروں میں ہوتا ہے۔وہ بیک وقت نظم و غزل دونوں پر قدرت رکھتے تھے لیکن شہرت کا سبب نظم ہی بنی۔ ان کی شاعری میں انقلابیت کی گھن گرج سنائی دیتی ہے اور رومانی فضا بھی چھائی رہتی ہے لیکن یہ رومانیت' محبت آمیز باتیں' شوخی اور بے باکی پاکیزہ نوعیت کی ہے۔ان کی شاعری کو عزیز احمد نے 'انقلاب اور تغزل کا حسین امتزاج'' قرار دیا ہے۔'' آوارہ'' اندھیری رات کا مسافر' رات اور ریل' نذر علی گڑھ ان کی مشہور و معروف نظمیں ہیں۔اُن کے متفرق اشعار ملاحظہ کیجیے:

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلف پریشاں بھول گئے وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے ذوق نظارہ کیا کہیے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوق تصور کیا کیجیے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

تیرے ماتھے کا یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا
لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے:

1۔ حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو
یہ شعر کس شاعر سے منسوب ہے؟

2۔ علی سردار جعفری کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

3۔ مجاز کی شاعری کو ''انقلاب اور تغزل کا حسین امتزاج'' کس نے قرار دیا؟

معین احسن جذبی ترقی پسندی دور کے منفرد لب و لہجے کے شاعر گزرے ہیں۔ وہ 1912ء میں اعظم گڑھ کے قصبہ مبارکپور میں پیدا ہوئے۔ اُنہوں نے ایم اے اُردو کی ڈگری حاصل کی اور علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں لکچرر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ درس و تدریس کے سبب وہ ایک زمانے تک علی گڑھ میں رہے اور سبکدوش ہونے کے بعد بھی وہیں کے ہو رہے۔ ترقی پسند تحریک جب عروج پر تھی، شعرا عام طور پر نظم کی طرف مائل تھے۔ جذبی نے اپنے خیالات و نظریات کی عمدہ عکاسی غزلوں میں کی ہے۔ جذبی کے نظریے کا مطلع بالکل صاف تھا۔ وہ کارل مارکس کے نظریے سے متفق تھے۔ کمزور طبقے سے ہمدردی اور اُن کے حقوق کے لیے بے چین نظر آتے ہیں۔ جذبی بلاشبہ ترقی پسندی کے قائل تھے لیکن اس کے لیے اُنہوں نے کبھی فن سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ جذبی کی شاعری میں موضوع اور فن دونوں میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے جہاں دونوں ہی سے انصاف کیا جاتا رہا ہے۔ اپنے شعری مجموعے ''فروزاں'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''ایک شاعر کی حیثیت سے ہمارے لیے جو چیز سب سے زیادہ اہم ہے وہ زندگی یا زندگی کے تجربات ہیں لیکن کوئی تجربہ اُس وقت تک موضوعِ سخن نہیں بن سکتا جب تک اس میں شاعر کے جذبے کی شدت اور احساس کی تازگی کا یقین نہ ہو جائے۔''

جذبی ہمیشہ اپنے اس نظریے کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اُنہیں جب تک جذبے کی شدت اور احساس کی تازگی کا یقین نہ ہو جاتا وہ شعر نہ کہتے تھے۔ غالباً اسی لیے ان کا ادبی سرمایہ اپنے معاصرین کے مقابلے کم ہے۔ اُن کا پہلا مجموعہ ''فروزاں'' اور دوسرا ''سخن مختصر'' ہے۔

جذبی کی بنیادی شناخت ترقی پسند غزل گو شاعر کی ہے۔ مزدوروں کی حمایت اور سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کرنے والوں میں جذبی کا نام قابل ذکر ہے۔ سماج کی برائیوں کو دیکھ کر تڑپ اٹھنے والے جذبی کی شاعری میں درد و غم کا عنصر نمایاں ہے لیکن یہ غم محض ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ جذبی کا خیال تھا کہ ''سیاست میں مصلحت کا بہت کچھ دخل ہے لیکن مصلحت پر شعر کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی'' لہٰذا انہوں نے ہمیشہ شاعری کے تقاضے کو اہمیت دی اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہے۔

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے
یہ دنیا ہو یا وہ دنیا، اب خواہش دنیا کون کرے
جب کشتی ثابت و سالم تھی، ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

کیا تجھ کو پتہ کیا تجھ کو خبر، دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکل گیتی ہم تجھ کو کس طرح سنوارا کرتے ہیں

ساحر لدھیانوی رومانی طرز پر شاعری کرنے والے نوجوان نسل کے پسندیدہ شاعر تھے۔ زبان سادہ اور سلیس تھی۔ ابتدائی نظموں میں محبت اور جذبات و احساسات، نوجوان دلوں کی آرزوئیں، ناکامی و محرومی ان کے عزائم اور ارادے کو مختلف زاویے سے پیش کیا ہے لیکن ان کے یہاں رفتہ رفتہ موضوع میں تبدیلی ہوئی اور طبقاتی شعور، انقلابی آہنگ اور اہل اقتدار کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ پرچھائیاں ان کی طویل نظم ہے۔

خلوت وجلوت میں تم مجھ سے ملی ہو بارہا
تم نے کیا دیکھا نہیں، میں مسکرا سکتا نہیں
میں کہ مایوسی مری فطرت میں داخل ہوگئی
جبر بھی خود پر کروں تو گنگنا سکتا نہیں

ساحر لدھیانوی تعلیم مکمل کرنے کے بعد لاہور سے شائع ہونے والے رسالے ''ادب لطیف'' اور ''سویرا'' کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگے۔ بعد میں پھر وہ دہلی آئے اور ''شاہراہ'' سے منسلک ہو گئے۔ لیکن یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ وہ روزگار کے لیے ممبئی گئے اور فلمی دُنیا سے وابستہ ہوگئے۔ یہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور تھا۔ ممبئی میں ساحر ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں باقاعدگی سے شریک ہونے لگے۔ دراصل وہ مزاجاً ترقی پسند تھے۔ وہ جہاں بھی رہے اپنے اس مخصوص نظریے کے ساتھ رہے۔ اُنہوں نے رومانی اور عشقیہ نظمیں بھی کہی ہیں۔ سماجی برابری، طبقاتی کشمکش اور انسانیت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ان کے عشقیہ اشعار بہت مشہور ہوئے مثلاً:

تم میں ہمت ہے تو دُنیا سے بغاوت کردو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو

پھر نہ کی جے مری گستاخ نگاہی کا گلہ
دیکھیے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو

تجھ کو خبر نہیں مگر اک سادہ لوح کو
برباد کردیا ترے دو دن کے پیار نے

میں اور تم سے ترک محبت کی آرزو
دیوانہ کردیا ہے غم روزگار نے

یہ اشعار بھی رنگینی، دلکشی اور ادبی چاشنی سے پُر ہیں اور تجربات و مشاہدات کی بنا پر زیادہ اپیل کرتے ہیں۔ 1955ء میں ساحر کی ''تلخیاں'' شائع ہوئی۔ یہ اس وقت کے نوجوانوں کی پسندیدہ کتاب تھی۔ ساحر نوجوانوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ تلخیاں، پرچھائیاں اور تنہائیاں کے علاوہ اُن کا ایک مجموعہ کلام ''آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' بھی ہے۔ ساحر کی مقبولیت کی ایک وجہ اُن کی نظموں کا اسلوب بھی ہے۔ آسان اور روزمرہ کی زبان میں وہ تہذیبی و تاریخی واقعے کی طرف اشارہ کر دیتے تھے۔ ساحر بنیادی طور پر ایک دردمند شاعر تھے۔ ان کا خوشحال معاشرے کا خواب تھا۔ وہ امیروں اور غریبوں کے درمیان خلیج کو پاٹنا چاہتے تھے۔ اُن کے دو مزید مشہور اشعار دیکھیے:

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

دُنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ساحر لدھیانوی نے فلموں سے وابستگی کے بعد شاعری سے کسی حد تک کنارہ کشی اختیار کر لی تھی لیکن اُن کی تحریر کردہ فلمی نغموں میں بھی ترقی پسندی کا نظریہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اُن کا مشہور گانا تو آپ نے سنا ہی ہوگا:

تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

جاں نثار اختر بیسویں صدی کے ترقی پسند شعرا میں ایک معتبر نام ہے۔ جاں نثار اختر نے گرچہ رومانی نظموں سے اپنی شاعری کی ابتدا کی لیکن جلد ہی سماجی حقیقتوں کی عکاسی کرنے لگے اور ہمیشہ اس تحریک کے نظریے کے حامل رہے۔ جاں نثار اختر نے اپنے اطراف واکناف میں ہونے والے واقعات کو دیکھا، محسوس کیا اور انہیں تجربات و مشاہدات کی بنا پر اسے اپنی شاعری میں جگہ دی۔ اُن کی شاعری پر جوش، جذبی، سردار جعفری، فیض اور اقبال کے واضح اثرات ملتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کا خیال ہے کہ ''جاں نثار اختر دراصل ایک انتخابی ذہن رکھتے ہیں۔ اپنا راستہ نکالنے کے بجائے وہ دوسروں کے راستے پر فوراً چل پڑتے ہیں۔'' (اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔ص 73-172)

جاں نثار اختر کی اُس شاعری میں فنی چابکدستی اور تہہ داری زیادہ ہے جو اُنہوں نے اپنی بیگم صفیہ اختر کی یاد میں کی ہے۔ صفیہ جاں نثار اختر کی پہلی بیوی تھیں اور اسرار الحق مجاز کی بہن تھیں۔ وہ بہت ہی خوش اخلاق اور مہذب خاتون تھیں۔ شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتی تھیں۔ جاں نثار اختر کے بعض اشعار ملاحظہ کیجیے:

بجھ چکی ہے آسماں پہ ڈوبتے سورج کی آگ
ہر بگولہ گارہا ہے خانہ ویرانی کا راگ
بھوک کے مارے مویشی ہڈیوں کے ڈھانچ سے
ذرے ذرے میں تپش دن کی سلگتی آنچ سے

اختر الایمان بیسویں صدی کے مقبول ترقی پسند شاعر گزرے ہیں جو اپنی انفرادی شناخت رکھتے ہیں۔ وہ ایک غریب گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اُن کا بچپن پریشانیوں میں گزرا۔ بی اے تک تعلیم حاصل کی اور ملازمت کی تلاش میں نکل پڑے۔ چھوٹی چھوٹی کئی نوکریاں کرنے کے بعد ممبئی پہنچے۔ وہاں فلمی دُنیا سے وابستہ ہو گئے اور گیت، مکالمے لکھنے لگے جس کے بعد اُنہیں دولت اور شہرت دونوں ہی حاصل ہوئی۔ ان کی شاعری ان کے اپنے تجربات و مشاہدات کا حاصل ہے ان کی نظموں میں فرد اور سماج کا ٹکراؤ اور انسانی رشتوں کی پامالی کی واضح مثالیں ملتی ہیں۔ اُن کے یہاں غموں کا احساس، انسانی بے حسی، کمزور طبقے کا درد صاف عیاں ہے۔ اُن کے مجموعہ کلام کے نام 'سب رنگ' 'تاریک سیارہ' اور 'یادیں' ہیں۔ ''ایک لڑکا'' ان کی نمائندہ نظم ہے جس میں ''ایک لڑکا'' مٹتی ہوئی تہذیب کی علامت بن کر سامنے آیا ہے۔ اس نظم کے آخری حصے کے چند مصرعے ملاحظہ کیجیے اور خیالات کے ساتھ زبان کی روانی اور برجستگی کا لطف لیجیے:

سحر کی آرزو میں شب کا دامن تھامتا ہوں جب
یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلا کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج اندوہ پرور اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا اک خاشاک عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب وافترا ہے جھوٹ ہے دیکھو میں زندہ ہوں

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے:

1۔ جذبی کا پورا نام کیا تھا؟

2۔ ''پرچھائیاں'' کس شاعر کی نظم ہے؟

3۔ ''ایک لڑکا'' کے خالق کا نام بتایئے؟

20.4 ترقی پسند تحریک سے متاثر ادبا

ابھی آپ نے ترقی پسند شعرا اور ان کے کلام کا جائزہ لیا۔اب ہم اس تحریک سے وابستہ ادیبوں کا بھی مختصر جائزہ لیں گے۔ترقی پسند ادیبوں میں فکشن نگار کی حیثیت سے پریم چند کے علاوہ کرشن چندر، بیدی، منٹو اور عصمت کے نام کافی اہم ہیں۔جبکہ ناقد کی حیثیت سے سجاد ظہیر، احتشام حسین، ممتاز حسین، محمد حسن اور قمر رئیس وغیرہ کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔

پریم چند اپنے تخلیقی سفر کے ابتدائی دنوں سے ہی ترقی پسند تحریک سے نظریاتی طور پر اتفاق کرتے تھے۔اُنہوں نے بیسویں صدی کی پہلی دہائی سے ہی نثری ادب میں بیش قیمت اضافے شروع کر دیے تھے۔اُنہوں نے ہیئت سے زیادہ مواد پر زور دیا ہے اور اصلاح معاشرہ کے لیے ادب کو آلہ کار کے طور پر استعمال کرنے کے نظریے کے حامی رہے ہیں۔تقریباً ایک صدی قبل جب پریم چند نے لکھنا شروع کیا اُس وقت معاشرہ طبقاتی کشمکش، ذات پات، امیر غریب کے فرق، تعلیم اور تعلیمی سہولتوں کے فقدان، بچپن کی شادی اور ستی جیسے مسائل سے دوچار تھا۔پریم چند نے اپنی کہانیوں میں انہیں مسائل کو پیش کیا ہے۔اگر آپ غور کریں تو ان تمام مسائل کا حل کسی نہ کسی شکل میں پریم چند کی کہانیوں میں موجود ہے۔افسانہ کفن، سوا سیر گیہوں، نئی بیوی، گھاس والی، بڑے گھر کی بیٹی، عیدگاہ، حج اکبر، نجات وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن میں ترقی پسند نظریات واضح طور پر عیاں ہیں۔عیدگاہ افسانے کا مرکزی کردار ایک چھوٹا بچہ حامد ہے اور ایک بوڑھی عورت امینہ ہے جو حامد کی دادی ہے۔پریم چند نے حامد کی داخلی کیفیات اور نفسیات کو پیش کیا ہے۔حامد کے دوست عیدگاہ میں کھلونے اور مٹھائیاں خریدتے ہیں مگر حامد لوہے کا چمٹا خریدتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کی دادی کے ہاتھ روٹیاں پکاتے ہوئے جل جاتے ہیں۔یہاں شوق اور تفریح پر ضرورت حاوی ہے۔پریم چند نے حامد کے توسط سے معاشرے کے ان تمام کمزور طبقے کی عکاسی کی ہے جن کے ارمان کبھی پورے نہیں ہو پاتے ہیں۔اس

کہانی کے ذریعے پریم چند نے یہ پیغام بھی دیا ہے کہ ادب کو محض شوق کی تکمیل اور تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ مسائل حل کرنے کا ذریعہ بھی ہونا چاہیے۔

کرشن چندر عملی طور پر ترقی پسند تحریک سے جڑے رہے ہیں۔ ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں وہ باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ اُنہوں نے مجموعی طور پر بہت لکھا ہے۔ کرشن چندر نے ناول اور افسانے دونوں لکھے لیکن بنیادی شناخت افسانے کی وجہ سے ہے۔ مزاجاً یہ جذباتی اور رومان پسند تھے۔ ان کے افسانے میں بھی اس کی جھلک نمایاں ہے لیکن یہ جذباتیت اور رومانیت بھی سماجی حقیقت نگاری کی عمدہ مثال بن گئی ہے۔ انہوں نے انسان دوستی اور بہتر سماج کی آرزومندی بھی کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ اُنہوں نے ایک خوشحال اور مطمئن سماج کا تصور کیا۔ ان کے یہاں معمولی معمولی افراد مرکزی کردار کی حیثیت سے موجود ہیں جن کی بھرپور عکاسی اور ترجمانی کرتے ہوئے سماج کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اِن افراد کی بھی اپنی عزت اور شناخت ہوتی ہے۔ ان کے پاس بھی دھڑکتا ہوا دل ہوتا ہے۔ اُن کے بھی اپنے جذبات ہوتے ہیں جن کی قدر کی جانی چاہیے۔ مہالکشمی کا پل' کالو بھنگی وغیرہ اسی نوعیت کے افسانے ہیں۔ کالو بھنگی ایک اسپتال میں کام کرتا ہے جہاں وہ مریضوں کی غلاظت صاف کرتا ہے۔ اُن کے دُکھوں کو محسوس کرتا ہے لیکن اس بھنگی کی معمولی سی خواہش بھی پوری نہیں ہو پاتی ہے۔ وہ ان حسرتوں کے ساتھ اپنی زندگی گزار دیتا ہے اور بالآخر دُنیا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ ایک بھنگی کو افسانے کا مرکزی کردار بنا کر پیش کرنا اُردو ادب کو دراصل ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔

منٹو اپنے دور کے باغی افسانہ نگار کہے جاتے تھے۔ تقسیم ہند کا المیہ' فرقہ وارانہ فسادات کے ساتھ ساتھ جنسی و نفسیاتی کشمکش ان کے افسانوں کے اہم موضوعات رہے ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک اور اس کے نظریے سے پوری طرح اتفاق کرتے تھے۔ اُنہوں نے معاشرے کے اس طبقے کے مسائل کو پیش کیا ہے جس پر فکشن نگاروں نے زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔ اُنہوں نے بازاری عورتوں' اُن کے جذبات و احساسات اور داخلی کیفیات کو بڑے موثر انداز میں دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ منٹو نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ان میں سے بیشتر عورتیں کسی نہ کسی وجہ کی شکار ہوتی ہیں اور بنیادی طور پر یہ بھی عام عورتوں کی طرح پرسکون زندگی کی متلاشی ہوتی ہیں۔ منٹو نے اس خاص موضوع کے علاوہ فرقہ وارانہ فسادات' تقسیم ہند اور بنی نوع انسان کی بے حرمتی' کمزور طبقے کی بے چینی اور عدم مساوات وغیرہ پر افسانے قلم بند کیے ہیں۔ کالی شلوار' موذیل' منظور' ٹوبہ ٹیک سنگھ' نیا قانون وغیرہ اُن کے نمائندہ افسانے ہیں۔

ترقی پسند تحریک سے وابستہ اور اُس کے زیر اثر لکھنے والوں میں راجندر سنگھ بیدی بھی کافی اہم نام ہے۔ بیدی نے سماج کے فرسودہ روایات' توہمات و عقائد اور اس کے مضر اثرات کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ بیدی کا ماننا تھا کہ اتنی ترقی کے باوجود لوگوں کا غیر منطقی باتوں پر یقین و اعتبار ہوتا ہے جو کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔ افسانہ ''گرہن'' کی مرکزی کردار ہولی ہے جو کئی بچوں کی ماں ہے۔ سورج گرہن ہونے والا ہے اور وہ حاملہ ہے۔ اس کی ساس اسے مختلف طریقے سے تنبیہ کرتی ہے اور طعنے دیتی ہے کہ گرہن میں عورت کو کس کس طرح کی احتیاط کرنی چاہیے۔ وہ گاہے گاہے ہولی کو مارتی ہے۔ ہولی کا شوہر رسیلا بھی اُسے مارتا ہے لیکن ہولی یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ ساس کیوں مارتی ہے۔ شوہر کا مارنا اُسے کسی حد تک ٹھیک لگتا ہے اس لیے کہ وہ پتی پرمیشور ہے۔ بیدی نے اپنے افسانوں میں عورتوں کی نفسیات کو بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔ نسوانی کرداروں کے علاوہ بچوں کی نفسیات کی پیش کش میں بھی بیدی کو ملکہ حاصل ہے۔ بیدی نے متوسط طبقے کے مسائل کو پیش کیا۔ ''تلادان'' اُن کا شاہکار افسانہ ہے جس میں امیر اور غریب بچے کی نفسیات کی مرقع کشی کی گئی ہے۔ ''لاجونتی'' گرچہ تقسیم ہند کے المیے پر لکھا گیا افسانہ ہے لیکن اس میں بھی عورت ہی کی نفسیات اور حقوق کو موضوع بنایا گیا ہے۔ گرم کوٹ' بھولا' لمبی لڑکی' اپنے دکھ مجھے دے دو' پان شاپ وغیرہ بیدی کے نمائندہ افسانے ہیں۔

عصمت چغتائی بھی اسی دور کی ترقی پسند نظریے کی حامل فکشن نگار ہیں۔ وہ عموماً متوسط طبقے کے مسلمان گھروں کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ خاص طور پر نسوانی کردار ان کے افسانوں کے موضوع ہوا کرتے ہیں۔ عصمت نئی زبان' نیا اسلوب اور بے باکانہ انداز و بیان کے لیے جانی جاتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ

'' لکھنے کے لیے میں نے دنیا کی عظیم ترین کتاب یعنی زندگی کو پڑھا ہے اور اسے بے انتہا دلچسپ اور موثر پایا ہے۔'' عصمت بدایوں اتر پردیش کی رہنے والی تھیں۔ان کے والد تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔اُنہوں نے عصمت کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔عصمت نے علی گڑھ میں بھی تعلیم حاصل کی اور انسپکٹر آف کالج بنیں۔شاہد لطیف سے شادی کی اور بعد میں ممبئی میں سکونت اختیار کر لی۔فلمی دُنیا سے بھی وابستہ رہیں۔یہی سبب ہے کہ اُن کی تحریروں میں جہاں یوپی کے مسلم گھرانوں کی خواتین کی نفسیات کی مرقع کشی ملتی ہے وہیں ممبئی کی زندگی اور وہاں کے نشیب وفراز کی بھی خوبصورت جزئیات نگاری نظر آتی ہے۔ اُنہوں نے افسانوں کے ساتھ کئی ناول بھی تحریر کیے جن میں ضدی' معصومہ' ٹیڑھی لکیر' دل کی دُنیا اور ایک قطرہ خوں وغیرہ شامل ہیں۔

سجاد ظہیر کا شمار اس تحریک کے بانیوں میں ہوتا ہے۔اس تحریک کو منظّم شکل دے کر کامیاب بنانے میں ان کا بہت اہم رول رہا ہے۔احتشام حسین کا شمار ترقی پسند نقادوں میں ہوتا ہے۔ یہ مارکسی نظریے کے حامل تھے اور اس کی مدد سے زندگی اور ادب کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔یہ اپنی بات انتہائی نپے تلے انداز میں مدلل طریقے سے پیش کرتے تھے۔محمد حسن بھی ترقی پسند ناقد گزرے ہیں۔کارل مارکس نے اپنی کتاب '' سرمایہ'' میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے یہ اتفاق کرتے نظر آتے ہیں۔محمد حسن نے ادب کا رشتہ زندگی اور سماج سے جوڑا ہے۔ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے'' ادبی تنقید'' میں ان خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔قمر رئیس کا شمار اردو کے ممتاز ناقدین میں ہوتا ہے۔ان کے ذکر کے بغیر دور جدید کی ترقی پسند تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا تصور نامکمل ہے۔ پریم چند اور سجاد ظہیر کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین کو منظّم اور متحرک کرنے کے حوالے سے قمر رئیس بلاشبہ سب سے اہم نام ہے جس نے ایک طویل مدت تک انجمن کے مقاصد کے تحت کوئی نہ کوئی سرگرمی جاری رکھی۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1۔ '' ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو'' کس کا قول ہے؟

2۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ کسی چار شاعر وادیب کے نام بتائیے؟

3۔ محمد حسن کے تنقیدی مضامین کے مجموعے کا نام کیا ہے؟

4۔ '' آوارہ'' کس کی نظم ہے؟

5۔ بجھ چکی ہے آسماں یہ ڈوبتے سورج کی راگ
ہر بگولہ گا رہا ہے خانہ ویرانی کا راگ
یہ شعر کس شاعر سے منسوب ہے؟

20.5 خلاصہ

ادب میں موضوعاتی اور فنی دونوں سطح پر تبدیلی جزو لاینفک تصور کی جاتی ہے۔اس تبدیلی سے مراد یہ قطعی نہیں ہے کہ اس سے قبل جو روایت چلی آ رہی ہے یا جو کچھ بھی ادب میں پیش کیا جا رہا ہے اس میں کمی وکوتاہی ہے۔تبدیلی نئے ذہن کی پیداوار کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔اس سے دل ودماغ اور ذہن کے دریچے وا ہوتے ہیں جس سے تازہ ہوا کی گزر ہوتی ہے اور یہ صحت مندی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ادب میں تبدیلی بھی بہتری اور اضافے کے لیے ہوتی ہے۔اور یہ تحریکات ونظریات کے پروان چڑھنے اور مختلف سماجی ومعاشرتی تبدیلیوں کے نتیجے میں سامنے آتی ہے۔اُردو ادب میں ابتدائی دور ہی سے تحریکات ورجحانات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ایہام گوئی' اصلاح زبان' سرسید تحریک اور پھر بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک وغیرہ۔ترقی پسند تحریک

بیسویں صدی کی سب سے کامیاب تحریک رہی ہے۔ اس تحریک نے ادب سے وابستہ بیشتر ناقدین' فکشن نگار' شاعر و ادیب کو متاثر کیا ہے۔ سجاد ظہیر' اختر حسین رائے پوری' اعجاز حسین' احتشام حسین' قمر رئیس وغیرہ ایسے ناقدین ہیں جنہوں نے ادب تخلیق کرنے کی راہ کا تعین کیا۔ اُنہوں نے اس بات کی وضاحت کی کہ ادب کو کیسا ہونا چاہیے اور ادب سے معاشرے میں کتنی بہتری لائی جا سکتی ہے۔ اُنہوں نے ادب سے اصلاح کی اُمید کی اور اِسے سماجی برائیوں کو ختم کرنے کا ذریعہ تصور کیا۔ اس کے لیے اُنہوں نے حتی المقدور کوششیں کیں۔

ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دنوں سے ہی فکشن نگار حضرات و خواتین اِس سے وابستہ ہوئے۔ پریم چند ایسے کہانی کار ہیں جنہوں نے تحریک کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ان موضوعات کو قلم بند کیا جو بعد میں منشور کا حصہ بنے۔ اُنہوں نے اپنی کہانیوں کے توسط سے سماجی ناہمواری کے تدارک کی کوشش کی ہے۔ پریم چند کے بعد علی عباس حسینی' عصمت چغتائی' راجندر سنگھ بیدی' منٹو' کرشن چندر' خواجہ احمد عباس' غلام عباس' سریندر پرکاش وغیرہ نے اس نظریے کو اپنی کہانیوں کے ذریعے عام کیا۔ اچھوت' گیندا' تلادان' ہتک' کالو بھنگی' ابابیل' آنندی اور بجوکا ایسی ہی کہانیاں ہیں۔ ناقدین اور فکشن نگاروں کی طرح بے شمار شاعروں کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ مجاز' سردار جعفری' فیض' مخدوم' ساحر' جاں نثار اختر' مجروح' اختر الایمان' کیفی اعظمی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اِن کے کلام نے پورے زمانے کو متاثر کیا اور تحریک آزادی کے متوالوں کے لہو کو مسلسل گرم رکھنے کا کام کیا۔ ان شعرا نے فنی نزاکتوں کا خیال رکھتے ہوئے موضوعات کو اہمیت دی اور لوگوں میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے قارئین کو یہ باور کرایا کہ ظالم کا ساتھ دینا ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے۔ مظلوم کا ساتھ دینا عوام کے لیے بے حد ضروری ہے۔ کسانوں' مزدوروں اور محنت کشوں کو اُن کے حقوق ملنے چاہئیں۔ سماج سے استحصال کا خاتمہ ہونا چاہیے اور مساوات عام ہونا چاہیے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک نے ادب کی شعری اور نثری دونوں ہی اصناف کو کافی متاثر کیا اور اِس تحریک کے زیر اثر کثیر تعداد میں ادبی نمونے سامنے آئے جو اُردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

20.6 نمونۂ امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تفصیل سے دیجیے۔

1۔ اُردو ادب پر ترقی پسند تحریک کے اثرات کی وضاحت کیجیے۔

2۔ ترقی پسند تحریک سے متاثر ادبا کا محاسبہ کیجیے۔

3۔ مجاز اور سردار جعفری کی شاعری سے متعلق اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے مختصر جواب دیجیے۔

1۔ ترقی پسند تحریک سے متاثر افسانہ نگاروں کا محاسبہ کیجیے۔

2۔ ترقی پسند تحریک پر ایک نوٹ لکھیے۔

3۔ فیض اور مخدوم کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ تحریر کیجیے۔

20.7 فرہنگ

الفاظ	معنی
منشور	بنیادی قانون' آئین

فروغ دینا	ترقی دینا
سرگرداں	حیران و پریشان
بانی	بنیاد ڈالنے والا
سعی	کوشش
دانشور	عقل مند
فراموش کرنا	بھلا دینا
اصطلاح	کسی لفظ کا عام معنوں سے ہٹ کر خاص معنوں میں استعمال
تقلید	پیروی
تعظیم	عزت، قدر و منزلت
تفہیم	سمجھانا
روایت	کسی پرانی چیز کی نقل، حکایت
مشاہدہ	معائنہ
مرہونِ منت	احسان مند، شکر گزار
استفادہ	فائدہ حاصل کرنا
تمہید	کسی بات کا آغاز
ترجیح	برتری، فوقیت
مفلوک الحالی	افلاس، تباہ حالی
ہم عصر	ایک ہی زمانے کے
مساوات	برابری

20.8 سفارش کردہ کتابیں

1۔ حسرت سے فراق تک (کلاسیکی شعرا پر تنقیدی مضامین) ایم حبیب خاں
2۔ اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک خلیل الرحمٰن اعظمی
3۔ اُردو ادب کی تنقیدی تاریخ سید احتشام حسین
4۔ تین ترقی پسند شاعر علی احمد فاطمی
5۔ تاریخ ادب اُردو نور الحسن نقوی